سماجی و معاشی مسائل پر تحریروں کا مجموعہ

4

یوم مئی ۱۸۸۶ء ۔ ۱۹۸۶ء

عالمی مزدور تحریک

سندھ ہاری کمیٹی

صنعتکاری، سامراجی سرمایہ اور مزدور تحریک

ایشیا اور افریقہ میں قومی جمہوریت کی حکمت عملی

سماجی و معاشی مسائل پر تحریروں کا مجموعہ

فلسفہ

سیاسی معاشیات

تاریخ

سوشیالوجی

نفسیات

ادب

مجموعہ نمبر ۳

ریسرچ فورم پبلی کیشنز
پوسٹ آفس بکس ۳۵۱۱۰
کراچی نمبر ۵

ناشر:۔ ریسرچ فورم پبلی کیشنز
کراچی ۔

تقسیم کار: مکتبۂ دانیال
وکٹوریہ چیمبرز ۲۰
عبداللہ ہارون روڈ کراچی

مطبع :۔ احمد برادرز پریس کراچی

طبع اوّل:۔ مئی سنہ ۱۹۸۶ء

قیمت: ۱۵/ روپے

مارکسی مفکر اور دانشور

سیّد سبط حسن کے نام

جنہوں نے ایک سچے انقلابی کی طرح تمام عمر
محنت کشوں کی عظیم جد و جہد کی ترجمانی اور اس
کی فکری رہنمائی کی۔

فہرست

عالمی مزدور تحریک

ندیم خالد

اقتصادی اور سیاسی پس منظر

۱۸۶۴ء میں لندن میں بین الاقوامی مزدور جماعت پہلی انٹرنیشنل کا قیام عمل میں آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سرمایہ داری تیزی کے ساتھ بام عروج پر پہنچ رہی تھی۔ پندرھویں اور سولھویں صدی میں بحری سیاحت کی وجہ سے نت نئی سرزمینیں دریافت ہوئی تھیں جن سے تجارت اور صنعت وحرفت کو زبردست فروغ ملا۔ پیداوار کے نئے تقاضوں نے صنعتی انقلاب کی شکل میں سرمایہ داری کو تقویت پہنچائی۔ جو سماج پہلے جاگیردارانہ زرعی تجارت پر قائم تھا اب وہ صنعتی سرمایہ دارانہ نظام میں ڈھلنے لگا۔

صنعتی انقلاب کا مرکز انگلستان تھا جہاں کوئلہ، لوہا اور کپڑا بنانے کی صنعت اور ریلوں کا انتظام دنیا بھر میں سب سے پہلے وجود میں آئے۔ اس ترقی کی بنیاد اُن انقلابی ایجادات پر تھی جو اُس زمانے میں ہو رہی تھیں ان میں سب سے نمایاں ہنری کارٹ کا آہن سازی کا طریقہ، آرکرائٹ کی پارچہ بافی کی مشینیں اور سٹفین سن کے بھاپ کے انجن کی ایجادات تھیں۔

ان ایجادات کا صنعت و مواصلات میں استعمال صنعتی انقلاب کا باعث بنا۔ صنعتی انقلاب کا ابتدائی اقتصادی اثر یہ تھا کہ پیداوار کا طریقہ کار انسانی ہاتھوں سے نکل کر مشینوں کے تحت آ گیا۔ چھوٹی چھوٹی فیکٹریوں کی جگہ بڑے بڑے کارخانے بننے لگے۔

انگلستان کو سستے کوئلہ کی باافراط رسد اور تجارتی اعتبار سے مناسب مواقع حاصل ہونے کی وجہ سے دنیا کے سب سے پہلے صنعتی مرکز کی حیثیت حاصل ہوئی۔ صنعتی انقلاب بہت جلد انگلستان سے نکل کر یورپ کے دوسرے ملکوں میں پھیل گیا۔ انقلاب کے ابتدائی دور میں فرانس بہت سی اہم ایجادات کی بنا پر انگلستان کا ہم پلہ بن گیا تھا، لیکن انیسویں صدی کے وسط

میں بالخصوص کوئلے کی نایابی کے باعث انگلستان سے بہت پیچھے رہ گیا۔ ۱۸۵۰ء تک جرمنی بھی پوری طرح صنعتی ترقی کی راہ پر گامزن ہو چکا تھا لیکن اُس کی غیر موزوں جائے وقوع، جاگیردارانہ رشتوں سے وابستگی اور وقتاً فوقتاً جنگی اقدامات کی وجہ سے اُس کی بھرپور ترقی کے امکانات محدود تھے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ بھی صنعتی انقلاب کے اثرات تیزی سے قبول کرنے لگا تھا لیکن ۱۸۵۰ء تک امریکہ میں بڑی صنعتوں کا وجود نا پید تھا۔ جہاں تک مشرقی یورپ کا تعلق تھا پہلی انٹرنیشنل کے قیام تک یہاں بہت کم صنعتیں قائم ہو سکی تھیں جبکہ افریقہ، ایشیا، آسٹریلیا اور لاطینی امریکہ میں صنعت کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔

صنعتی انقلاب سے پیدا ہونے والی تیز رفتار صنعتی و تجارتی ترقی نے پیداوار کو بڑے بڑے کارخانوں میں مرتکز کرتے ہوئے ایک امیر سرمایہ دار طبقے کو جنم دیا۔ پرانے جاگیردارانہ پیداواری رشتے اُبھرتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کی ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹ تھے۔ اس نوزائیدہ اور طاقتور سرمایہ دار طبقے نے ان تضادات کو شدید سے شدید تر کر دیا۔ یہ جدوجہد بہت سے ممالک کے بورژوا انقلابوں میں نقطۂ عروج کو پہنچی اور بیشتر جگہوں پر شدید خانہ جنگی کی شکل میں لڑی گئی یہ انہی انقلابات کے مجموعی اثرات تھے جنہوں نے سرمایہ داری کو دنیا بھر میں غالب قوت بنا دیا۔ ان بورژوا انقلابات کے نتیجے میں انگلستان، امریکہ، فرانس، جرمنی، بلجیم اور دوسرے ممالک میں سرمایہ دار طبقے کی رہنمائی میں موجودہ بورژوا مملکتوں کا قیام عمل میں آیا۔ اب سرمایہ دار کیلئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ ایک واضح اور بہتر طور پر منظم قومی مملکت کو وجود میں لائے تاکہ محنت کش طبقے کے استحصال کو جاری رکھا جا سکے اور اپنی اپنی قومی منڈیوں پر غلبہ برقرار رکھا جائے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی تیز رفتار ترقی نے سب سے پہلے انگلستان میں محنت کش عوام پر فوری گہرا اثر ڈالا۔ کاشت کاروں اور دستکاروں کی ایک بڑی تعداد جس کی حیثیت پہلے ایک خود مختار پیداوار کرنے والے کی سی تھی اب اپنی زمینوں کارگاہوں کو چھوڑ کر فیکٹریوں کارخانوں میں تلاش معاش پر مجبور ہو گئی۔ اس طرح عہد جدید کا مزدور طبقہ "پرولتاریہ" جنم

لینے لگا۔ سرمایہ دارانہ نظام نے جس کا خاصہ بے پایاں حرص و لالچ ہے، مردوں عورتوں اور بچوں کو تباہی کی حد تک کام کرنے پر مجبور کیا۔ اُنہیں روزانہ ۱۲ سے ۱۶ گھنٹے تک کام کرنا پڑتا۔ معاوضہ صرف اتنا ملتا جس سے بمشکل پیٹ بھرا جا سکے۔ چھ برس کے بچوں تک سے ملوں میں کام لیا جاتا تھا۔ مالک آمرانہ طریق پر فیکٹریوں کے غیر منظم اُجرتی مزدوروں پر حکومت کرتا تھا۔ ۱۸۳۳ء میں پارلیمنٹ کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ انگلستان میں مزدوروں کی حالت اتنی مایوس کن ہے کہ اُس کے سامنے امریکہ میں غلامی، آئرلینڈ میں انگریزوں کی جاگیرداری اور ہندوستان میں فرنگی حکومت کے کارنامے بھی ماند پڑ جاتے ہیں۔ اینگلز نے اپنی کتاب "۱۸۴۴ء میں انگلستان میں مزدوروں کی حالت" میں مزدوروں کے حالاتِ زندگی کا جو لاثانی نقشہ کھینچا ہے وہ انتہائی خوفناک ہے، براعظم یورپ میں جہاں بھی سرمایہ داری نے اپنا قبضہ جمایا وہاں مزدوروں کی حالت انگلستان سے بھی بدتر تھی، فرانس اور جرمنی میں قائم ہونیوالی فیکٹریاں گویا غلاموں کا باڑہ تھیں۔

سرمایہ دار ملکوں میں اقتصادی اور سیاسی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے مزدوروں نے اپنی لڑائی کے مختلف طریقے اختیار کیئے۔ یورپ اور امریکہ کے بہت سے انقلابات میں اُنہوں نے اس اُمید پر حصّہ لیا کہ بورژوا پلیٹ فارم سے جو دلکش وعدے کئے گئے ہیں ممکن ہے ہماری جدوجہد سے وہ پورے ہو جائیں۔ لیکن تجربے نے یہ ثابت کر دیا کہ مزدوروں کے حقوق پر اُسی وقت عمل درآمد ہو سکتا ہے جب مزدور خود اپنی طبقاتی قوت پر انحصار کریں۔ اس کا اظہار اُنہوں نے مختلف طریقوں سے کیا۔ انگلستان میں اُنہوں نے مشینیں توڑ پھوڑ دیں اور بہت سے مقامات پر اُنہوں نے سرکشی اور بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ آہستہ آہستہ مزدور اپنی تنظیم کی طرف متوجہ ہوا جہاں جہاں بھی سرمایہ داری نے اپنا سکہ جمایا مزدوروں نے فوراً ایک نہایت ہی اہم ہتھیار یعنی ہڑتال کے استعمال کی ترکیب سیکھ لی تاکہ صنعت رُک جائے اور استحصال کرنے والا عارضی طور پر نفع اندوزی سے محروم ہو جائے۔

ابتدائی ٹریڈ یونین تنظیمیں

انگلستان وہ ملک ہے جہاں نظام سرمایہ داری نے جنم لیا اور یہیں سب سے پہلے ۱۷۵۲ء میں مزدور تنظیمیں وجود میں آئیں۔ یہ ابتدائی تنظیمیں بیشتر ماہر مزدوروں کی جتھے بندیوں پر مشتمل تھیں۔ انہیں اکثر و بیشتر خلافِ قانون حالات میں کام کرنا پڑتا۔ ۱۸۲۴ء میں انگلستان میں آزادیٔ اجتماع پر پابندی اٹھنے سے بہت سی ٹریڈ یونین تنظیمیں جواب تک "انجمن رفقا" کے بھیس میں کام کرتی تھیں کھلے بندوں کام کرنے لگیں۔ ۱۸۳۷ء میں ایک سال قبل قائم ہونے والی لندن ورکنگ مینز ایسوسی ایشن کے پہل کرنے پر عظیم چارٹسٹ تحریک کا آغاز ہوا۔ یہ تحریک مزدور طبقے کی ایک وسیع سیاسی تحریک تھی۔ اسے کم و بیش تمام مزدور تنظیموں اور چھوٹے سرمایہ داروں کی کثیر تعداد کی حمایت حاصل تھی۔ اس کا مقصد خاص طور پر مزدوروں کے لیے حق رائے دہی حاصل کرنا تھا۔ دوسرے مطالبات میں تمام مردوں کو حق رائے دہی، مساوی انتخابی حلقوں کا قیام، اور پارلیمنٹ کی ممبری کے لیے ملکیت کی شرط کا منسوخ کیا جانا شامل تھا۔ اس ابتدائی پروگرام کے حق میں بڑے بڑے مظاہرے ہوئے، جب پارلیمنٹ کے رجعت پسند ممبروں نے ان عوامی مطالبات کو مسترد کر دیا تو تحریک نے اپنے مطالبات منوانے کیلئے عام ہڑتال اور بغاوت کا راستہ اختیار کر لیا۔ لیکن یہ تحریک کچل دی گئی۔

۱۸۴۸ء میں مغربی یورپ کے انقلابی حالات سے متاثر ہو کر یہ تحریک دوبارہ زندہ ہوئی لیکن اب اس کی اصل قوت ضائع ہو چکی تھی بغاوت برپا کرنے کی کوشش کو ناکام بنا دیا گیا۔ اس کی ناکامی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ چھوٹا سرمایہ دار جو اس تحریک کا ایک عنصر تھا، تذبذب کا اظہار کرنے لگا۔ ان عارضی ناکامیوں کے باوجود ایک صدی کے اندر اندر مزدوروں نے بحیثیت مجموعی مشہور "چھ نکات" کو قانونی طور پر منوا ہی لیا۔ چارٹسٹ تحریک ایک وسیع قومی مزدور پارٹی کے قیام کی اولین کوشش تھی۔ اس سے پہلی مرتبہ مزدوروں کو اپنی عظیم سیاسی قوت کا اندازہ ہوا اور دنیا کی مزدور تاریخ میں یہ تحریک ایک اہم.. اور شاندار کارنامہ تسلیم کی گئی۔

پہلی انٹرنیشنل کے قیام کے وقت فرانس، بلجیم، سوئٹزرلینڈ، اسپین، جرمنی اور دوسرے ممالک میں انجمن سازی کے خلاف سخت قوانین کیوجہ سے مقامی مزدور انجمنیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ مزدور تنظیم کی صرف ایک ہی قسم تھی جسے تھوڑا بہت برداشت کیا جاتا تھا اور وہ تھی باہمی منافع یا امداد کی انجمن۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں جہاں حبشی لوگ غلاموں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے سفید فام مزدوروں کو قدرے زیادہ جمہوری آزادی حاصل تھی اور مزدور انجمنیں ایک حد تک نشو ونما پا رہی تھیں۔ مزدوروں کی بیشتر لڑائیاں اُجرتوں میں اضافہ، دس گھنٹے کا دن، قرض داروں کو سزا دینے کی مخالفت، عام اور مفت تعلیم، مفت زمین اور زیادہ جمہوری حقوق کے لئے تھیں۔

سرمایہ دار مخالف رجحانات

انگریز مزدوروں کی جدوجہد نہ صرف وحشیانہ استحصال کی مخصوص براہیوں کے خلاف تھیں۔ بلکہ اُنہوں نے خود سرمایہ دارانہ نظام پر حملے شروع کر دیئے۔ مارکس کی تصانیف سے بہت عرصہ پہلے اوبیریان نے طبقاتی کشمکش اور سرمایہ دارانہ ریاست کی خصوصیات کو نہایت وضاحت سے بیان کیا۔ حکومت کیجانب سے استحصال کرنے والوں کے دفاع کی مذمت کرتے ہوئے اُس نے مشینوں کی توڑ پھوڑ کی مخالفت کی اور اُنہیں قومی ملکیت بنانے اور مزدوروں کے نفع کے لئے استعمال کرنے کی ترغیب دی، اگرچہ اُسکی تحریریں خیال پرستی (یوٹوپیائی) تھیں لیکن کمیونسٹ مینی فیسٹو کے تحریر ہونے سے ۱۵ ارسال پہلے اُس نے جملہ خصوصیات کے ساتھ سرمایہ دارانہ سماج میں طبقاتی کشمکش کا قدرے صحیح نقشہ کھینچا۔ امریکہ میں بھی مزدوروں نے سرمایہ داری پر حملے شروع کر دیئے۔ ۱۹۲۹ء میں نیویارک کے ایک مزدور موبس نے ملکیت کے سرمایہ دارانہ تصور کو چیلنج کیا اور زمین مکانات اور کارخانوں وغیرہ کی مساوی تقسیم کی تجویز پیش کی۔ خود سرمایہ داروں اور متوسط طبقے میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے سرمایہ داری کے جابرانہ استحصال پر اعتراضات شروع کر دیئے اُنہوں نے خیالی سوشلزم کی مختلف شکلوں میں اپنے احتجاج کا اظہار کیا۔ ان خیالی سوشلسٹوں میں سب سے زیادہ نامور رابرٹ اوون، سینٹ سائمن، فوریئر وغیرہ تھے۔ ان خیال پرستوں

کی ایک مشترکہ خصوصیت یہ تھی کہ سماجی ارتقاء کے حقیقی قوانین پر انحصار کرنے کی بجائے انہوں نے سماج کے لئے اپنے تصورات سے خیالی منصوبے تیار کئے۔ اُن کا خیال تھا کہ لوگ بشمول سرمایہ دار ان کے منصوبوں کو موجودہ نظام سے بہتر سمجھ کر اختیار کر لیں گے۔ اینگلز نے اپنی کتاب "سوشلزم یوٹو پیائی اور سائنسی" میں اس پوری تحریک پر محققانہ روشنی ڈالی ہے اوون جو اسکاٹ لینڈ کا باشندہ اور کپڑے کی مل کا مالک تھا نے ۱۸۰۰ء میں ایک مثالی کارخانہ قائم کیا۔ اس نے مزدوروں کو بہت سی سہولتیں بہم پہنچائیں اور خاصہ منافع کمایا۔ بعد میں اُس نے صنعت میں مزدوروں کو بھی اپنا حصہ دار بنایا۔ اُس کا خیال تھا کہ یہ منصوبہ نہ صرف مزدوروں بلکہ سرمایہ داروں کے لئے بھی قابلِ قبول ہوگا۔ لیکن سرمایہ دار کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ البتہ مزدور طبقے کی خاصی بڑی تعداد نے اُسے منظور کیا اور اُسے اپنی تنظیم کا صدر منتخب کر لیا فوریئر اور کیبے نے بھی مثالی سماج کے قیام کی ترکیبیں وضع کیں۔ عظیم انقلاب فرانس کے موقع پر جو دل فریب جمہوری وعدے کئے گئے تھے اُن سے عوام کو کچھ حاصل نہیں ہو سکا تھا۔ جس پر مایوس اور غضب ناک ہو کر ان پر جوش اور نیک دل اشخاص نے سرمایہ داری پر سخت تنقید کی اور ایک ایسے نئے سماج کو تشکیل دینی چاہی جو عقل اور انصاف پر مبنی ہو۔ اگرچہ ان خیال پرست مصنفین کی تحریروں نے لوگوں کو اپنی طرف کافی متوجہ کیا لیکن اُن سے کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔

پہلی انٹرنیشنل کے ماقبل سالوں میں متعدد بڑی سماجی تحریکیں منصۂ شہود پر آئیں۔ ان میں سیدھی سادھی اور خالص ٹریڈ یونینیں، بلانکی، پرودھوان، لاسل اور باکونن کے نظریات شامل تھے جنہوں نے انٹرنیشنل کی زندگی میں اہم کردار ادا کیا۔ لیکن اس ابتدائی دور میں مارکس اور اینگلز کا ترقی یافتہ سائنسی سوشلزم مزدور طبقہ کے لئے بدرجہا زیادہ انقلابی اور جامع نظریہ ثابت ہوا۔

سائنسی سوشلزم

۱۸۴۷ء کے موسم گرما میں لندن میں یورپ سے تعلق رکھنے والے مختلف مزدور گروہوں

کا اجتماع ہوا۔ اس موقع پر کمیونسٹ لیگ کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ یہ اولین بین الاقوامی تنظیم تھی جو پندرہ برس بعد قائم کیجانے والی بین الاقوامی مزدور انجمن کی پیش رو بنی۔

کمیونسٹ لیگ میں زیادہ تر فرانس، جرمنی، سوئٹزرلینڈ، اٹلی اور پولس کے جلاوطن مزدور اور دانشور شامل تھے۔ لیگ کے دوسرے اجلاس میں اس کا لائحہ عمل تیار کرنیکا فریضہ مارکس اور اینگلز کے سپرد ہوا، جو اُس وقت تک نامور اشتراکیوں کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ فروری ۱۸۴۸ء میں عالمی مزدور تحریک کی سب سے اہم دستاویز کمیونسٹ مینی فیسٹو معرض وجود میں آیا۔ کمیونسٹ مینی فیسٹو عالمی مزدوروں کا پہلا انقلابی لائحہ عمل تھا۔ اس نے مزدوروں کو سوشلزم کا راستہ بتانے کے لیے پرولتاری فکر و عمل کی ٹھوس بنیادیں استوار کیں۔ اس نے سرمایہ داری نظام کے تضادات کو اُجاگر کرتے ہوئے نئے سوشلسٹ سماج کے خدوخال بیان کیے۔

۱۸۴۸ء سے قبل سوشلسٹ تحریک میں سرمایہ داری کے تجزیہ، تنظیمی اشکال، جدوجہد کے طریق اور آخری منزل مقصود کے بارے میں مبہم اور غیر واضح تصورات تھے۔ یہ تحریک یوٹوپین تصوریت، مہم آزمائی اور موقع پرستی کا ملغوبہ تھی۔ کمیونسٹ مینی فیسٹو میں اس تمام تخیل پرستی جہالت اور فلسفہ طرازی کا خاتمہ کر دیا۔ مینی فیسٹو کے مطابق "آج تک وجود میں آنے والے کل سماج کی تاریخ طبقاتی کشمکش کی تاریخ ہے" مارکس نے طبقاتی کشمکش کی تشریح کرتے ہوئے مزدور طبقے کے انقلابی رول کو اُجاگر کیا۔ مارکس نے کمیونسٹ مینی فیسٹو میں ایک ایسی مخصوص انداز فکر رکھنے والی لڑاکا اور منظم سیاسی پارٹی کے خدوخال پیش کرنے شروع کر دیئے تھے جس کا قیام مزدور طبقے کے لیے سرمایہ دار طبقہ پر فتح حاصل کرنے کے لیے ضروری ہو جاتا ہے۔

مارکس نے اپنی عظیم تصنیف "سرمایہ" کی تین جلدوں میں نظام سرمایہ داری کا گہرا تجزیہ کیا۔

1848

اپنی اس تصنیف میں مارکس نے اُس وقت کے لاینحل مسائل یعنی سرمایہ داری میں وقفہ بہ وقفہ بحران کے اسباب، سرمایہ کے ارتکاز اور سرمایہ داری کی بہت سی دیگر خصوصیات کو وضاحت سے بیان کیا۔ لیکن اقتصادی میدان میں مارکس کا سب سے اہم کارنامہ مزدوروں کی محنت کے ذریعے پیدا ہونے والی "قدرِ زائد" اور اس پر سرمایہ دار کے تصرف کا بیان ہے جس سے سرمایہ دار کے استحصال کے پورے عمل کا راز افشا ہو گیا۔ اس نے یہ تجزیہ دو فیصلہ کن اقتصادی حقائق کی بناء پر کیا۔ ایک تو یہ کہ محنت کش عوام اپنی قوتِ محنت کو بطور جنس فروخت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں تاکہ وہ زندہ رہ سکیں دوسرے یہ کہ یہ قوتِ محنت اتنی زیادہ پیداواری صلاحیت رکھتی ہے کہ ایک مخصوص وقت میں اپنی اس ضرورت سے کہیں زیادہ پیداوار کرتی ہے جتنی کہ اس مخصوص وقت میں اُسے اپنی کفالت کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ پرولتاریہ کی محنت کے نتیجے میں پیدا ہونے والا یہ "قدرِ زائد" سرمایہ دار کے قبضے میں چلا جاتا ہے اور اُجرتی نظام کے جاری رہنے کے سبب سرمائے میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

قدرِ زائد

مارکس ازم کا سب سے بنیادی عنصر مارکس کا وہ تجزیہ ہے جس میں اس نے ریاست کو طاقت کا ایک ایسا ہتھیار ثابت کیا جسے بورژوا طبقہ مزدوروں کو اپنے ماتحت بنا کر رکھنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ مارکس اور اینگلز نے صاف طور پر یہ محسوس کیا کہ یہ ضروری ہے کہ وہ حکمران گروہ کو طاقت کا جواب طاقت سے دینے کے لیے پوری طرح تیار رہے کیونکہ موخر الذکر اپنے طبقاتی اقتدار کو قائم رکھنے کیلئے کسی بھی تشدد سے گریز نہیں کرتا۔

مارکس اور اینگلز کو اس بات کا احساس تھا کہ مزدور طبقے کو اُن تمام طبقات کے ساتھ جن کے مفاد مزدور مفاد سے مطابقت رکھتے ہوں اتحاد قائم کرنا ضروری ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی اُنہوں نے مزدوروں کو اپنی الگ جماعت قائم کرنے اور اپنی پالیسی وضع کرنے کی بنیادی ضرورت پر سب سے زیادہ زور دیا۔ دوسرا اہم سوال یہ درپیش تھا کہ مزدوروں کے فوری مطالبات اور سوشلزم کے قیام کی جدوجہد میں کس طرح مطابقت پیدا کی جائے۔ مارکس کے مطابق "کمیونسٹ مزدور

طبقے کے فوری مقاصد کے حصول اور وقتی مفادات پر عمل درآمد کے لئے تو لڑتے ہی ہیں۔ لیکن موجودہ تحریک میں وہ اس تحریک کے مستقبل کی بھی نمائندگی کرتے اور اس پر نظر رکھتے ہیں۔" مارکس اس اہم سوال کو بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ انقلابی مزدور طبقے کے ایک مضبوط اتحادی کی حیثیت سے کسان کیا فرائض انجام دے سکتا ہے۔

۱۸۴۸ء کا انقلاب

۱۸۴۸ء کا انقلاب ان عظیم تغیرات کا تسلسل تھا جن کے ذریعے سرمایہ دار طبقہ بتدریج یورپ اور بالآخر تمام دنیا پر چھا گیا۔ یہ تحریک فرانس سے شروع ہوئی اور فوراً ہی جرمنی، آسٹریلیا، اٹلی، ہنگری، بلجیم، پرتگال اور یورپ کے دوسرے ممالک میں پھیل گئی۔ زوال پذیر جاگیرداری پر سرمایہ داری کی یہ سب سے بڑی ضرب تھی۔ اس انقلاب کی فوری وجہ ۱۸۴۷ء کا شدید اور عام اقتصادی بحران تھا۔ جس نے کثیر التعداد صنعتی اداروں کو بند کر دیا تھا، بڑی تعداد میں بیروزگاری پھیلا دی تھی اور لوگوں کو بڑے پیمانے پر افلاس و محتاجی کا شکار بنا دیا تھا۔ فرانس کی سرزمین پر انقلاب کے آغاز کی وجہ یہ تھی کہ یہاں صنعت زیادہ ترقی یافتہ تھی، فرانسیسی بورژوازی زیادہ طاقتور اور انقلابی تھی، مزدور طبقہ سیاسی طور پر سب سے زیادہ پختہ کار اور بغاوت کے طریقوں سے واقف تھا اور جاگیرداری نظام ۱۷۸۹ء کے بعد پے درپے انقلابی ضربات کے باعث سب سے کمزور تھا۔ پیرس کے مزدور سرخ جھنڈے تلے منظم ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور شاہ فلپ لوئی کا تختہ الٹ دیا۔ شاہ پسندوں اور ان کے اتحادی بینک کاروں اور بڑے سرمایہ داروں کے خلاف مزدوروں کا "حلیف" چھوٹا بورژوا اور کم تر درجے کا بڑا سرمایہ دار طبقہ تھا۔ نئی عارضی حکومت جمہوریت کا اعلان کرنے میں پس و پیش کر رہی تھی، مزدوروں نے متذبذب حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ بالغ حق رائے دہی کا اعلان کرے، مزدوروں کو قومی رضاکاروں میں شامل کرے (اب تک یہ حقوق صرف متوسط طبقے کو حاصل تھے) اور قومی کارخانے قائم کرے تا کہ اس سے (ان کے مطابق) غربت کا خاتمہ ہو سکے۔ مزدوروں کے جوش و خروش سے خوفزدہ ہو کر بورژوازی نے اپنے سابقہ اتحادیوں یعنی مزدوروں

کو کچلنے کے لئے باقاعدہ طریقہ پر اپنی قوتوں کو منظم کرنا شروع کردیا۔ رجعت پرستوں نے چوروں اور آوارہ گردوں پر مشتمل چوبیس ہزار کی فوج کی مدد سے ورکشاپوں پر حملہ کردیا اور وہاں پیس ورک کا طریقہ لاگو کرنے کی کوشش کی تاکہ وہاں انتشار پیدا ہوسکے۔ ۱۵ رمئی کو ایک مختصر بغاوت کے ذریعے رجعت پسند حکومت کا تختہ اُلٹنے کی بے سود کوشش کی گئی۔ آخرکار ۲۱ رجون کو بڑے ورکشاپ بند کردیئے گئے۔ ایک سوچی سمجھی سازش تیار کی گئی تاکہ مزدوروں کو ایک بے نتیجہ بغاوت کے لئے مشتعل کیا جاسکے۔

ان حملوں کی وجہ سے ۲۲ رجون کو پیرس کے مزدوروں نے ایک ہولناک بغاوت کردی مارکس کہتا ہے "دو طبقوں کے درمیان یہ پہلی لڑائی تھی جس نے موجودہ سماج کو منقسم کردیا، مزدور بےنظیر بہادری اور دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے بغیر کسی رہنما کے، بغیر کسی عام منصوبہ اور وسائل کے برابر پانچ دن تک فوج کے حملے پسپا کرتے رہے" لیکن اب مزدوروں کے بس کی بات نہیں تھی۔ اُنہوں نے شکست کھائی۔ جلاد کیویئے ناک کے ہاتھوں تین ہزار سے زائد مزدور قتل ہوئے اور ہزاروں کی تعداد میں جیل میں ٹھونس دیئے گئے۔

۱۸۴۸ء — جون ۱۸۴۸ء میں فرانسیسی مزدوروں کی شکست نے تمام یورپ کے انقلابی حالات پر گہرا نقصان دہ اثر ڈالا۔ سابقہ انقلابی بورژوا طبقہ عموماً جاگیرداروں اور شاہ پرستوں کی گود میں چلا گیا۔ اس کا ایک خاص سیاسی اثر یہ ہوا کہ کئی دوسرے ملکوں میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے بورژوا طبقے کی رفتار دھیمی پڑ گئی تاہم یہ بالکل ختم نہ ہوسکی۔ یہ انقلاب جلد ہی جرمنی، آسٹریا، اٹلی، ہنگری اور دوسری سرزمینوں پر بھی پھیل گیا۔ پیرس میں انقلاب شروع ہونے کے ایک ہفتہ بعد ۶ رمارچ کو مزدور اور اُن کے اتحادیوں نے جرمنی کے شہر کولون پر قبضہ کرلیا۔ ۱۳ رمارچ کو ویانا کے لوگ شہزادہ میٹرنک کی حکومت کا خاتمہ کرکے اس اہم شہر پر قابض ہوگئے اور ۱۸ رمارچ کو برلن کے لوگوں نے مسلح بغاوت کردی۔ بورژوا طبقہ اپنی جرأت مندانہ معرکہ آرائی کی بدولت جرمنی اور آسٹریا میں اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

جرمنی میں انقلاب کے موقع پر اوفنبرگ میں جمہوریت پسند جماعتوں کا اجتماع ہوا اور آزاد خیال سرمایہ دارانہ پروگرام مرتب کیا گیا۔ اس پروگرام کا نچوڑ بورژوا طبقہ کے نقطۂ نظر سے بکھرے ہوئے جرمنی کو ایک متحدہ ریاست میں تبدیل کرنا تھا۔ آخر کار ۱۸۷۱ء میں جرمنی آسٹریا کے بغیر متحد ہو گیا۔ جاگیردارانہ شہنشاہی کا خاتمہ اور متحدہ جمہوری جرمنی کا قیام پرپرولتاریہ اور بورژوازی دونوں کا مشترکہ مفاد تھا اس لئے مارکس اور اینگلز نے اس عام پروگرام کی پرجوش حمایت کی اسکے ساتھ ہی وہ جانتے تھے کہ بورژوا انقلاب ایک ورس پرولتاری انقلاب کا صرف ابتدائی مرحلہ ہے۔ یہ کمیونسٹ مینی فیسٹو کے اُس تصوّر کے مطابق تھا جس میں کہا گیا ہے "جرمنی میں بورژوا انقلاب فوری طور پر آنے والے پرولتاری انقلاب کی تمہید ہے"۔ اینگلز نے بعد میں تسلیم کیا کہ اس نے اور مارکس نے سوشلسٹ انقلاب کے اتنے جلدی آنے کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ بایں ہمہ اُن کا ۱۸۴۸ء کے انقلاب جرمنی میں سوشلسٹ امکانات کا اندازہ بنیادی طور پر غلط نہ تھا۔ جرمن مزدور طبقے کے انقلابی جوش وخروش کے پیش نظر خصوصاً فروری میں پیرس میں مزدوروں کی شورش اور جون میں مخالف انقلاب بورژوا کے ساتھ مسلح تصادم کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یورپ کی تاریخ میں سوشلزم کے نئے باب کا اضافہ ہو رہا تھا۔

۱۸۴۸ء میں جرمن بورژوا طبقہ بجائے اس کے کہ جاگیردار ریاستوں کو ختم کرنے والے ابتدائی انقلاب سے فائدہ اُٹھاتا اُس نے اپنی لوفتی کا ثبوت دینا شروع کر دیا۔ وہ جاگیردار رجعت پسندوں کی بہ نسبت انقلابی مزدوروں سے زیادہ خوفزدہ ہو گیا تھا وہ سہم گیا کہ کہیں بورژوا انقلاب حقیقتاً سوشلسٹ انقلاب میں تبدیل نہ ہو جائے۔ اسی طرح جیسے فروری کی بغاوت کے بعد فرانسیسی بورژوا طبقہ متحد ہو گیا تھا، جرمن بورژوا بھی مزدور طبقہ کے خلاف متحد ہو گیا۔ جمہوریت کا مطالبہ تو ایک طرف رہا جرمن بورژوا اپنے بنیادی مطالبے متحدہ جرمنی سے بھی عملاً دستبردار ہو گیا۔ متوسط طبقے کے اُن عناصر کے ساتھ جواب بھی لڑنے کے لئے تیار تھے، مارکس اور اینگلز نے اپنا رشتہ قائم رکھتے ہوئے اپنی پوری طاقت مزدوروں کی مدد پر لگا دی۔ لیکن بعد میں آنے والے واقعات نے ثابت ہو گیا

کہ اس وقت پرولتاریہ ازحد کمزور اور سیاسی طور پر ناپختہ کار تھا۔ اس میں ابھی رہنمائی کی قابلیت نہیں تھی۔ وہ اُس بورژوا انقلاب کو کامیابی سے ہمکنار نہیں کر سکتا تھا جس کی خود بورژوا طبقہ علانیہ مخالفت کر رہا تھا اور نہ ہی اُس وقت سوشلسٹ انقلاب کے لئے حالات سازگار تھے

جون ۱۸۴۸ء میں پیرس میں مزدوروں کو جس شکست کا سامنا کرنا پڑا اُس کا ردعمل سارے جرمنی اور مشرقی یورپ میں ہوا۔ اس سال نومبر میں مخالف انقلاب فوج نے ویانا کو دوبارہ فتح کر لیا اور اسی ماہ برلن میں پروشیا کی قومی اسمبلی توڑ دی گئی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ فرنکفرٹ میں قومی اسمبلی عام جہاد کا اعلان کرے گی لیکن بورژوا طبقہ جس کی اسمبلی میں اکثریت تھی نے اپنے گھٹیا مفاد کے لئے قوم کو مخالف انقلاب عناصر کے ہاتھوں فروخت کرنا شروع کر دیا۔ ڈیڑھ سال بعد جرمن انقلاب بالآخر مغلوب ہو گیا۔ بورژوازی کو انقلاب میں ویسی فتح تو حاصل نہ ہوئی جیسی کہ چاہیئے تھی لیکن اس نے جرمنی میں مستقبل کی صنعتی ترقی کے لئے بڑی حد تک راستہ ہموار کر دیا۔ جب اُن کی یہ بنیادی تمنا پوری ہو گئی تو اس نے اپنے حلیف مزدور کسان اور متوسط طبقے کے مفادات سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ یہی وہ بنیادی سبق تھا جسے دوسرے امریکی انقلاب ۶۵ - ۱۸۶۱ء میں مزدوروں اور حبشی عوام کو اور مستقبل کے بہت سے سرمایہ دارانہ انقلابات میں مزدوروں اور دوسری جمہوری قوتوں کو یاد رکھنا چاہیئے تھا۔ دوسرا بنیادی سبق یہ تھا کہ یہ لازمی ہے کہ مزدوروں کی اپنی الگ سیاسی جماعت ہو۔ ۱۸۴۸ء کے انقلاب کی شکست اور پہلی انٹرنیشنل کے قیام کے درمیانی سال عموماً سیاسی ردعمل، تیز رفتار صنعت کاری مزدور طبقے کی وسیع تر ترقی اور کم تر انقلابی جدوجہد کے سال تھے۔ ان ہی سالوں میں تجارت میں پھیلاؤ اور قوانین غلہ کی تنسیخ سے انگریز مزدوروں کی حالت میں کچھ سدھار ہوا۔ نسبتاً خوشحالی کے زیر اثر چارٹسٹ تحریک کی ہلچل مدھم پڑ گئی۔ کمیونسٹ لیگ گروہ بندی کا شکار ہو کر ٹوٹ گئی

پہلی انٹرنیشنل کا قیام

سرمایہ داری نظام کی طرح مزدور تحریک بھی بنیادی طور پہ بین الاقوامی ہے جس

طرح صنعت ذرائع آمد و رفت اور مواصلات نے تمام حدیں توڑ دی ہیں اسی طرح پرولتاری طبقاتی شعور بھی تمام حدیں عبور کر گیا ہے ۔ مختلف ملکوں میں سرمایہ داری کی ترقی اور عالمی منڈی نے مزدوروں میں لازمی طور پر بین الاقوامیت کے جذبات پیدا کر دیئے ہیں کسی ایک مزدور تحریک میں بین الاقوامیت جس نسبت سے جاندار ہوگی اسی نسبت سے اس میں سیاسی پختہ کاری بھی ہوگی ۔ انیسویں صدی کے آغاز میں نوعمر پرولتاریہ کو اپنی سالمیت کے لئے عالمی سطح پر منظم ہونے کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا مزدوروں کو اس بات کی ضرورت تھی کہ اپنی بڑھتی ہوئی اقتصادی اور سیاسی جدوجہد میں حریص سرمایہ دار کے مقابلے میں ایک دوسرے کو سمجھیں اور مدد کریں ۔ مزید برآں مزدوروں کو بین الاقوامی ہڑتال شکنوں کے خلاف لڑنے کی ضرورت تھی اور انہیں جنگ کے خلاف بڑھتی ہوئی جدوجہد کا بھی احساس ہونے لگا تھا ۔

انگلستان میں بین الاقوامی اتحاد اور تنظیم کے لئے پرولتاریہ کی بیشتر ابتدائی کوششیں ایک فطری امر تھا کیونکہ یہی ملک ابتدائی سرمایہ داری کا مرکز تھا ۔ یہیں وہ تعداد میں زیادہ اور بہتر طور پر منظم تھا ۔ اس دور کی ایک بڑی اہم تنظیم "برادرانہ جمہوریت پسند" تھی جس کا اعلان تھا "تمام روئے زمین اپنی کل پیداوار کیساتھ سب کی مشترکہ ملکیت ہے" اس تنظیم کو صحیح معنوں میں پہلی انٹرنیشنل کی پیش رو قرار دیا جا سکتا ہے ۔ اس نے ایک ایسے تنظیمی ڈھانچے کی بنیاد رکھی جسے بعد میں پہلی انٹرنیشنل نے اختیار کیا ، یعنی یہ کہ اپنے اپنے ملکوں میں سیکریٹریوں کا تقرر کیا جائے ۔ ۱۸۴۸ء کے انقلاب کے بعد پیدا ہونے والے رد عمل نے اس جماعت کا خاتمہ کر دیا ۔ انگلستان اور فرانس میں اور بھی عالمی تنظیموں کی بنیاد رکھی گئی لیکن وہ زیادہ عرصہ تک نہ چل پائیں ۔

پہلی انٹرنیشنل کے قیام سے پہلے بورژوا قومی تحریکوں کے جو تند و تیز طوفان اٹھے انہوں نے تمام ملکوں کے مزدوروں میں بیداری پیدا کر دی اور ان کے بین الاقوامی اتحاد کے جذبے کو مضبوط بنا دیا ۔ ان میں سے ایک اہم تحریک انگریزوں کے جبر و تشدد کے خلاف آئرلینڈ کی جدوجہد آزادی تھی ۔ پھر ۱۸۵۹ء میں گری بالڈی کی قیادت میں آسٹریا کے خلاف اطالیوں کی قومی

جنگ ہوئی جس نے سرمایہ دار دنیا کے مزدوروں میں جوش و ولولہ پیدا کر دیا۔ آخر میں امریکہ میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا جو ہنوز جاری تھی کہ پہلی انٹرنیشنل کا قیام عمل میں آیا۔

پہلی انٹرنیشنل ۲۸ ستمبر ۱۸۶۴ء کو لندن کے سینٹ مارٹن ہال میں منعقد ہوئی تنظیم کے لیے "انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی ایشن" کا نام اختیار کیا گیا۔ مزدوروں کی پہلی عالمی تنظیم کے قیام کے روز اوّل ہی سے مارکس اس کا نظریہ دان اور عملی قائد تھا۔ پہلی انٹرنیشنل کا پہلا بیان اور پروگرام دنیا کے مزدور طبقے کی تاریخ میں ایک عظیم ترین دستاویز ہے۔ یہ روزمرّہ کی جدوجہد میں کمیونزم کے اصولوں کا اطلاق اور مزدور طبقہ کے آئندہ امکانات کی توضیح کی روشن مثال ہے۔ اس نے اعلان کیا "۱۸۴۸ء اور ۱۸۶۴ء کے درمیان صنعت کی ترقی اور تجارت کے پھیلاؤ کے باوجود مزدور طبقے کی مصیبتوں میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی وہ لوگ جو یہ پیش گوئی کرتے تھے کہ صنعت میں وسعت کے ساتھ غربت کا خود بخود خاتمہ ہو جائے گا، حقائق نے ان کی بات جھٹلا دی ہے۔ اس بیان کے مطابق "مزدوروں کا عظیم فریضہ سیاسی اقتدار حاصل کرنا ہے، اور وہ یہ کام اُسی صورت میں پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں اگر وہ متحد ہو جائیں اور علم و دانش اُن کی راہنمائی کرے"۔ قومی تعصبات کی شدید مخالفت کی گئی۔ یہ دستاویز اس تاریخی نعرے پر ختم ہوئی "دنیا بھر کے مزدورو متحد ہو جاؤ"

ٹریڈ یونین ازم، پرودھوان، لاسیل اور باکونن

مزدور طبقے کی جدوجہد جس کا مقصد سرمایہ داری نظام میں مزدور مفاد کی حفاظت سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ اور سوشلزم کا قیام ہے، ایک نہایت پیچیدہ سلسلہ عمل ہے جدوجہد کی اس انقلابی سائنس کا نام "مارکسزم لینینزم" ہے۔ یہ ایسے اجتماعی اسباق ہے جنہیں مزدور طبقے نے استحصالی طبقات کے خلاف عالمی پیمانے پر ایک صدی تک طویل جنگ کے بعد سیکھا ہے۔ مزدور طبقہ کو جب تک اچھی طرح مارکسی شعور حاصل نہ ہو جائے وہ سماجی حالت کے تعین اور اپنی آزادی حاصل کرنے کے طریقوں کے بارے میں بہت سے غلط تصوّرات اپنا

لیتا ہے۔ یہ تصورات طبقاتی جنگ کے دوران بلاارادہ پیدا ہوتے ہیں یا پھر وہ دشمن طبقات سے آتے ہیں۔

مزدور تحریک میں ایسے بہت سے نظریاتی رجحانات مختلف ادوار میں موجود رہے ہیں جنہوں نے ابتدا میں تو تعمیری رول ادا کیا لیکن جیسے جیسے مزدور تحریک میں پختگی آتی گئی ان میں رجعت پسندی حاوی ہونے لگی۔ ایسے گروہ عموماً انقلاب کے موقع پر مخالف انقلاب قوت بن کر سامنے آتے رہے۔ انٹرنیشنل کی تاریخ ایسی گروہ بندیوں کے خلاف کونسل کی مسلسل جدوجہد کی تاریخ ہے۔

پہلی انٹرنیشنل کی تمام تر زندگی میں اس کی مضبوط ترین عوامی تنظیمیں ملحقہ انگریز ٹریڈیونینیں تھیں۔ مزدور طبقہ خصوصاً ماہر مزدوروں کی حالت کے بہتر ہو جانے سے مزدور تحریک میں چارٹسٹوں کی سی جرات مفقود تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ خالص اور سادہ ٹریڈیونین ازم کا ڈھول پیٹا جا رہا تھا اور اکثر یونینیں ایک دوسرے کے ساتھ اتحاد کا کوئی عملی ثبوت نہیں دیتی تھیں۔ ان کی نظریں سرمایہ دارانہ سماجی ڈھانچے سے باہر نہیں جاتی تھیں۔ ان کے مقاصد محدود اقتصادی اغراض تک محدود تھے۔ ان کی موقع پرستی نے ہمیشہ انٹرنیشنل کی ترقی کی رفتار میں روڑے اٹکاتی رہی اور بالآخر اس نے تنظیم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ مارکس اور اینگلز اس "خالص اور سادہ" ٹریڈیونین ازم کے خلاف ہمیشہ نبرد آزما رہے۔

اس دور میں مزدور تحریک کا ایک اور اہم رجحان بلانکی ازم تھا۔ بلانکی الجھے ہوئے خیالات والا کمیونسٹ تھا اور پرولتاریہ کی آمریت کا مبلغ تھا۔ اس نے اپنی پالیسیوں کی بنیاد مسلح بغاوت اور سازشی گروہ بندی پر رکھی اور اس دور کے بیشتر فرانسیسی انقلابات میں اہم حصہ لیا۔ بلانکی ازم جس کا زور صرف مسلح بغاوت پر تھا، اس فرانسیسی مزدور تحریک کا ایک مخصوص نتیجہ تھا جو نہایت تشدد آمیز حالات سے گزر رہی تھی اور جس کے پس منظر میں جارحانہ انقلابی روایات تھیں، بلانکی مضبوط سیاسی جماعت، عوامی جتھے بندی، امداد باہمی کی تنظیم اور مزدور طبقے کے فوری مطالبات کے لئے روزمرہ کی جدوجہد میں سرگرم شمولیت کا شدید مخالف تھا۔ بلانکی کے انقلابی جوش و خروش

کی مارکس کے دل میں بہت قدر تھی لیکن وہ اس کی سازشی پالیسیوں کا معترف نہ تھا۔ پیرس کمیون کے بعد بلانکی ازم بحیثیت ایک سیاسی قوت ختم ہو گیا۔

پرودھن عہد جدید کے انارکزم (نراجیت) کا باوا آدم تھا، انٹرنیشنل کے ابتدائی سالوں میں اس تنظیم پر اس گروہ کا بڑا اثر تھا۔ اس کی سب سے اہم کتاب فلسفۂ افلاس ۱۸۴۶ء میں شائع ہوئی۔ پرودھن کے پروگرام کا مقصد "پیدا کرنے والوں" اور "صرف کرنے والوں" کی باہمی امداد کی ایک وسیع تنظیم قائم کرنا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ جماعتیں مسلسل پھیلتی ہوئی آخر کار سرمایہ داری نظام کی جگہ لے لیں گی۔ اینگلز مارکس کو اس منصوبہ کے اقتصادی پہلو کا خلاصہ بتاتے ہوئے لکھتا ہے۔ "ان لوگوں کے ذہن میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ پرولتاریہ کی بچت سے اور ان کے سرمایہ پر منافع اور سود سے دست برداری حاصل کر کے فی الحال پورے فرانس اور اس کے بعد ممکن ہو تو تمام دنیا کو خرید لیا جائے" اس نظام کا نام پرودھن نے "انارکی" رکھا تھا۔ مارکس اور اینگلز نے صاف طور پر بتایا کہ یہ چھوٹے سرمایہ داروں کا نظریہ ہے جسے ترقی پذیر سرمایہ دار کچل رہا ہے۔ پرودھن کا عام نظریہ تھا کہ مزدور اور کسان، سرمایہ داروں اور باقی ماندہ جاگیرداروں کے خلاف جدوجہد کر کے اپنی آزادی حاصل نہیں کر سکتے بلکہ امداد باہمی کی تنظیم کے ذریعے بتدریج کسان زمین کے مالک اور مزدور ان آلات پر قابض ہو سکتے ہیں جن سے وہ کام کرتے ہیں۔ پرودھن عمل اور نظریہ دونوں طرح سے طبقاتی کشمکش کا مخالف تھا۔ مزدور تنظیمیں، ہڑتالیں، اجرتوں میں اضافے اور مزدور قوانین کا نفاذ اس کے نزدیک بے معنی باتیں تھیں۔ وہ سیاسی جماعتوں کا بھی مخالف تھا اور انہیں استبداد کی پیداوار سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ریاست جس کا کام مزدوروں پر تشدد کرنا ہے نہ تو جمہوری بنائی جا سکتی ہے اور نہ یلغار کے ذریعے ختم کی جا سکتی ہے یہ صرف بتدریج اس کے پیش کردہ "امداد باہمی" کے نظام ہی سے مٹائی جا سکتی ہے "فلسفۂ افلاس" کے جواب میں مارکس نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "افلاس فلسفہ" شائع کی۔ کمیونسٹ مینی فیسٹو میں پرودھن ازم کو "بورژوا سوشلزم" سے موسوم کیا گیا جس کا مقصد "بغیر پرولتاریہ کے بورژوا" کو وجود

میں لاتا تھا

بہت سی بیرداپتی انحراف پسند تحریکات جنہوں نے مزدور تحریک کی پیش قدمی میں کاوٹیں پیدا کیں انجمن امداد باہمی سے متعلق تھیں۔ مارکس کے مطابق یہ انجمنیں پرولتاری جدوجہد اور تنظیم کے لئے کارآمد تو ثابت ہوسکتی ہیں لیکن بذات خود یہ مزدور طبقہ کو آزاد کروانے سے قاصر ہیں۔ جرمنی میں لاسل نے مزدور طبقے کی آزادی کے حصول کا جو راستہ دریافت کیا وہ یہ تھا کہ حکومت کی امدادی رقوم سے امداد باہمی کی انجمنوں کا ایک ایسا جال بچھایا جائے جو رفتہ رفتہ سرمایہ داری کی جگہ لے سکیں۔ حکومت سے امدادی رقم لینے کا طریقہ اُس نے یہ تجویز کیا کہ مزدوروں کو حق رائے دہی دیا جائے۔ اُسے یہ مغالطہ تھا کہ عام حق رائے دہی حاصل کرکے مزدور پارلیمنٹ میں نوے فیصد نشستیں حاصل کرلیں گے۔ لاسل کی موقع پرستی مزدوروں کو وسیع ٹریڈ یونین اور سیاسی تحریک تعمیر کرنے میں ہر ممکن طریقے کو استعمال کرنے کی مخالف تھی اور مارکس اسے چھوٹے سرمایہ دار کا رجحان سمجھتے ہوئے سختی سے اس کا مقابلہ کرتا رہا۔ پرودھن کی طرح لاسل بھی ٹریڈ یونینوں اور ہڑتالوں کو لاحاصل اور مزدوروں کی طاقت اور وسائل کا ضیاع سمجھتا تھا۔ وہ ٹریڈ یونینوں کے ذریعے اُجرت میں اضافہ کی جدوجہد کو بیکار سمجھتا تھا۔ مارکس نے اس عام مسئلے کا تجزیہ اپنے مشہور کتابچے "اُجرت، قیمت اور منافع" میں کیا ہے۔

مارکس کی دلیلوں کا خلاصہ یہ ہے کہ مزدور اپنی منظم اقتصادی اور سیاسی جدوجہد کے ذریعے اپنا معیار زندگی بلند کرسکتے ہیں۔ مارکس نے بتایا کہ ٹریڈ یونینیں مزدوروں کو محض زندہ رہنے کی سطح سے بلند کرسکتی ہیں۔ بالکل اس طرح جیسے کہ آجروں کا متحدہ یا اجارہ دارانہ عمل اُجرت کو اس سطح سے نیچے گرا سکتا ہے۔ اس طرح مارکس نے ٹریڈ یونین تحریک کی نظریاتی بنیاد قائم کی۔ اضافہ اُجرت کے عام مسئلے پر مارکس نے کہا "اُجرتوں کی شرح میں عام اضافہ منافع کی عام شرح کو گھٹا سکتا ہے لیکن عام طور پر اس سے جنس کی قیمتیں متاثر نہ ہوں گی"۔ پھر بھی مارکس نے متنبہ کیا کہ "سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کا عام رجحان اُجرتوں کے اوسط معیار کو بلند کرنے

کی بجائے اُسے گھٹانے کی طرف ہوتا ہے ٹریڈ یونین پر مارکس کی تنقید ہے کہ ان کا تعلق نتیجہ سے ہوتا ہے سبب سے نہیں۔ ٹریڈ یونین کی سماجی افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے مارکس اس کے محدود کردار کی جانب بھی توجہ دلاتا ہے۔

باکونن ازم

باکونن ازم کا شمار بھی اُس دور کے اہم نظریاتی رجحانات میں ہوتا ہے۔ اُس نے پرودھن کی امداد باہمی کی انجمنوں کے تصور کو قبول کرتے ہوئے اُس میں اہم ترمیمات اور اضافے کیے۔ ریاست کے بتدریج خاتمے کے تصوّر کو ترک کرتے ہوئے اُس نے یہ تجویز پیش کی کہ باغیانہ حملوں سے ریاست کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اُس نے ٹریڈ یونین جدوجہد کی جانب زیادہ بردبار رویّہ اختیار کیا اُس کا اصرار تھا کہ ٹریڈ یونینوں کا آخری مطمع نظر بغاوت ہونا چاہئے اور مستقبل میں انہیں بنیادی پیداواری تنظیموں کی طرح کام کرنا چاہئیے۔ باکونن کے اصل خیالات اُس کی کتاب "خدا اور ریاست" میں درج ہیں۔ اس کتاب میں اُس نے ریاست اور مذہب دونوں کو تحکمانہ تشدد کا مشترکہ سبب قرار دیا اور کہا کہ ان دونوں کا بالجبر خاتمہ ازحد ضروری ہے۔ اس کے مجموعی پروگرام کے خاص اصول یہ تھے (۱) لامذہبیت کی تبلیغ، (۲) ریاست کا انہدام (۳) سیاسی کام سے انکار اس لیے کہ ریاست کا خاتمہ صرف بغاوت ہی سے ممکن ہے۔ انارکزم اور باکونن ازم وغیرہ نے اُن نیم جاگیردار کیتھولک ممالک میں فروغ پایا جہاں پروٹسٹنٹ (بورژوا انقلابی) اصلاحات مکمل نہ ہوئی تھیں۔ جہاں کیتھولک کلیسا کے جبر نے اقتصادی، سیاسی اور سماجی زندگی کے ہر شعبہ کو جکڑ لیا تھا۔

باکونن نے نہ تو سماجی طبقات پر زور دیا اور نہ ہی طبقاتی جدوجہد کو سمجھا۔ وہ غریب عوام "آبادی کے بھوکوں مرنے والوں کا گروہ" اس کا موضوع بحث رہے۔ اُس نے "لمپن پرولتاریہ" کے "انقلابی جذبے" کا مقابلہ "مزدور اشرافیہ" کے "انقلابی جذبے" سے کیا۔ اُسے یہ مغالطہ تھا کہ افلاس زدہ لوگ ہمیشہ بغاوت پر آمادہ رہتے ہیں۔ انٹرنیشنل میں اُس کے نظریات کا ٹکراؤ لازمًا مارکس اور دوسرے کمیونسٹوں سے ہوا۔ انٹرنیشنل کی تمام تر زندگی ان دونوں ناقابلِ مصالحت گروہوں کے درمیان شدید جدوجہد کی دلچسپ کہانی ہے جو بالآخر اس کے انتشار پر ختم ہوئی، مارکسی

ریاست کے خاتمے کے وسیع تر اصول پر انارکسٹوں سے متفق تھے اختلاف طریقہ کار کا تھا۔ باکونن سے مارکس کی ٹکر تین بڑے اصولوں پر ہوئی (۱) مزدور طبقہ کی سیاسی جدوجہد (۲) پرولتاریہ کی آمریت (۳) پرولتاریہ کی پارٹی۔ برنسٹین کہتا ہے کہ باکونن کے لئے "وہ اقتصادی حالات کے بجائے ارادہ اشیاء کے بدلنے میں مستقلاً فیصلہ کن قوت ہے" باکونن سیاسی اصلاحات کی لڑائی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا جیسے ریاست کو جمہوری بنانے کی غرض سے استعمال کیا جانا۔ ہڑتال کو وہ جزوی مقاصد کے لئے کمزور حملہ قرار دیتا تھا۔ دوسری طرف مارکس کو اقتصادی اور سیاسی اصلاحات (اضافہ اُجرت، اوقات کار میں کمی، بچوں کی محنت کے ضابطے، فیکٹری آئین، حق رائے دہی میں توسیع وغیرہ) کی عملی اہمیت کا بخوبی اندازہ تھا لیکن مارکس سے بہتر کوئی نہیں جانتا تھا کہ ایسے جزوی مطالبات مزدور طبقہ کو آزاد نہیں کروا سکتے۔ مارکس نے بار بار بتایا کہ مزدوروں کی روزمرّہ کی جدوجہد اُن میں طبقاتی شعور اور تنظیمی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ مینی فیسٹو میں لکھا ہے کہ مارکسیوں کے پاس کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ دونوں قسم کے پروگرام ہوتے ہیں۔ لیکن باکونن کے ماننے والے صرف "زیادہ سے زیادہ" کا پروگرام رکھتے تھے یہی وہ اختلاف ہے جو ایک وسیع انقلابی عوامی تحریک اور تنگ نظر نقلی انقلابی گروہ میں ہوتا ہے۔ مارکس نے باکونن کے اس تصور کو مضحکہ خیز بتایا ہے جس کے مطابق ریاست سرمایہ داری کا تختہ اُلٹنے کے ساتھ ہی یکسر غائب ہو جائے گی۔ کمیونسٹ مینی فیسٹو میں صاف طور پر بتایا گیا ہے کہ ایک درمیانی دور آئے گا جس میں پرولتاریہ کی طبقاتی حکومت ہوگی جس کی بنیاد پر مخالف انقلاب قوتیں کچلی جا سکیں گی اور ایک نئے سماجی نظام کی بنیادیں استوار کی جائیں گی پرولتاریہ کا آخری مقصد یقیناً بلا ریاست کے سماج کا قیام ہے۔

سیاسی تنظیم کے بارے میں باکونن کا تصوّر تھا کہ ایک بے حد لامرکز تحریک ہونی چاہیے جو مکمل طور پر خود مختار عوامی گروہوں میں خود رو طریق پر پیدا ہو۔ ان کے مطابق انٹرنیشنل کی حیثیت ایک خط و کتابت، رابطہ قائم کرنے والے مرکز سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے

برعکس مارکس کا خیال تھا کہ انٹر نیشنل کو مزدوروں کی ایک ٹھوس، منظم عالمی تنظیم کا آغاز اور جنرل کونسل کو ایک موثر عالمی قیادت کی ابتداء ہونا چاہیئے۔ باکونن پرستوں اور مارکسیوں کے درمیان عملی تنظیمی سوال، طریق کار اور اغراض و مقاصد پر لاتعداد تلخ لڑائیاں ہوئیں جن میں انہوں نے مارکسیوں سے مار کھائی جو ان تمام مطالبات میں زیادہ حقیقت پسند واقع ہوئے تھے۔

انٹر نیشنل کی سیاسی سرگرمیاں

۱۸۶۶ء میں جب انٹر نیشنل کی پہلی کانگریس جنیوا میں منعقد ہوئی تو اس وقت تک انٹر نیشنل کی قیادت میں پرولتاریہ نے بین الاقوامی معاملات میں اپنی اہمیت جتلانی شروع کردی تھی جسے حکمران طبقہ اب تک صرف اپنا مقدس فریضہ سمجھتا تھا۔ اس دور میں جنرل کونسل نے اس وقت کی پولینڈ کی قومی آزادی کی جدوجہد کی جانب خاص توجہ دی۔ دوسری بڑی جدوجہد جس کی انٹر نیشنل نے براہ راست مدد کی، انگریز مزدور طبقے کی حق رائے دہی کے لیے جدوجہد تھی۔ آخر کار، ۱۸۶۷ء میں انگریز مزدور اس حق کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس رعایت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ فرانس میں بوناپارٹ وسیع حق رائے دہی کو تسلیم کر کے اسے جس طرح اپنے مفاد کے لیے استعمال کر رہا تھا اسے دیکھ کر سرمایہ داروں کے دل سے ووٹ کے حق دینے کا خوف جاتا رہا۔ جنرل کونسل نے امریکہ میں عظیم خانہ جنگی میں مخالف غلامی جذبات کو ابھارنے میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ بلاشبہ انگریز حکومت کو خانہ جنگی میں امریکہ کی جنوبی ریاستوں کی مدد کے لیے مداخلت سے روکے رکھنا انگریز مزدور طبقے کا فیصلہ کن اقدام تھا۔

پہلی کانگریس کے ڈیلیگیٹ مختلف سیاسی خیالات کے حامل تھے۔ اس اختلاف نے کانگریس کے کام میں کافی نظریاتی مشکلات پیدا کیں چونکہ یہ کام پہلی دفعہ سرانجام دیا جا رہا تھا۔ کانگریس کی بڑی کامیابی یہ تھی کہ اس نے ٹریڈ یونین تحریک کے بارے میں واضح طریق کار اختیار کیا۔ اس نے انہیں مزدور طبقہ کے لیے زبردست تعلیمی ذریعہ سمجھا اور

پرولتاریہ کی آزادی کے لئے انہیں بنیادی اہمیت کا حامل قرار دیا۔ قرارداد میں یونینوں کو سیاسی عمل پر اور زیادہ توجہ دینے کے لئے کہا اور غیر ماہر و زراعتی مزدوروں کو اپنی صفوں میں شامل کرنے پر زور دیا۔ ٹریڈ یونین کے سوال کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی ہڑتال شکنوں پر بھی توجہ دی گئی جس کا اثر انگلستان اور امریکہ کی ٹریڈ یونینوں پر مسلسل پڑ رہا تھا۔ انگریز ہڑتالیوں کو ہڑتال کے دوران بلجیم، ہالینڈ، اور فرانس سے برآمد کئے ہوئے ہڑتال توڑنے والوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کا سد باب کرنے کے لئے بین الاقوامی اتحاد پر زور دیا گیا۔ ایک اہم کام جو کانگریس نے کیا وہ یہ تھا کہ آٹھ گھنٹے کے کام کا دن قانوناً منوانے کے لئے جدوجہد کی تصدیق کی۔ کانگریس نے مطالبہ کیا کہ صنعت میں عورتوں اور بچوں کے کام کا ضابطہ بنایا جائے۔ بالواسطہ ٹیکس کی بجائے براہ راست ٹیکس کی حمایت کی گئی۔ مختلف ممالک کی مسلح افواج کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہوئے کانگریس نے مستقل فوج کے خاتمے اور عوامی ملیشیا کے قیام پر زور دیا۔

۱۸۶۶ء کی جنیوا کانگریس کے بعد آنے والا دور اقتصادی میدان میں مزدور طبقہ کی، بڑھتی ہوئی جدوجہد کا زمانہ تھا۔ ۱۸۶۶ء کے اقتصادی بحران سے آنے والے سالوں میں انگلستان فرانس، بلجیم اور دوسرے ممالک میں ہڑتالوں کی لہر دوڑ گئی۔ انٹرنیشنل کے حامیوں نے ان ہڑتالوں میں نہایت سرگرمی سے حصّہ لیا۔ ان میں سب سے نمایاں فروری ۱۸۶۷ء میں پیرس کے کانسی کے مزدوروں کی ہڑتال تھی جو مزدوروں کی فتح پر منتج ہوئی جس سے پورے فرانس میں ٹریڈ یونینوں میں متحد ہونے کا عمل تیز ہو گیا۔ دوسری اہم ہڑتالوں میں لندن کے درزیوں جنیوا کے معماروں، فرانس کے ریشم کے مزدوروں اور چارلیروئی کانکنوں کی ہڑتالیں شامل ہیں۔ ان تمام ہڑتالوں میں انٹرنیشنل نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ ۶۹-۱۸۶۶ء کے دوران انٹرنیشنل کی بڑی جدوجہد جنگ کے بڑھتے ہوئے خطرات کے خلاف رہی۔ ۱۸۶۶ء میں آسٹریا اور پروشیا کے درمیان جنگ کو رجعت پسندوں کی جنگ قرار دیتے ہوئے جنرل کونسل نے اس کی مذمت کی۔ امریکہ اور انگلستان کے مابین خانہ جنگی کے نتائج میں جنگ کے خطرات بڑھنے لگے تھے، جنرل کونسل نے امریکی

مزدوروں کو اس جنگی خطرے کے خلاف احتجاج پر آمادہ کیا۔ برسیلز میں ہونے والی کانگریس میں مزدوروں سے مطالبہ کیا گیا کہ اگر اُن کے اپنے ملکوں میں جنگ شروع ہو جائے تو وہ کام سے دستبردار ہو جائیں۔ اس سوال پر کہ آیا جنگ کو روکنے کے لئے عام ہڑتال کو ایک مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جانا چاہئیے یا نہیں، عالمی مزدور تحریک میں ایک اہم طویل نزاعی مسئلے نے جنم لیا۔

اسی عرصے میں مارکس کی "سرمایہ" کی پہلی جلد سامنے آئی جس میں سرمایہ داری کے عمیق تجزیے سے مارکس کا "قدر زائد" کا انقلابی نظریہ مکمل طور پر سامنے آیا۔

انٹرنیشنل کی دوسری کانگریس جو لوزان میں منعقد ہوئی ہیں بہت سی یونینیں فنڈز نہ ہونے کی وجہ سے اپنے نمائندے نہ بھیج سکیں۔ پرودھن پرست اس میں بہت سرگرم رہے اور اپنے بہت سے موقع پرست خیالات کو منوانے میں کامیاب بھی ہوئے۔ اُنہوں نے خصوصاً ہڑتالوں کو ناپسندیدہ قرار دینے کی تجویز منظور کرائی اور عوامی بنک اور مفت مزدور قرضہ کے چھوٹے سرمایہ دارانہ نسخہ کی تصدیق کرائی۔ ایک اہم تعمیری کام جو کانگریس میں ہوا وہ اس قرارداد کا منظور کیا جانا تھا جس میں حمل ونقل و مبادلہ کے ذرائع کو ریاستی ملکیت میں لینے کی سفارش کی گئی۔ یہ وہ پہلا ٹھوس ضابطہ تھا جس میں پیداواری ذرائع کو اجتماعی ملکیت بنانے کا تصور پیدا ہوا۔ زمین کو قومی ملکیت قرار دینے کی تحریک پوری حمایت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے آئندہ کانگریس کے لئے اُٹھا رکھی گئی۔ دوسری اہم قرارداد کا تعلق سرمایہ دارانہ نظام کے ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے سیاسی اصلاحات کے لئے لڑنے سے تھا۔ کانگریس میں اتفاق سے منظور کیا گیا کہ پرولتاریہ کی سماجی آزادی اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک اُنہیں سیاسی آزادی نہ ہو۔ ایک اہم مسئلہ جس پر بحث ہوئی جنگی خطرات سے متعلق تھا۔ لوزان کانگریس کے بعد یہ مسئلہ بین الاقوامی مزدوروں کی تمام کانگرسوں کے لئے مستقل ایجنڈہ کی صورت اختیار کر گیا۔

انٹرنیشنل کی تیسری کانگریس ۱۸۶۸ء کو برسیلز میں منعقد ہوئی جس میں ہڑتال کو بالآخر مزدوروں کا جائز اور ناگزیر اسلحہ تسلیم کیا گیا۔ زمینی ملکیت کے مسئلے پر پرودھن پرستوں کو

شکست ہوئی جو چھوٹے کاشتکاروں کے مفادات کی ترجمانی کرتے تھے۔ کانگریس میں ریلوے، قابلِ کاشت اراضی، جنگلات، نہریں، سڑکیں، ٹیلی گراف وغیرہ کو قومی ملکیت میں لینے کا مطالبہ کیا گیا۔ اس کانگریس میں پرودھن پرستوں کا رول بہت کم رہ گیا۔ مزدور تحریک میں مارکسزم کے خلاف پہلی بین الاقوامی مزاحمت کا دیوالیہ نکل گیا۔

انٹرنیشنل کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور اُس کے فعال کردار نے اُن بورژوا عناصر کو خوفزدہ کر دیا جنہوں نے ابتدا میں اس کے قیام کو لائق توجہ نہ سمجھا تھا۔ اور یوں بورژوا ذرائع ابلاغ نے انٹرنیشنل کے خلاف اپنی طویل مہم کو شروع کیا جس میں اس کے خلاف وسیع پیمانے پر بہتان تراشی اور غلط بیانی کا آغاز ہوا اور مختلف ممالک کی پولیس انٹرنیشنل کے ارکان کے درپے ہو گئی اس زمانے میں انٹرنیشنل کی نہ صرف ٹریڈ یونین رکنیت میں اضافہ ہوا بلکہ سیاسی تنظیم نے بھی ترقی کی۔ اس دوران میں قومی مزدور جماعتوں کی تشکیل سے متعلق بہت سے نمایاں رجحانات وجود میں آئے جو بعد میں کل مزدور سیاسی بین الاقوامیت کی بنیا دیتے۔ جرمنی اور امریکہ میں مزدور طبقہ کے خود مختار سیاسی عمل کے بارے میں طاقتور رجحانات نظر آنے لگے۔

باسیل کانگریس اور باکونن ازم

پہلی انٹرنیشنل کی چوتھی کانگریس ۱۸۶۹ء کو باسل (سوئٹزرلینڈ) میں منعقد ہوئی اس کانگریس کے انعقاد کا دور انٹرنیشنل کی تیزی سے بڑھتی ہوئی مقبولیت کا دور تھا۔ براعظم یورپ میں تقریباً ۲۹ اخبارات ایسے تھے جو انٹرنیشنل کی حمایت کرتے تھے۔ بیشتر ممالک میں اس کے اراکین کی تعداد لاکھوں کے ہندسوں کو چھو رہی تھی۔

اس کانگریس میں ایک اہم اضافہ یہ تھا کہ اس میں جرمنی کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کا وفد شامل تھا۔ یہ پہلی صحیح قسم کی سوشلسٹ پارٹی تھی جس نے اپنا الحاق انٹرنیشنل سے کیا۔ اس کی قیادت لائب نخ، جیسے پختہ کار مارکسی کر رہے تھے، باسل کانگریس کا دوسرا بڑا واقعہ باکونن کا بحیثیت ڈیلی گیٹ شریک ہونا تھا جو اس سے پہلے انٹرنیشنل ڈیموکریٹک اتحاد نامی تنظیم میں کام کر رہا تھا اس اتحاد میں باکونن نے اپنے انتہا پسندانہ انقلابی پروگرام کی خوب اشاعت کی اور ریاست اور خدا کے خلاف براہ راست اور

مکمل اعلانِ جنگ کر دیا۔ اس نے پورے مزدور طبقے کو "قدامت پسند مزدور اشرافیہ" کہہ کر اس کی مذمت کی اور اپنے پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے خاص زور دانشوروں، طالب علموں، آوارہ گردوں اور اوباشوں کے طبقات پر دیا۔ باکونن ازم جیسی تحریک کے لئے وہ زمانہ سازگار تھا۔ اُس وقت یورپ میں سیاسی حالات بالعموم بے حد غیر یقینی تھے۔ سرمایہ دار طبقہ بتدریج جاگیرداری نظام کا کوڑا کرکٹ صاف کرتا ہوا، اقتدار کی مسند سنبھال رہا تھا اور تیزی کے ساتھ ترقی پذیر محنت کش طبقہ طبقاتی پروگرام اور تنظیم کے لئے تجرباتی جنگجویانہ جدوجہد میں مصروف تھا۔ مزدور طبقہ ابھی طبقاتی جدوجہد کے طریق کار میں نظریاتی طور پر پسماندہ اور ناتجربہ کار تھا۔ اس لئے ان میں سے بیشتر کے لئے باکونن کا بتایا ہوا "آزادی کا قریبی راستہ" اختیار کر لینا آسان تھا۔

مارکسیوں اور باکونن کے حامیوں کے درمیان دو باتوں پر بڑے تصادم ہوئے۔ ایک تو وہ مطالبہ تھا جس کے مطابق کانگریس عوام کا براہ راست قانون سازی اور استصواب رائے کا حق تسلیم کرنے کا مطالبہ کرے، جسے جرمن ڈیلی گیٹوں نے پیش کیا۔ چونکہ یہ تجویز باکونن پرستوں کے بنیادی اصول "جزوی سیاسی اصلاح" سے متصادم تھی لہٰذا انہوں نے اس پر شدید حملے کئے۔

دوسرا بڑا تصادم حق وراثت پر ہوا جو باکونن کا پسندیدہ موضوع تھا۔ اُس نے قرارداد کی شکل میں مطالبہ کیا کہ کانگریس حق وراثت کی فوری اور مکمل تنسیخ کا مطالبہ کرے۔ مارکس نے مینی فیسٹو میں ذرائع پیداوار کی ضبطی اور سماجی تنظیم نو کی تکمیل کے بعد جو عارضی تدابیر پیش کی تھیں اُن میں موروثی حق ملکیت کا انسداد بھی شامل تھا۔ مارکسیوں کا موقف یہ تھا کہ حق وراثت سرمایہ داری کا سبب نہیں بلکہ اُس کا نتیجہ ہے اور اسے سرمایہ داری کے خاتمے کا نقطہ آغاز نہیں بنایا جا سکتا لیکن کانگریس میں باکونن کی تجویز منظور کر لی گئی۔

اگرچہ اُس وقت آئرلینڈ کا مسئلہ کانگریس کے سامنے باضابطہ طور پر نہیں آیا لیکن اس نے انٹرنیشنل کی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ یہ نوآبادیاتی ممالک اور اُن کے استحصال کنندگان کے مابین تعلقات کے بارے میں پالیسی کی نشوونما کا موجب بنا، جو آج بھی عالمی مزدور تحریک کے

لیے اہم ترین اہمیت رکھتا ہے - چارٹسٹوں کے زمانے سے مارکس آئرلینڈ کی آزادی کے مطالبے سے
وابستہ تھا - بیشتر قدامت پسند انگریز ٹریڈ یونینسٹ آئرلینڈ کے مسئلے پر مارکس کے موقف کی نیم دلانہ
حمایت کرتے تھے - مارکس ایک مباحثے میں کہتا ہے " انٹرنیشنل کا کام ہے کہ وہ انگلستان اور آئرلینڈ
کے درمیان جھگڑے کو ہر مقام پر اولیت دے اور ہر جگہ آئرلینڈ کی حمایت کرنے " اُس نے بتایا کہ آئرلینڈ
کے سوال پر انگریز اور آئرستانی محنت کشوں کے درمیان پھوٹ مزدوروں کے لئے مہلک کمزوری کا
باعث ہے - انگریز مزدور آئرستانی مزدور کے خلاف مذہبی، سماجی اور قومی تعصبات رکھتا ہے اور
اس کے عوض آئرستانی مزدور ترکی بہ ترکی جواب دیتا ہے - آخر میں مارکس کہتا ہے کہ لندن میں
مرکزی کونسل کا خاص کام یہ ہے کہ وہ انگریز مزدوروں کو اس حقیقت کا احساس دلائے کہ آئرلینڈ
کی قومی آزادی کا سوال کوئی خیالی انصاف اور انسان دوستی کا جذبہ نہیں بلکہ خود انکی آزادی
کے لئے پہلی شرط کی حیثیت رکھتا ہے - کیونکہ مارکس کو یقین تھا کہ انگلستان کا اشرافیہ خود
انگلستان پر اپنا تسلط قائم رکھنے کے لئے آئرلینڈ کو بطور ذریعہ استعمال کرتا ہے - آئرلینڈ کے
مسئلے پر مارکس کی پالیسی کی عملی اہمیت آج بھی اسی طرح مسلمہ ہے اور محکوم ملکوں کے پرولتاریہ
کے لئے اپنی قومی تحریکوں میں اسے اپنانا لازمی ہے -

باسل کانگریس کے بعد کا دور انٹرنیشنل کی صفوں میں انقلابی اُمیدوں اور توقعات کا
دور تھا - محنت کش جنگجویانہ موڈ میں تھے - باکونن پرستوں کو یقین تھا کہ سماجی انقلاب بس اب
کسی بھی لمحے آنے والا ہے چنانچہ وہ اصلاح کے ہر طریقے کو نہایت نفرت سے دیکھتے تھے - اس زمانے
میں مارکس بھی ایک بڑے پرولتاری انقلاب کے وقوع پذیر ہونے کی توقع کر رہا تھا - تاہم یہ اُس
کی شدید حقیقت پسندی تھی کہ اُس کی یہ توقع اقتصادی اور سیاسی میدانوں میں مزدوروں کی فوری
جدوجہد کی ہمت افزائی کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکی انٹرنیشنل کی ٹھوس نشوونما نے مزدوروں کے
زیر قیادت انقلاب کی بڑھتی ہوئی توقعات میں بڑا اُبھار پیدا کر دیا -

باسل کانگریس کے بعد فرانس اور پروشیا کے درمیان جنگ کے بادل گھرنے لگے -

بوناپارٹ اور بسمارک دونوں جنگ کے خواہش مند تھے۔ بسمارک اس جنگ کے ذریعے جرمنی کی چھوٹی چھوٹی منتشر ریاستوں کو ایک متحدہ جرمن ریاست میں متحد کرنا چاہتا تھا جبکہ بوناپارٹ سیکنڈ ایمپائر کی کمزور حالت کا احساس کرتے ہوئے اس کی رگوں میں زندگی کا نیا خون دوڑانا چاہتا تھا۔ ۱۸۷۰ء میں دونوں کی مرادیں بر آئیں اور جنگ کا آغاز ہو گیا اس کشمکش سے گہرے سیاسی نتائج برآمد ہوئے جرمنی متحد ہو کر یورپ کا اہم طاقتور ملک بن گیا۔ صنعتی میدان میں ترقی ہوئی اور ایک مضبوط پرولتاریہ نے جنم لیا۔ یہ جنگ ہی تھی جس کی وجہ سے بالآخر جرمنی کا منظم مزدور نصف صدی تک عالمی مزدور تحریک کا قائد بنا رہا۔ جنگ کے فوری اثرات نے حالات کا وہ تسلسل پیدا کیا جس کی وجہ سے پیرس کمیون ظہور میں آیا جس نے بالآخر پہلی انٹرنیشنل کا خاتمہ کر دیا

پیرس کمیون ۱۸۷۱ء

جب جنگ میں بوناپارٹ کی شکست کی خبریں پیرس پہنچیں تو لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے اور ۴ ستمبر ۱۸۷۰ء کو اُنہوں نے بوناپارٹ کا تختہ اُلٹ کر جمہوریت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ ۸ فروری ۱۸۷۱ء کو نئی اسمبلی کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس میں دو تہائی شاہ پسند، ایک تہائی بورژوا جمہوریت پسند اور چند انتہا پسند چھوٹے سرمایہ دار بھی شامل تھے تاکہ مزدور طبقہ کے لیے بھی کچھ دلچسپی کا سامان پیدا ہو سکے۔ حالات کے اس پورے ارتقاء نے باکونن اور بلانکی پرستوں کو تیزی سے سرگرم عمل کر دیا۔ اُنہوں نے مختلف شہروں میں نئی حکومت کے خلاف بغاوت کی ناکام کوششیں کیں یہاں تک کہ بلانکی نے چند گھنٹوں کے لئے پیرس پر قبضہ تک کر لیا۔ ستمبر ۱۸۷۰ء میں انٹرنیشنل کی جنرل کونسل نے مارکس کا لکھا ہوا دوسرا منشور شائع کیا۔ اس دستاویز میں فرانسیسی مزدوروں کو متنبہ کیا گیا کہ وہ فرانس کے غدار بورژوا طبقے سے ہوشیار رہیں اور اپنی طبقاتی طاقت کو مضبوط کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ مارکس کو احساس تھا کہ یہ وقت انقلابی طریقے پر رجعت پسند جمہوری حکومت کا تختہ اُلٹنے کا نہ تھا جیسا کہ باکونن اور بلانکی کوشش کر رہے تھے۔

جرمن فوجیں پیرس کو محاصرے میں لیے ہوئے تھیں۔ بسمارک پیرس پر حملہ کرنے سے ہچکچا

رہا تھا کیونکہ اُسے اطلاع تھی کہ دولاکھ بہترین مسلح فوج (جو مبالغہ تھا) شہر میں موجود ہے اس کے ساتھ ہی وہ پیرس کے مزدوروں کے انقلابی جنگجویانہ جذبہ کو بخوبی جانتا تھا، پیرس کی فوج میں بیشتر رضاکار تھے جن میں اکثریت مزدوروں کی تھی۔ انہیں کے ہاتھوں میں محصور پیرس کا انتظام تھا۔ قومی رضاکار خاص طور پر تھیرس کی حکومت سے چوکنا رہتے تھے کہ وہ انقلابی پرولتاریہ سے خوفزدہ ہو کر کہیں شہر کو جرمنوں کے حوالے کرنے کی کوشش نہ کرے ۲۶ فروری کو حکومت پیرس سے دست برداری پر رضامند ہو گئی۔

پیرس کے باغیوں کو اطاعت پر مجبور کرنے کے لئے تھیرس نے انہیں غیر مسلح کرنے کا حکم دیا پیرس کے محصور اور فاقہ کش محنت کش بیدار ہو کر میدان میں آ گئے۔ تھیرس کی فوج کو شکست دے دی گئی اور شہر عوام کے زیر اقتدار آ گیا بلانکی کے پیروکار وہ بنیادی منظم طاقت تھی جس نے بغاوت کی رہنمائی کی اس کی نفری چار ہزار منظم مسلح افراد پر مشتمل تھی مارکس بین الاقوامیت پسندوں نے جن کی تعداد پیرس میں بہت تھوڑی تھی بغاوت میں شامل ہونے کا منصوبہ نہیں بنایا تھا لیکن جب اس کا آغاز ہوا تو انہوں نے بھی نہایت سرگرمی کے ساتھ حصہ لینا شروع کر دیا۔

کمیون مردوں کے عام حق رائے دہی کی بنیاد پر قائم کردہ ادارہ تھا، جسے قانون سازی اور انتظامیہ کے اختیارات حاصل تھے۔ انقلابی منصوبہ یہ تھا کہ پیرس کے نمونہ پر فرانس کے تمام شہروں قصبوں اور دیہاتوں میں "کمیون" قائم کیے جائیں۔ ہر کمیون پیرس کے قومی ادارہ میں اپنا نمائندہ بھیجے، کمیون کی بنیادی کمزوری یہ تھی کہ اس کی اپنی کوئی سیاسی پارٹی اور پروگرام نہیں تھا۔ انقلاب اور حکومت سب کچھ جد و جہد کی وقتی پیداوار تھے۔ پیرس کی مرکزی کمیٹی کو چاہئے تھا کہ وہ ابتدا ہی میں عوام کے نام پر تھیرس حکومت کے تمام رہنماؤں کو گرفتار کر لیتی اور ورسیلز پر حملہ کر کے حکومت کے مرکز پر قبضہ کر لیتی۔ لیکن مرکزی کمیٹی خانہ جنگی کو برا سمجھتے ہوئے اس سے بچنا چاہتی تھی جبکہ تھیرس کے رجعت پسند پیرس پر حملہ کر کے عملاً خانہ جنگی کی ابتدا کر چکے تھے مارچ، اپریل میں پیرس کمیون کے لئے ۹۲ کونسلر چنے گئے کمیون میں بلانکی کے پیروکاروں اور

نیوجاکونیوں کی اکثریت تھی ۔ پرودھن کے پیرو کار بھی بڑی تعداد میں تھے تقریباً ۱۸ ارمارکسی بھی اس میں شریک تھے ۔ ان نوارکان کی ایک انتظامیہ کمیٹی بھی منتخب ہوئی جس کا ہر رکن ایک محکمے کا سربراہ مقرر ہوا ۔ یہ محکمے تھے : جنگ ، مال ، خوراک ، خارجہ ، محنت ، انصاف ، پبلک سروس اطلاعات اور تحفظ عامہ ، کمیون کی بنیاد پرولتاریہ ، چھوٹے اور شہری سرمایہ دار کسانوں کے انقلابی اتحاد پر تھی اور اس کی قیادت مزدوروں کے ہاتھ میں تھی ۔

پیرس کمیون کو جن متعدد خامیوں اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا ان میں مختلف دھڑوں کے اندرونی اختلافات اور بقیہ فرانس سے کٹ جانا بھی شامل تھیں ، کسی واضح پروگرام کا نہ ہونا اور ٹھوس طریقے پر منظم سیاسی پارٹی کی عدم موجودگی ایسی خامیاں بھی شروع سے لے کر آخر تک اس کے گلے میں چکی کا پاٹ بن کر لٹکتی رہیں ۔ علاوہ ازیں کمیون جو صرف ۷۲ روز تک زندہ رہا کو بڑھتی ہوئی خانہ جنگی کا بھی سامنا کرنا پڑا ۔ ان تمام تر خامیوں سے قطع نظر کمیون نے بہت سی تعمیری کامیابیاں بھی حاصل کیں ۔ کمیون نے جو بعض اہم فیصلے کیے وہ یہ تھے ۔ اس نے مذہب کو ریاست سے علیحدہ کر دیا ۔ کلیسا کو دی جانے والی سرکاری امداد بند کر دی ۔ مستقل فوج کو ختم کر کے عوامی ملیشیا قائم کی ۔ پولیس کو دیئے گئے تمام سیاسی انعامات چھین لیے ۔ کل عہدہ داروں کو رائے دہندوں کے سامنے جوابدہ قرار دیا ۔ تمام ججوں اور مجسٹریٹوں کا تقرر بذریعہ انتخاب کیا اور زیر محاسبہ رکھا ۔ مفت اور عام تعلیم کا انتظام کیا ۔ معیشت اور سماجی بھلائی کے بہت سے طریقے اپنائے گئے ۔ بند کارخانوں کو ضبط کر کے انہیں چلانے کے لئے امداد باہمی کی انجمنوں کے سپرد کر دیا گیا ۔ لاتعداد بیروزگار عوام کی امداد کا بندوبست کیا گیا ۔

ان کامیابیوں کے باوجود کمیون بہت سی غلطیوں اور کوتاہیوں کا مرتکب ہوا اس نے رجعت پسند ورسیلز حکومت کے خلاف جنگی اقدامات سے گریز کیا ، داخلی دشمنوں سے رواداری کا سلوک کیا جس سے بہت سے انقلاب دشمنوں کے لئے غداری اور تخریبی کارروائی کا دروازہ کھلا رہا ۔ کمیون نے مستعدی کے ساتھ فرانس کے دوسرے حصوں تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی

خصوصاً کسانوں کو ان کے مفاد کی خاطر اپنے ساتھ نہیں ملایا جو ان کی سب سے بڑی غلطی تھی جو پرانی خفیہ دستاویزات اُن کے ہاتھ لگیں اُنہیں شائع نہیں کیا جن کی اشاعت سے رجعت پسندوں پر کاری ضرب لگتی۔ اس کے علاوہ بنک آف فرانس کی تحویل میں موجود تیس کھرب فرانک ضبط نہیں کئے گئے۔ بنک کی ضبطی ورسیلز کی حکومت کے لئے مہلک ثابت ہوتی۔

اپریل کا آغاز ہوتے ہوئے خانہ جنگی شدید ہو چکی تھی۔ کمیون کے حامی بے جگری سے لڑتے رہے لیکن شکست یقینی ہو چکی تھی۔ تھیرس کے حامیوں نے حالات کو انتہائی مسخ کردہ شکل میں پیش کرکے کسانوں کی بڑی تعداد کو کمیون کے خلاف لا کھڑا کیا۔ بسمارک نے بھی ایک لاکھ جنگی قیدی رہا کر دیئے تاکہ یہ ورسیلز حکومت کی مدد کریں۔ آخر کار ۲۸ مئی کو کمیون کچل دیا گیا۔ آنے والے چند دنوں میں کم از کم تیس ہزار مزدوروں عورتوں اور بچوں کو نہایت سنگدلی کے ساتھ موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔

پیرس کمیون نے عالمی مزدوروں کو بہت سے اہم سبق دیئے جو آج بھی اُسی طرح مستند ہیں۔ سب سے زیادہ اہم جس پر مارکس نے شدت کے ساتھ اصرار کیا کہ تمام ملکوں کے مزدوروں کے لئے ایک مضبوط اور واضح نقطہ نظر کی منظم کمیونسٹ پارٹی کی ناگزیر ضرورت ہے جو سوشلزم کے دشوار گزار راستے پر راہنمائی کے فرائض انجام دے سکے۔ یہ کمیون کا فیصلہ کن سبق تھا اور باکونن کی اس دلیل کا قطعی رد ہے کہ سیاسی پارٹی غیر ضروری ہے اور عوام کی خود رو جدوجہد اس کے لئے کافی ہے تاہم تقریباً نصف صدی تک کمیون کی حقیقی اہمیت آنکھوں سے اوجھل رہی مارکسی بھی اسے فراموش کر چکے تھے یہاں تک کہ لینن نے پھر سے اُنہیں اس کے معنی بتلائے کمیون کے تنظیمی ڈھانچے اور مستقبل کی روسی سوویت میں بلاشبہ گہری مناسبت ہے۔ پیرس کمیون کے تجربے نے ایک بنیادی اہمیت کی بات یہ بتلائی کہ سرمایہ داری کی شکست اور سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے بعد مزدوروں کو اپنے طور پر ایک ریاست قائم کرنا لازمی ہوگی۔ یہ ایک نئے طرز کی حکومت ہوگی۔ جس کا کام مخالف انقلاب قوتوں کو کچلنا اور نئے سماج کی بنیاد رکھنے کے لئے تنظیم کرنا ہوگا

کمیون نے یہ بھی بتایا کہ "ریاست کا بتدریج خاتمہ" اس سے کہیں زیادہ طویل عمل ہوگا جتنا کہ عموماً مارکسیوں کا خیال تھا۔ کمیون کا ایک اور سبق جس پر مارکس اور لینن نے کافی زور دیا وہ یہ تھا کہ محنت کش عوام ایک بار اقتدار حاصل کر لینے کے بعد اپنی انقلابی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بورژوا طرز حکومت اختیار نہیں کریں گے بلکہ وہ پرانی فوجی نوکر شاہانہ مشینری کو تباہ کر دیں گے۔

اس کے باوجود کہ پیرس کمیون کچل دیا گیا، یہ عالمی مزدور طبقہ کی پہلی حقیقی انقلابی کامیابی تھی۔ وہ سرمایہ دارانہ نظام میں ابتدائی شگاف تھا جو نصف صدی بعد روسی انقلاب کی شکل میں ظاہر ہو کر عالمی سرمایہ داری کی دیواروں میں ایک وسیع اور ناقابلِ مرمت رخنہ بن گیا۔

ہیگ کانفرنس ۱۸۷۲ء

پیرس کمیون کے زوال کے بعد یورپ کے مختلف ملکوں میں انٹرنیشنل کو بڑھتے ہوئے جبر و تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ کمیون نے حکمران طبقات کو ایک حقیقی جنگ سے دوچار کر دیا تھا۔ بورژوا اخبارات نے انٹرنیشنل پر وحشیانہ حملے شروع کر دیئے۔ ۱۸۷۱ء میں فرانس میں ایک قانون منظور کیا گیا جس کے مطابق انٹرنیشنل سے تعلق رکھنا جرم قرار دیا گیا۔ ۱۸۷۳ء میں روس جرمنی اور آسٹریا ہنگری نے انٹرنیشنل کے خلاف لڑنے کے لیے ایک باہمی سمجھوتہ کیا۔ تاہم انٹرنیشنل کے لیے پولیس کے تشدد سے زیادہ خطرناک وہ اندرونی بحران تھا جس میں یہ تنظیم کمیون کے خاتمے کے بعد پھنستی جا رہی تھی۔ اس کا اصل سبب مارکسیوں اور باکونن پرستوں کے درمیان شدت سے بڑھتے ہوئے اختلافات تھے۔ مارکسیوں کا دعویٰ تھا کہ کمیون نے اُن کے عام سیاسی اصولوں کی توثیق کی ہے جبکہ باکونن پرستوں کا کہنا ہے کہ پیرس اور دوسرے فرانسیسی شہروں کے محنت کشوں کی خود رو بغاوتیں مارکسی تصورات کی تردید اور باکونن کے فلسفہ خود روی کی تائید کرتی ہیں۔

بڑے شہروں میں جو انٹرنیشنل کے گڑھ تھے اندرونی بحران تیز ہو گیا۔ فرانس میں کمیون کے زوال کے بعد پوری مزدور تحریک مغلوب ہو گئی۔ جرمنی میں مارکسیوں اور لاسیل پرستوں کی باہمی لڑائیوں اور حکومت کے تشدد نے مزدور تحریک کو منتشر کر دیا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ

مین نیشنل لیبر یونین تیزی کے ساتھ روبہ تنزل ہونے لگی ۔ انگلستان جو انٹرنیشنل میں مارکس کا سب سے بڑا معاون تھا، اندرونی خلفشار میں مبتلا ہو گیا ۔ اور ٹریڈ یونین کے بیشتر رہنماؤں نے مارکس کی جانب سے کمیون کی حمایت کی بنا پر جنرل کونسل سے مستعفی ہو کر ایک برطانوی فیڈریشن قائم کر لیا ۔

ان مشکل اور تشویشناک حالات میں ستمبر ۱۸۷۱ء کو لندن میں انٹرنیشنل کی خصوصی کانفرنس منعقد ہوئی ۔ کانفرنس نے کمیون کے نتیجے کے پیش نظر مزدوروں کو مختلف ممالک میں سیاسی پارٹیوں کی تنظیم اور سیاسی سرگرمی میں حصہ لینے کی عظیم ضرورت کا پر زور احساس دلایا ۔ یہ تمام باتیں باکونن پرستوں کے لئے سم قاتل کی حیثیت رکھتی تھیں ۔ انہوں نے کانفرنس کے فیصلوں کی پابندی سے انکار کر دیا اور کانگرس کے فوری انعقاد کا مطالبہ کیا ۔

ستمبر ۱۸۷۲ء کو ہیگ میں انٹرنیشنل کی پانچویں کانگرس ہوئی ۔ کانگرس کے سامنے جو فوری مسئلے در پیش تھے اُن میں جنرل کونسل کا کردار اور اختیارات، انٹرنیشنل کے صدر مقام کا تعین، انٹرنیشنل کی سیاسی لائن اور باکونن کے "اتحاد" کی حیثیت زیادہ اہم تھے ۔ خود روی اور مکمل خود مختاری کے پجاری ہونے کی وجہ سے اُن کی تجویز تھی کہ جنرل کونسل کی حیثیت ایک رابطہ دفتر کی ہونی چاہئے ۔ انہوں نے اس تصوّر کی مخالفت کی کہ کونسل کانگریس کے فیصلوں کو منوانے اور انٹرنیشنل کی عمومی سیاسی راہنمائی کا کام کرے ۔ دوسری طرف مارکسی مصر تھے کہ پالیسی اور نظم و ضبط میں اور زیادہ عالمی مرکزیت پیدا کی جائے جسے کانگریس نے اندرونی بحران کے پیش نظر منظور کر لیا ۔ سیاسی عمل کے مسئلے پر مارکسیوں نے یہ قرارداد پیش کی کہ "متقدر طبقات کی اجتماعی قوتوں سے پرولتاریہ بحیثیت طبقہ اُس وقت ٹکر لے سکتا ہے جب وہ اپنی قوتوں کو ایک ایسی خود مختار سیاسی پارٹی میں منظم کرے جس میں غاصب طبقات کی تمام پرانی پارٹیوں کی مخالفت کرنے کی قابلیت ہو، سیاسی پارٹی کی حیثیت سے پرولتاریہ کی ایسی تنظیم سماجی انقلاب میں کامیابی اور اپنے آخری مقصد یعنی طبقات کا خاتمہ کرنے کے لئے ناگزیر ہے"، باکونن کے حامیوں کی شدید مخالفت

کے باوجود یہ قرارداد منظور کر لی گئی۔

اینگلز کی پیش کردہ قرارداد کہ انٹرنیشنل کا مرکزی دفتر نیویارک منتقل کر دیا جائے نے ایک ہیجان پیدا کر دیا۔ اینگلز نے قرارداد پیش کرتے ہوئے صاف طور پر کہا تھا کہ انٹرنیشنل کی نیویارک منتقلی سخت ضرورت کے تحت عمل میں آ رہی ہے۔ تنظیم کے اندرونی اور بیرونی حالات اسقدر خراب ہو چکے ہیں کہ اس کا یورپ میں موثر طور پر کام کرنا ناممکن تھا۔ سب سے بڑا خطرہ یہ لاحق تھا کہ باکونن کے انارکسسٹ اس پر قبضہ کر کے اسے اپنے گروہی مفادات کی خاطر استعمال کرتے جو نوعمر مزدور تحریک کے لئے سراسر تباہی کا باعث بن جاتا۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ جنرل کونسل بلانکی کے حامیوں کے قبضے میں چلی جاتی جن میں اکثریت لندن میں رہائش پذیر کمیون کے پناہ گزینوں کی تھی۔ ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ صدر دفتر امریکہ منتقل کر دیا جائے جہاں ممکن تھا کہ نوعمر امریکی مزدور تحریک میں انٹرنیشنل کو مضبوط بنیاد میسر آ جاتی۔ کانگریس میں باکونن اور اس کے حامیوں کو تنظیم کی رکنیت سے برطرف کر دیا گیا۔ باکونن کے خلاف الزامات کی تحقیق کرنے والی کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق باکونن کا "اتحاد" انٹرنیشنل کے قوانین اور مقاصد کے خلاف ایک وسیع گروہی اجتماع کی شکل میں موجود تھا۔

کانگریس کے اختتام پر ایک جلسہ عام منعقد ہوا۔ مارکس نے اس اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کانگریس نے انارکسٹوں کے غیر سیاسی موقف کو مسترد کر کے اس ضرورت کا احساس دلایا ہے کہ مزدور طبقہ کو سیاسی اور سماجی دونوں میدانوں میں پرانے اور بوسیدہ سماج پر حملہ کرنا چاہیئے۔ اُس نے متنبہ کیا کہ ایسا کرتے ہوئے مختلف ملکوں کے اداروں، رسم ورواج اور روایات کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے ہمیں اس بات سے انکار نہیں کہ ایسے ملک موجود ہیں مثلاً امریکہ اور انگلستان جہاں ممکن ہے کہ محنت کش پر امن ذرائع سے اپنے مقصد تک پہنچ جائیں اگر ایسا ہے تو بھی ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ براعظم کے بیشتر ممالک میں صرف طاقت ہی انقلاب کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں اپنی چار سالہ زندگی میں انٹرنیشنل ایک عالمی تنظیم کی بجائے زیادہ تر ایک مقامی تنظیم کی حیثیت سے کام کرتی رہی۔ اس دوران یورپ کی نراجی (انارکسٹ) طاقتوں نے اپنا کام جاری رکھا اور اس بات کی کوشش کرتی رہیں کہ انٹرنیشنل کو اپنے نظریات اور پسندیدگی کے مطابق ڈھالیں۔ باکونن کے پیروکاروں نے ہیگ کانگریس کے فیصلوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جن کی وجہ سے باکونن اور دوسرے نراجی لیڈروں کو انٹرنیشنل میں انتشار پسند سرگرمیاں جاری رکھنے کی بنا پر خارج کر دیا گیا تھا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ ان فیصلوں اور نیویارک پر منتقلی کی وجہ سے پہلی "انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی ایشن" کا خاتمہ ہو چکا ہے اور اپنی جداگانہ تنظیم کی تشکیل شروع کر دی۔ نتیجتاً آئندہ کئی سال تک دو انٹرنیشنل تنظیمیں سرگرم عمل رہیں۔ دونوں کا نام ایک ہی تھا اور دونوں عالمی مزدوروں کی نمائندگی کی دعوے دار تھیں۔

انارکسٹ انٹرنیشنل کا قیام اور زوال

انارکسٹوں کی پہلی کانگریس اس نتیجے پر پہنچی کہ اس کا بنیادی کام یہی ہے کہ وہ مختلف ممالک یا مقامات پر پرولتاریہ کی امنگوں، ضرورتوں اور تصورات کی اشاعت کریں تاکہ ان کے تصور میں ہم آہنگی اور اتحاد پیدا ہو۔ کانگریس کی اکثریت کو کسی بھی صورت میں یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اقلیت پر اپنے عزائم ٹھونسے۔ کانگریس نے اعلان کیا کہ مزدور طبقہ کے شعبوں اور وفاقوں کی مکمل خود اختیاری و آزادی مزدوروں کی نجات کی ضروری شرط ہے۔ اس نے یہ بھی اعلان کیا کہ ہر قسم کی سیاسی قوت کو تباہ کر دینا پرولتاریہ کا پہلا کام ہے۔ اس کے مطابق تمام ملکوں کے پرولتاریہ کے لیے لازمی ہے کہ وہ سماجی انقلاب کی تکمیل میں تمام مصالحت کوششوں کو رد کر کے بورژوا سیاست جدا انقلابی عمل کی سالمیت کو مستقل بنیادوں پر قائم کریں۔ تاہم ٹریڈ یونین فیڈریشنوں کی اکثریت مارکسی انٹرنیشنل سے وفادار رہی جن میں فرانسیسی، جرمن، آسٹروی، پولستانی، ڈنمارک، ہنگری اور امریکہ کی ٹریڈ یونینیں شامل تھیں۔

باکونن انٹرنیشنل کی حقیقی زندگی کے ایام ۱۸۷۲ء اور ۱۸۷۷ء کے درمیانی سال تھے۔ آئندہ

مدت میں نراجیوں نے بین الاقوامی پیمانے پر جو اقدامات کیے ان کی حیثیت مرض الموت میں مبتلا مریض کے تشنج سے زیادہ نہ تھی۔ ان پانچ سالوں میں نراجیوں نے اپنی نام نہاد انٹرنیشنل کی متعدد بین الاقوامی کانگریسیں منعقد کیں۔ اس تحریک کے پاؤں پھر یورپ میں نہ جم سکے۔ البتہ اس کی صدائے بازگشت کسی حد تک ریاستہائے متحدہ امریکہ میں سنی گئی۔ خصوصاً شکاگو کے علاقے میں اس انٹرنیشنل نے بہت سے غیر ملکی مزدوروں کو اپنی جانب راغب کر لیا ان محنت کشوں کو جنہیں بالعموم امریکی شہریت حاصل نہ تھی، قلیل ترین اُجرت پر کام کرنا پڑتا تھا۔ اور وہ لوگ جو دہشت انگیزی کا تختہ مشق اور مسلسل وقوع پذیر اقتصادی بحران کا شکار تھے، نراجیت کے پروپیگنڈہ سے متاثر تھے۔ سوشلسٹ لیبر پارٹی کے رہنماؤں کی موقع پرستی کی پالیسی جو اقتصادی جدوجہد کے لیے باقاعدہ مزدور تنظیم کی منکر تھی اس کی توسیع میں ممدومعاون ثابت ہوئی۔ اس تحریک کا عروج شکاگو کی ہے مارکیٹ کا وہ مشہور سانحہ تھا جو ۱۸۸۶ء میں آٹھ گھنٹے کام کا دن منوانے کی عظیم تحریک کے دوران رونما ہوا۔ ۶ مئی کو ایک جلسہ عام میں ایک پراسرار بم پھٹا جس کے الزام میں چار مزدور رہنماؤں پارسنز، سپنیز، فیشر اور جارج اینگل کو وحشیانہ طریقہ پر سولی چڑھا دیا۔ اس کے ساتھ ہی بہت سے لوگ لمبی سزائے قید بھگتنے کے لیے جیلوں میں ٹھونس دیئے گئے۔

انارکسٹ انٹرنیشنل نے اپنی چند سالہ زوال پذیر زندگی کے دوران عوامی جدوجہد کی بہت کم رہنمائی کی البتہ اسپین میں یہ نسبتاً زیادہ طاقتور تھی لیکن یہاں بھی اُنہوں نے اپنے سیاسی تعصبات کی بناء پر اُس عوامی تحریک میں کوئی حصہ نہیں لیا جو ہسپانوی جمہوریہ کے قیام پر منتج ہوئی۔ باکونن آخر دم تک مارکس ازم کا کٹر دشمن رہا۔ مزدوروں کو الوداعی پیغام دیتے ہوئے اُس نے کہا "مارکسی سوشلزم جو بسمارک کی سیاسی چالبازیوں سے کم نہیں رجعت پسندی کا مرکز ہے اس کے خلاف مزدوروں کو انتھک جدوجہد کرنی ہوگی"۔ باکونن کی وفات کے بعد ایک روسی انارکسٹ کروپوٹکن نے اُس کے تصورات کو آگے بڑھایا۔

وہ پرولتاریہ کی سیاسی پارٹی، سیاسی عمل اور پرولتاریہ کی آمریت کا دشمن تھا۔ اُس سے

نزدیک سب سے بڑا دشمن ریاست تھی نہ کہ سرمایہ دار طبقہ۔ اس کے مطابق سرمایہ دار طبقہ نے اپنے انقلابی دور میں جاگیرداروں سے نہیں بلکہ ریاست کے خلاف جنگ کی تھی۔ انارکسٹ انٹرنیشنل نے اپنی تمام تر امیدیں بغاوت سے وابستہ کر رکھی تھیں اور مزدوروں کی آئے دن کی جدوجہد کو نظرانداز کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نراجی تحریک طبقاتی جدوجہد کے پہلو میں سمٹ کر ایک مختصر سا دھڑا بن گئی تھی۔ سرمایہ داری کی ارتقا کی عام رفتار نراجی تحریک پر کاری ضرب لگا رہی تھی جس کا مکمل انحصار فوری بغاوت کے امکان پر تھا۔

انارکسٹ انٹرنیشنل کے زوال کا ٹھوس سبب اس کا پرولتاری انقلاب کے فوری وقوع پذیر ہونے سے ناقابلِ اصلاح اعتقاد تھا۔ ان دونوں مارکسی بھی جیسا کہ مارکس اور اینگلز نے فراخدلی کے ساتھ اعتراف کیا اس معاملہ میں بڑی حد تک غلط فہمی میں مبتلا تھے اُس انقلابی دور میں اس قسم کی غلطی کا امکان فطری تھا جب ۱۸۵۹ء اور ۱۸۷۱ء کے درمیانی سالوں میں آسٹریا اور فرانس، پروشیا اور آسٹریا، فرانس اور جرمنی کی جنگیں ہوئیں، اسپین میں ایک طویل انقلاب رونما ہوا۔ روس میں زرعی غلامی کا خاتمہ ہوا اور پورے یورپ میں وسیع مزدور تحریک تیزی کے ساتھ ترقی کرنے لگی۔ مارکسیوں اور انارکسٹوں میں فرق یہ تھا کہ مارکسیوں نے اپنے سائنسی نظریات کی بدولت اس معاملے میں فوراً اپنی غلطی کا ادراک کر لیا لیکن نراجی بورژوا تصورات کے بوجھ تلے دبے رہنے کی وجہ سے اس قابل نہ تھے کہ اپنی غلطی کی اصلاح کر سکتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نراجی تحریک کٹ چھٹ کر ایک چھوٹے سے گروہ تک محدود رہ گئی جبکہ مارکس ازم ترقی پذیر عالمی مزدور طبقہ کا موثر ہتھیار بن گیا۔

سیاسی سرگرمیوں کے تمام راستے مسدود ہو جانے کی وجہ سے یہ تحریک باہم متضاد نظریاتی رجحانات اور گروہوں کا انحطاط پذیر گڑھ بن گئی۔ ان داخلی گروہوں میں ایک نام نہاد "فلسفیانہ" یا "انفرادیت پسند" نراجی گروہ تھا۔ یہ لوگ چھوٹے سرمایہ دار نظریات رکھنے والے "قہوہ خانہ کے انقلابی" تھے وہ انقلاب کے بارے میں نہایت پر شکوہ الفاظ استعمال کرنے کے شوقین

تھے لیکن عملاً انقلاب کی راہ میں بڑی رکاوٹ تھے۔ اس قسم کا رجحان اب بھی بہت سے ممالک میں پایا جاتا ہے۔ انارکسٹوں میں دہشت پسندی کے طاقتور رجحانات بھی پائے جاتے تھے۔ دہشت پسندوہ انتہائی مایوس عنصر تھا جس نے عوامی بغاوت سے کوئی نتیجہ برآمد ہوتے نہ دیکھا تو وہ ریاستوں کے سربراہوں کو قتل کرنے کے درپے ہو گیا تاکہ بے حس عوام کو انفرادی جرات مندانہ کارناموں کے مظاہرے سے حرکت کرنے کی ترغیب دلائی جائے۔

۔انیسویں صدی کے آخری عشروں میں اس رجحان کے لوگوں نے یورپ کے مختلف ممالک میں بہت سے سربراہان کو قتل کیا۔ نراجی دہشت پسندی کا یہ رجحان اپنی احمقانہ حرکتوں کی وجہ سے ختم ہو گیا۔ ایک تیسرا نراجی رجحان بھی پیدا ہوا جو نراجیت کے عام فلسفے میں سب سے زیادہ اہم ہے یعنی انارکزم کی طرف مائل مزدوروں نے جو انارکسٹ دانشوروں کی بہ نسبت زیادہ باعمل تھے ٹریڈ یونین تحریک میں انارکزم کو اپنایا۔ اس طرح انارکو سنڈیکلسٹ رجحان نے جنم لیا جس کا تذکرہ ہم آنے والے صفحات میں کریں گے۔

انٹرنیشنل ریاستہائے متحدہ امریکہ میں

ستمبر ۱۸۷۲ء میں ہیگ کانگریس کے فیصلے کے مطابق انٹرنیشنل کا صدر دفتر نیویارک منتقل کر دیا گیا۔ ۱۸۷۲ء کے آخر میں امریکہ خانہ جنگی کے بعد پیدا ہونے والی صنعتی کساد بازاری کے آخری مرحلے میں تھا۔ فتح مند سرمایہ دار ملک کے قدرتی وسائل کی چوری میں مصروف تھے۔ فیکٹریوں میں توسیع کی جا رہی تھی اور اجارہ داریاں قائم ہو رہی تھیں۔ سرمایہ داروں کے جبر و تشدد کی وجہ سے مزدور جنگجوئی کے موڈ میں تھے۔ ۱۸۷۳ء کے دوررس اقتصادی بحران نے اسے اور بھی تقویت دی۔ ۱۸۸۱ء میں اے ایف ایل (امریکی فیڈریشن آف لیبر) کے قائم ہونے میں ابھی نو سال کا عرصہ تھا لیکن مقامی اور قومی ٹریڈ یونینوں کی تنظیم ہو رہی تھی ورملک میں ۱۸۷۷ء کی عظیم ریلوے ہڑتال کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ امریکہ میں پہلی انٹرنیشنل

کے تقریباً تیس شعبے اور پانچ ہزار ارکان تھے۔ انٹرنیشنل کی سرگرمیوں میں امریکہ خاصی اہمیت رکھتا تھا۔ اس کی ایک مثال وہ لڑائی ہے جو مارکس کی قیادت میں یورپی مزدوروں نے اپنے ملکوں کو امریکی خانہ جنگی میں کانفیڈریسی کی حمایت سے روکنے کے لیے لڑی۔ انٹرنیشنل کی صحیح لائنوں پر چلتے ہوئے امریکی مارکسیوں نے مزدوروں کی روزمرہ کی جدوجہد، یونینوں کی تشکیل اور ہڑتالوں کے چلانے میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔ اُنہوں نے اکتوبر ۱۸۷۱ء کو آٹھ گھنٹے اوقاتِ کار کے لیے نیویارک میں عظیم الشان مظاہرے کی رہنمائی کی۔

یورپ کی طرح ریاست ہائے متحدہ میں بھی انٹرنیشنل کو وسیع ٹریڈ یونین تحریک کے ارتقاء میں اندرونی رجحانات کو رکاوٹ بننے سے روکنے کے لیے مسلسل جنگ کرنی پڑی۔ ان میں سب سے زیادہ سخت، دیرپا اور خطرناک غیر ملکی خصوصاً جرمن مزدوروں کا وہ رجحان تھا جو انہیں عوام الناس اور مقامی امریکی مزدوروں کی زندگی اور جدوجہد سے علیحدہ رہنے کی ترغیب دیتا تھا۔ یہ خطرناک رجحان جس کی اصلاح کرنے میں جنرل کونسل کو بھی کچھ زیادہ کامیابی نہ ہوئی، دو نسلوں تک روبہ زوال حالت میں قائم رہا۔ اس گروہ بندی کے پیدا کردہ مضر اثرات میں سب سے زیادہ تباہ کن نیگرو مسئلے سے اجتناب تھا۔ بشیتر شمالی شہروں میں آباد مارکسی اس لحاظ سے مشہور تھے کہ وہ نیگرو لوگوں کے دوست اور اُن کے روزگار کے حق کے لیے لڑنے والے ہیں لیکن انٹرنیشنل نے نیگرو لوگوں کی اُس جدوجہد کی جانب کوئی دھیان نہ دیا جو کہ وہ اپنے سفید فام ساتھیوں کے دوش بدوش جنوب کے انقلاب دشمن جنگ بازوں کے خلاف کر رہے تھے۔

انٹرنیشنل کے مارکسیوں نے اُس وقت بھی گروہ بندی کا رویہ اختیار کیا جب عورتوں کو حقِ رائے دہی دلانے کی پرزور تحریک چل رہی تھی۔ امریکی مارکسی صنعت، قانون اور دوسرے معاملات میں عورتوں کے حقوق کے لیے تو لڑتے رہے مگر ان کے ووٹ کے حق پر کبھی زور نہ دیا۔ اس نقطہ نظر کا اظہار اس بیان سے ہوتا ہے "عورتوں کا نام نہاد مسئلہ مزدوروں کے مسئلے کے ساتھ ہی حل

ہوسکتا ہے،، جس کی وجہ سے مارکسی عورتوں کو اس دور کی طاقتور تحریک سے کٹ گئے۔ اسی طرح کی تنگ نظری نے انٹرنیشنل کو اُس کسان تحریک سے بھی علیحدہ رکھا جو اس وقت مغربی حصہ کے وسطی علاقوں میں زور پکڑ رہی تھی۔

۱۸۷۴ء میں انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی ایشن (پہلی انٹرنیشنل) معرکہ آرائیوں سے پارہ پارہ ہو کر عمیق بحران میں مبتلا ہو گئی تھی۔ بالآخر ۱۵ جولائی ۱۸۷۶ء کو فلاڈیلفیا کی کانگریس میں پہلی انٹرنیشنل کے خاتمے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ حالات اس قدر خراب نہ تھے جتنا کہ انٹرنیشنل کے انتشار پذیر رجحانات سے ظاہر ہو رہا تھا۔ جو بات وقوع پذیر ہو رہی وہ یہ تھی کہ انٹرنیشنل کے یورپی اور امریکی شعبے ایک نئی مارکسی پارٹی کو جنم دے رہے ہیں۔ تحریک رو بہ زوال نہ تھی بلکہ ایک نئے بلند مرحلے میں داخل ہونے کے لئے مشکلات سے گزر رہی تھی۔ انٹرنیشنل کے خاتمے کے ایک ہفتہ کے اندر اندر عموماً تمام دنیا کی سوشلسٹ صفوں میں تاریخی ارتقاء ظہور پذیر ہوا یعنی پہلی انٹرنیشنل کا خاتمہ اور قومی بنیادوں پر مارکسی سیاسی پارٹیوں کا قیام۔

پہلی انٹرنیشنل کے میدان سیاست سے علیحدہ ہونے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ سرمایہ داری ترقی کے ایک نئے مرحلے میں داخل ہو رہی تھی جس کی وجہ سے مزدور طبقہ کے سامنے ایک ایسا کام آپڑا تھا جسے پہلی انٹرنیشنل اس کے مخصوص حالات کے تحت پورا کرنے کے قابل نہ تھی۔ یہ بورژوا کے پھلنے پھولنے اور ان کی مکمل فتح کا دور تھا۔ یہ دور بورژوا جمہوری تحریکوں کا عہد تھا جو جاگیرداروں کی مطلق العنانیت کو موت کی نیند سلا رہی تھیں۔ نیا دور جس کا آغاز ہو رہا تھا سرمایہ داری کے پھیلاؤ اور اس کے سامراجی شکل اختیار کرنے کا دور تھا یہ پیرس کمیون کی بہادرانہ بغاوت سے شروع ہو کر ۱۹۱۷ء کے عظیم اکتوبر انقلاب کی فتح پر ختم ہوا۔ نیز یہ وہ عہد تھا جس میں پرولتاریہ نے آہستہ آہستہ اپنی قوتوں کو مجتمع کیا۔ اس عہد کی ابتداء میں صنعتی ممالک میں مزدور طبقہ کا خاص کام انقلاب کے لئے کوشش کرنے کی بجائے

عوامی ٹریڈ یونینوں کی تنظیم، قومی مزدوروں کی سوشلسٹ پارٹیوں کا قیام اور وسیع پیمانے پر مارکسی تعلیمات کو فروغ دینا تھا۔ انٹرنیشنل کا تجربہ بتارہا تھا کہ یہ جن اجزاء پر مشتمل تھی وہ ابھی اتنے ترقی یافتہ نہ تھے کہ ایک طاقتور مارکسی عالمی قیادت کی تشکیل کی جاسکتی، انٹرنیشنل کی تعمیر سوشلسٹ پارٹیوں کی بجائے براہ راست عوامی مزدور تحریکوں پر ہوئی تھی جن میں سے بیشتر تحریکیں مارکسی اثرات سے بہت دور تھیں۔

کارل مارکس کی زیر قیادت پہلی انٹرنیشنل نے موجودہ مزدور تحریک کی نظریاتی اور تنظیمی دونوں بنیادیں استوار کیں۔ سائنسی سوشلزم کی عام مقبولیت اور عملی اطلاق اس کی بنیادی کامیابی تھی۔ اس نے سرمایہ دارریاست اور ریاست کی مجموعی حیثیت کے بارے میں مزدور طبقہ کی ٹھوس پالیسی مرتب کی۔ ٹریڈ یونین تحریک، امداد باہمی کی تنظیم، جمہوری حق رائے دہی کی اہمیت واضح کی۔ اس نے مزدوروں کی سیاسی پارٹی کے بنیادی کام کی نشوونما کی رحسان، جنگ اور قومی مسائل سے متعلق پرولتاریہ کے نقطہ نظر کا تعین کیا، مسلح تکنیک کی قیمت بتائی، فوری مطالبات اور پرولتاری انقلاب میں رشتہ قائم کیا۔ پرولتاریہ کی آمریت کے امکانات واضح کیے اور مختلف ملکوں میں تربیت یافتہ مارکسی رہنماؤں کے دستے پیدا کیے۔ ان تمام پالیسیوں اور پروگراموں کو مرتب کرنے کے سلسلے میں پہلی انٹرنیشنل نے تاریخی اہمیت کی غیر فانی مزدور دستاویزات شائع کیں جو بیشتر مارکس کی تحریر کردہ تھیں۔ ان میں افتتاحی خطبہ، ایسوسی ایشن کے قوانین فرانس میں خانہ جنگی اور سرمایہ کی پہلی جلد شامل ہیں۔

دوسری انٹرنیشنل کے قیام کے وقت (۱۸۸۹ء) میں لائبنخت نے کہا "پہلی انٹرنیشنل مری نہیں۔ مختلف ملکوں کی طاقتور مزدور تحریکوں میں اس کا تسلسل قائم رہا اور وہ اُن میں زندہ رہی"

انٹرنیشنلوں کا درمیانی زمانہ

۱۸۷۶ء میں پہلی انٹرنیشنل کے اختتام اور ۱۸۸۶ء میں دوسری انٹرنیشنل کے قیام

کا درمیانی عرصہ عالمی سرمایہ داری کی تیز رفتار ترقی اور پھیلاؤ کا زمانہ تھا۔ اس کے باوجود کہ کم و بیش ہر دسویں سال بحران رونما ہونے کا چکر قائم تھا جس کی وجہ سے یہ نظام عارضی طور پر معطل ہو کر رہ جاتا تھا اور لاکھوں مزدور بیروزگاری اور افلاس کا شکار ہو جاتے تھے مغربی یورپ اور شمالی امریکہ میں صنعت کاری چھلانگیں لگاتی ہوئی آگے بڑھتی گئی اور ایشیا بھی اس کی زد میں آ گیا۔ یہ بیرونی ملکوں کے ساتھ نسبتاً مستحکم تعلقات کا ایک ایسا طویل اور مکمل ترین دور تھا جو عالمی سرمایہ داری کو کبھی نصیب نہ ہوا تھا۔ سرمایہ دار طاقتیں نسبتاً داخلی استحکام سے بھی مستفید ہوتی رہیں کیونکہ اس عرصہ میں تقریباً تمام باغیانہ تحریکوں کا مکمل فقدان رہا۔ اس زمانے میں سرکردہ سرمایہ دار ملکوں میں اُجرتی مزدوروں میں کثرت سے اضافہ ہوا خصوصاً انگلستان کے سرمایہ داروں نے مزدور اشرافیہ کو کچھ مراعات دے کر اُن میں بگاڑ پیدا کرنے کی پالیسی اختیار کی اور اس طرح مزدور اتحاد کو توڑنا چاہا۔

اگرچہ یہ مزدور طبقہ کی بغاوتوں کا دور نہ تھا لیکن ایسی ہڑتالیں وقوع پذیر ہوئیں جن کی وسعت، نظم و ضبط، اعلیٰ تنظیم اور طوالت کی مثال نہیں ملتی۔ یہ بات فرانس، جرمنی، بلجیم خصوصاً ۱۸۷۷ء کی ریلوے کی تشدد آمیز عظیم ہڑتال اور ۱۸۸۶ء میں آٹھ گھنٹے اوقات کار کے لئے قومی تاریخی ہڑتال پر بھی صادق آتی ہے۔ ٹریڈ یونین تحریک میں بھی زبردست پھیلاؤ ہوا۔ ۱۸۸۹ء میں صرف انگلستان کی ٹریڈ یونینوں کے ارکان کی تعداد تقریباً پندرہ لاکھ تک پہنچ گئی۔ انٹرنیشنل کے مابین ہنگامی دور میں مختلف ممالک میں سوشلسٹ پارٹیاں وجود میں آئیں۔ اس نئی بین الاقوامی تحریک کے توسل سے جتنے ممالک سوشلزم سے روشناس ہوئے اتنے پہلی انٹرنیشنل کے دور میں بھی نہیں ہوئے تھے۔

دونوں انٹرنیشنلوں کے مابین دور کی ابتداء میں ایک نہایت اہم نظریاتی قدر و قیمت کا واقعہ ہوا۔ مئی ۱۸۷۵ء کو جرمنی میں گوتھا کے مقام پر ایک کانگریس میں مارکسی اور لاسال پرست پارٹیاں متحد ہو گئیں۔ مارکس نے گوتھا معاہدہ پر تیز و تند تنقید کی۔ جرمن سوشل ڈیموکریٹوں میں

یہ عام رجحان تھا کہ وہ پارٹی کے نام پر اصولی سوالات کو پس و پشت ڈال دیتے تھے۔ اپنے کتابچہ میں جو "گوتھا پروگرام کی تنقید" کے نام سے مشہور ہوا مارکس نے اس کی ناقص اقتصادیات، ریاست کے بارے میں غلط رجحان، لاسل کے "اُجرتوں کے آہنی قانون" کے آگے سپر اندازی، امداد باہمی کے لئے ریاستی امداد کا لاحاصل نسخہ، آٹھ گھنٹے کے دن کے لیے قطعی مطالبے سے گریز اور بین الاقوامیت کے لئے گومگو پالیسی وغیرہ کی سخت مذمت کی۔ عالمی قیادت کی دوسری روشن مثال انیگلز کا وہ کلاسیکی جواب ہے جو اُس نے چند ماہ بعد برلن یونیورسٹی کے پروفیسر ڈیورنگ کو دیا۔ پروفیسر مذکور نے حال ہی میں سوشل ڈیموکریٹک پارٹی میں شمولیت اختیار کی تھی اور پارٹی پروگرام کو پورژوا نقطۂ نظر سے دوبارہ لکھنا چاہتا تھا۔ انیگلز کا جواب فلسفہ اور سائنس میں مارکسی دعوٰی کی بنیادی نمائندگی کرتا تھا۔

آٹھویں دہائی کے آغاز میں انٹرنیشنل کے دوبارہ قیام کی تجاویز کا اعادہ ہوتا رہا۔ ۱۸۸۳ء اور ۱۸۸۶ء کے درمیان بین الاقوامی مزدور کانفرنسیں ہوئیں۔ ان اجتماعات کی رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت تمام مغربی یورپ میں سوشلسٹ پارٹیاں اور ٹریڈ یونینیں تیزی سے نشوونما پا رہی تھیں۔ مزدوروں کے عالمی اتحادِ عمل کی ضرورت زیادہ سے زیادہ اہم ہوتی جارہی تھی۔ آخر کار وہ وقت آگیا کہ نئی بنیادوں پر انٹرنیشنل کی تعمیر نو کی جائے ۱۸۸۹ء میں پیرس کی تاریخی کانگریس میں یہ تحریک بالآخر بارآور ہوئی۔

اسی اثناء میں ۱۶ مارچ ۱۸۸۳ء کو عالمی پرولتاریہ اپنے عظیم ترین رہنما کارل مارکس سے محروم ہوگیا۔ اس طرح دنیا کا عظیم ترین مفکر جریدۂ عالم میں اپنا غیر فانی نام ثبت کر کے عالمی نظام سرمایہ داری کو اس کی قسمت کا لکھا سنا کر خاموش ہوگیا۔

دوسری انٹرنیشنل کا قیام

دوسری انٹرنیشنل کو قائم کرنے والی کانگریس کا افتتاح ۱۸۸۹ء کو ہوا۔ اس روز عظیم

انقلاب فرانس میں لبتائل کی فتح کی سوویں سالگرہ تھی۔ یہ کانگریس جرمن اور فرانسیسی مارکسیوں کے زیر انتظام منعقد ہوئی۔ یہ امکان پرست POSSIBILIST یا موقع پرست (یعنی بورژوا آئین پرستی کے دائرے میں رہ کر سوشلزم حاصل کرنے کے حامی) لوگوں کا اجتماع تھا۔ کانگریس کے دوران ان دونوں کانگرسوں کو متحد کرنے کی کافی کوشش کی گئی لیکن اینگلز نے اس کی مخالفت کی۔ البتہ دو سال بعد دونوں گروہوں نے اتحاد کر لیا۔ اگرچہ یہ پہلی انٹرنیشنل کی تعمیر نو تھی لیکن اس کی بنیاد کہیں زیادہ وسیع اور مضبوط تھی۔

کانگریس کی رپورٹوں سے ایک نوعمر، طاقت ور، وسعت پذیر امید افزا مزدور تحریک کی تصویر سامنے آئی جو قرار دادیں منظور کی گئیں ان میں سے ایک مستقل فوج کے خاتمہ اور عوام کو مسلح کرنے سے متعلق تھی۔ دوسری آٹھ گھنٹے کے دن کی واضح تصدیق تھی۔ کانگریس کا سب سے اہم فیصلہ یکم مئی کو "بین الاقوامی مزدور مظاہرہ کا دن" مقرر کرنا تھا۔ قرار داد میں لکھا تھا کانگریس ایک عظیم بین الاقوامی دن کی تنظیم کا فیصلہ کرتی ہے تاکہ ایک مقررہ دن تمام ممالک اور تمام شہروں میں محنت کش عوام حکومت سے آٹھ گھنٹہ کام کا دن قانونی طور پر تسلیم کرانے اور پیرس کانگریس کے دوسرے فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے کا مطالبہ کریں۔ اس طرح عالمی مزدوروں کا یہ مجاہدانہ یوم تعطیل عالم وجود میں آیا۔

پیرس کانگریس نے یہ ثابت کر دیا کہ مارکسزم عالمی مزدور تحریک خصوصاً اس کے سیاسی پہلو پر حاوی ہو چکا تھا۔ وہ مختلف گروہ جنہوں نے پہلی انٹرنیشنل کی زندگی کو تباہ کر رکھا تھا اپنا اثر کھو بیٹھے تھے۔ مارکسیوں کی سب سے بڑی تعداد جرمنی میں تھی۔ دوسری انٹرنیشنل میں اس ملک کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی قیادت کا بول بالا تھا جو اس وقت تک قائم رہا جب تک کہ ۱۹۱۹ء میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کا قیام عمل میں نہ آ گیا۔ لیکن ان میں سے بہت سے مارکسی خطرناک نظریاتی غلطیوں سے پاک نہ تھے (مثلاً کارل کاؤتسکی)۔ چونکہ پہلی انٹرنیشنل زیادہ انقلابی دور سے گزری تھی اس لئے اسے اپنی کانگرسوں میں مسلسل انقلابی سوال سے واسطہ

رہا۔ لیکن دوسری انٹرنیشنل کا دور نسبتاً سرمایہ داری ارتقاء کا زیادہ پرسکون دور تھا اس لیے اسے پرولتاری انقلاب کی فوری آمد" کا احساس نہ تھا۔ پہلی انٹرنیشنل کے اختیار کردہ انقلابی امکانات کو تسلیم کرتے ہوئے کانگریس نے بنیادی طور پر طبقاتی جنگ کے موجودہ اہم ہنگامی مسائل یعنی سرمایہ داری کے خلاف جہاد، آٹھ گھنٹے کا دن، مزدوروں کے حق رائے دہی کی توسیع فیکٹری قوانین کا نفاذ اور ٹریڈ یونینوں اور مزدور سوشلسٹ پارٹیوں کے قیام پر زیادہ توجہ منعطف کی۔

پہلی انٹرنیشنل کی تباہی کی وجہ بے صبر، انتہا پسند بائیں بازو کے لوگ تھے مگر دوسری انٹرنیشنل پر آفت جیسا کہ ظاہر ہوا مخالف سیاسی سمت سے آئی یعنی دائیں بازو کے موقعہ پرست جنہوں نے مزدوروں کی جنگجویانہ پہل قدمی کو معطل کر کے مزدور تحریک کو سرمایہ داری نظام کا چھوٹا سرمایہ دارانہ دم چھلا بنا کر رکھ دیا۔ اس کی تباہی کا باعث بنے۔ دائیں بازو کے یہ رجحانات کانگریس کے آغاز ہی سے کم از کم دو نمایاں پہلوؤں میں سر اٹھانے لگے تھے۔ ان میں سے ایک تو "امکان پرست" یعنی فوری قابلِ عمل اصلاحات پر زور دینے والی جماعت کا رجحان تھا۔ یہ امکان پرست اسقدر طاقتور تھے کہ انہوں نے مارکسی قیادت کو طعنہ زنی کرتے ہوئے اپنی ایک علیحدہ کانگریس منعقد کی۔ دائیں بازو کے رجحان کا دوسرا اظہار خود مارکسیوں کی کانگریس میں ہوا۔ جو کسی طرح بھی کم خطرناک نہ تھا۔ کانگریسوں کے درمیان عرصہ میں کام چلانے کے لئے ایک بین الاقوامی مرکز کا قیام نہ کرنا ڈیلی گیٹوں کی بڑی غلطی تھی۔ سالہا سال تک نئی انٹرنیشنل کی نہ تو کوئی رہنما کمیٹی تھی، نہ عالمی مرکزی دفتر تھا، نہ کوئی بین الاقوامی اخبار تھا، نہ کوئی باقاعدہ دستور تھا نہ کوئی مخصوص سیاسی لائحہ عمل تھا حتیٰ کہ اس کا کوئی رسمی نام بھی نہیں تھا۔

یہ انتہائی خطرناک اقدام تھا جیسا کہ بالآخر پہلی جنگ عظیم سے ظاہر ہوا کیونکہ بڑی طاقتوں کے درمیان فوجی تصادم کا امکان پہلے ہی پیدا ہو چکا تھا اور آنے والے دور میں مزدور تحریک کو جو مختلف ملکوں میں بورژوا طبقہ کے روز افزوں قومی دباؤ کے سامنے جھکتی جا رہی تھی انتہائی خطرہ لاحق ہو چکا تھا۔ دوسری انٹرنیشنل میں دائیں بازو کے موقعہ پرست رجحان کے دو خاص منبع تھے

ان میں پہلا اور زیادہ خطرناک رجحان ٹریڈ یونینوں میں ماہر مزدوروں اور مزدور دفتر شاہی میں رونما ہو رہا تھا جنہیں اُجرت میں رعایت دے کر مالکوں نے مزدور طبقہ کی عظیم تعداد کے خلاف استعمال کیا۔ اُن ہڑتالوں کو ناکام بنانے کی کوشش کی۔ ان کی یونینوں کو کمزور اور منقسم رکھنے کی کوشش کی۔ دائیں بازو کی موقع پرستی کا دوسرا منبع وہ کثیر التعداد چھوٹے سرمایہ دار دانشور تھے جو مزدوروں کی سیاسی تنظیم میں اپنی قیادت کے ذریعے شہر، ریاست اور قومی حکومت کے مختلف عہدوں پر مزدور نمائندوں کی حیثیت سے شامل ہو کر اپنی جگہ بنانے کے خواہشمند تھے یہ دونوں رجحانات مزدور طبقہ کو بحیثیت مجموعی سرمایہ دار طبقہ کے ماتحت رکھنا چاہتے تھے۔ انگریز مزدور تحریک اس موقعہ پرستی کا سب سے بڑا شکار تھی۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ برطانیہ سامراجی قوت بن چکا تھا اور وہاں مالکوں نے نوآبادیاتی ملکوں کے عوام سے حاصل کردہ منافع کے ذریعے مزدور اشرافیہ اور مزدور رہنماؤں کو خراب کرنے کی پالیسی پر وسیع پیمانے پر عمل شروع کر دیا۔

اس دور میں انگریز مزدور طبقہ کا طبقاتی شعور انتہائی نچلی سطح پر تھا۔ اوتھس ٹین کہتا ہے ،، انفرادی مزدوروں نے یا تو آزاد خیال یا پھر قدامت پسندوں کو ووٹ دیئے۔ لفظ "انقلاب" کو اگر براہ راست گالی نہیں دی گئی تو کم از کم اسے سن کر نفرت سے کاندھے جھٹک دینا ان کا عام شیوہ بن گیا تھا،، قدامت پرست مزدور دفتر شاہی پسندوں اور مالکوں کے ایجنٹوں کی سیاسی لائن یہ تھی کہ مزدور طبقہ کو لیبر پارٹی کی سرپرستی میں رکھا جائے۔ البتہ ۱۸۸۰ء میں سوشل ڈیموکریٹک فیڈریشن کے قیام کے بعد بورژوا طبقہ نے اپنی سیاسی پالیسی میں تھوڑی تبدیلی کی۔ اس کا اظہار ۱۸۸۴ء میں سڈنی ویب، برنارڈ شا اور دوسرے چھوٹے سرمایہ دار انتہا پسند دانشوروں کی سرکردگی میں فیبین سوسائٹی کے قیام سے ہوا۔ اس تنظیم کا مقصد مارکسزم کی قطع برید کرنا اور اسے مزدور طبقہ کے لئے بے ضرر اور الگ تھلگ سیاسی عمل بنانا تھا۔ یہ تمام باتیں سرمایہ داروں کے لئے نہایت سودمند تھیں۔ اس کے ایک دانشور کے مطابق برطانوی سوشلزم کا بانی کارل مارکس نہیں بلکہ رابرٹ

اوون تھا جس نے طبقاتی جنگ کی تبلیغ نہیں کی بلکہ انسانی برادری کا نظریہ پیش کیا۔ فیبئین ازم اپنے گول مول سوشلسٹ مقاصد کے باوصف نٹ پونجیے سرمایہ داروں کی اصلاحی تحریک تھی جو سرمایہ داری نظام کے لئے مضر رساں نہیں تھی برٹش لیبر پارٹی کے نظریات پر آج بھی اس کی گہری چھاپ موجود ہے۔

البتہ جرمنی میں موقعہ پرستی کو ابھی تک قدم جمانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہاں مارکسی۔ ٹریڈ یونین اور سیاست دونوں میدانوں میں مزدور تحریک پر پوری پوری گرفت رکھتے تھے اور پارٹی اپنی تشکیل میں سب سے زیادہ پرولتاری تھی۔ اس کی مخصوص وجہ یہ تھی کہ جرمنی جہاں مطلق العنان اور نیم جاگیردارانہ حکومت تھی ابھی ایک مضبوط سرمایہ دار قوت کے طور پر اُبھر رہا تھا اور وہاں کا حکمران طبقہ ابھی اتنا ترقی یافتہ نہ تھا کہ مزدور اشرافیہ، ٹریڈ یونین اور سیاسی دفتر شاہی کو بدعنوان بنانے کی مخصوص پالیسی اپنا سکتا۔ سوشلسٹ دشمن قوانین کے تحت جرمن سوشل ڈیموکریٹک پارٹی ابھی تک غیر قانونی تھی اور یہ ڈر نہ تھا کہ مختلف قسم کے ٹٹ پونجیے یا سرمایہ دار اور موقعہ پرست اپنی جگہ بنا سکیں گے۔ علاوہ ازیں ٹریڈ یونین انتہائی دشوار قانونی رکاوٹوں کے تحت کام کر رہی تھیں۔ اگرچہ بعد کے دور میں جرمن سامراج کی ترقی کے ساتھ ساتھ جرمنی کی مزدور تحریک میں سخت بدعنوانی پیدا ہو گئی اور وہ دوسری انٹرنیشنل میں دائیں بازو کی موقعہ پرستی کا زہریلا منبع بن گئی۔

دوسری انٹرنیشنل میں نظریاتی کشمکش

دوسری انٹرنیشنل کی دوسری، تیسری اور چوتھی کانگریس علی الترتیب برسلز ۱۸۹۱ء زیوریچ ۱۸۹۳ء اور لندن ۱۸۹۶ء میں منعقد ہوئیں۔ یہ دور عموماً یورپ اور امریکہ میں تیز رفتار سرمایہ دارانہ ارتقاء کا دور تھا۔ انگلستان بڑے پیمانے پر سرمایہ برآمد کر رہا تھا اور بڑی طاقتیں افریقہ کو تسلیم کرنے میں مصروف تھیں۔ یہ وہ دن تھے جب کہ بڑی بڑی ریاستوں میں بین الاقوامی کشیدگی تیز ہو رہی تھی اور مختلف ملکوں میں طبقاتی جدوجہد بڑھتی جا رہی تھی۔ مزدور تحریک کی بڑی

کامیابی جرمنی میں سوشلسٹ دشمن قوانین کا خاتمہ تھا۔ اس عہد کی ہڑتالوں میں سب سے زیادہ نمایاں ۱۸۹۳ء میں دو لاکھ انگریز کان کنوں کی ہڑتال تھی۔

دائیں بازو کے رجحانات جس سے بالآخر دو دہائیوں کے بعد انٹرنیشنل اور بالعموم تمام دنیا کے لئے تباہ کن نتائج برآمد ہوئے تینوں کانگریسوں کی کارروائیوں میں زیادہ سے زیادہ سرایت کرتا گیا۔ بین الاقوامی یوم مئی کے سوال پر دائیں بازو کا اثر بالخصوص شاہدہ میں آیا۔ اُن کی لائن یہ تھی کہ یکم مئی کی بجائے مئی میں آنے والے پہلے اتوار کو یہ دن مقرر کیا جائے ایسا کرنا گویا اس تقریب کی مجاہدانہ خصوصیت کو یکسر ختم کر دینا تھا۔ آخر کار زیورچ کانگریس میں جرمنوں نے یوم مئی منانے کے طریقے کو پارٹیوں کی اپنی مرضی پر چھوڑ دیا جس کا مطلب تھا کہ آزادی کے ساتھ موقعہ پرستی کی لائن پر عمل کیا جا سکے۔ پہلی انٹرنیشنل کے مقابلے میں دوسری انٹرنیشنل کو ابتداء ہی سے سنگین جنگی خطرے کا سامنا رہا۔ یعنی عام یورپی سامراجی جنگ کا امکان۔ بڑی یورپی طاقتیں جو زیادہ سے زیادہ سامراجی بننے کی ہوس میں بڑھ چڑھ کر بیرحم ہوتی جا رہی تھیں ایک ایسے گٹھ جوڑ میں لگی ہوئی تھیں جو آخر کار ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کی شکل میں رونما ہوا جنگ کے خطرے جیسے نازک مسئلے پر دوسرا انٹرنیشنل میں ترقی پذیر دائیں بازو کی موقعہ پرستی تیزی کے ساتھ سر اُٹھاتی رہی۔

یورپی جنگ کے بڑھتے ہوئے خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے ان تینوں کانگریسوں میں جو قراردادیں منظور کی گئیں اُن میں کہا گیا تھا کہ جنگی خطرہ کے خلاف مزدور پرزور احتجاج کریں، تخفیف اسلحہ کے لئے لڑیں، اور اُن کے پارلیمانی نمائندے جنگی مطالبہ زر کے خلاف ووٹ دیں۔ مستقل فوج ختم کی جائے، عوام کو مسلح کیا جائے اور جنگ کے لئے عوام میں رائے شماری کرائی جائے وغیرہ ان انسدادی تدابیر کے مقابلہ میں انارکسٹوں اور انارکو سنڈیکلسٹوں نے یہ قرارداد پیش ہوئی کہ اگر جنگ چھڑ جائے تو عام ہڑتال کی جائے عام ہڑتال کو جنگ کے خلاف بطور اسلحہ استعمال کرنے کی تجویز تینوں کانگریسوں میں کثرت رائے سے مسترد کر دی گئی۔ جرمنوں نے خاص طور پر اس

کی مخالفت کی۔ سوشلسٹ رہنماؤں کو عام ہڑتال کی کھلے بندوں مذمت کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ جیسا کہ مارکس کا دعویٰ تھا اور جسے آنے والے سالوں میں لینن نے صاف طور پر بتایا کہ انارکسٹ اور سنڈیکلسٹ اس فریب میں مبتلا تھے کہ وہ آنے والی جنگ کو محض ہڑتال سے روک سکتے تھے دوسری طرف انٹرنیشنل کا عام ہڑتال کو اصولی طور پر مسترد کر دینا انتہائی موقعہ پرستی تھی زیورچ کی کانگریس میں پلیخانوف نے ہڑتال مخالف موقف کو یوں بیان کیا، "موجودہ سماج میں عام ہڑتال ناممکن ہے۔ کیونکہ پرولتاریہ کے پاس اس پر عمل درآمد کے ذرائع موجود نہیں ہیں دوسری طرف ہم اُسی وقت عام ہڑتال کرنے کے قابل ہو سکیں گے جب پرولتاریہ کے قبضہ میں اقتصادی طاقت آجائے گی لیکن پھر عام ہڑتال ایک نری حماقت ہو گی"، لیکن مزدور طبقہ اس طاقتور ہتھیار سے دست بردار ہونے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھا اور مختلف ممالک میں ہونے والی عظیم الشان ہڑتالیں اس کا بین ثبوت تھیں۔

ان مخالف جنگ بحث و مباحثہ میں "مادر وطن کی مدافعت"، کا خیال بھی اُبھرنے لگا۔ وہ تصوّر جو ۱۹۱۴ء میں عظیم غداری کی نظریاتی بنیاد بنا یہ تھا کہ انتہائی رجعت پسند روس غالباً فرانس کی ہمنوائی میں جرمنی پر حملہ آور ہو تو اسے اپنی مدافعت ضروری ہے۔ ۱۸۹۳ء میں اینگلز نے روسی زار کے حملہ کے خلاف جرمنی کی قومی مدافعت کی تائید کی تھی اور پلیخانوف نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ روسی عوام جرمن فوجوں کو نجات دہندہ سمجھ کر استقبال کریں گے لیکن یہ فریب نظر تھا۔ لوین دھائی میں لڑائی ایک عظیم سامراجی جنگ کی شکل اختیار کر رہی تھی اور جرمن سوشل ڈیموکریٹوں کا دایاں بازو جس تیاری سے جنگ میں شامل ہو رہا تھا اُس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ روس کو آزاد کرانے والی انقلابی جنگ نہ تھی بلکہ جرمن بورژوا طبقہ کی جارحانہ وطن پرستی کی حمایت تھی۔

انیسویں صدی کی آخری دھائی میں جبکہ سرمایہ داری عجلت کے ساتھ پھیل رہی تھی اور سیاسی افق پر قریبی پرولتاری انقلاب کے کوئی آثار ہویدا نہ تھے، اسوقت لازماً فوری

مطالبات کے لیئے روزمرہ کی جدوجہد ہی خاص کام تھا لیکن دوسری انٹرنیشنل کے رہنماؤں نے انقلابی تصور کو سرے سے پس پشت ڈالتے ہوئے فوری مطالبات کی زیادہ سے زیادہ حمایت کی۔ انٹرنیشنل کے سرکردہ اصلاح پسند وولمر نے جزوی مطالبات کی تدریجی کامیابی کو سوشلزم کا راستہ قرار دیا اور دولت مند کسان سے اتحاد کی تجویز پیش کی۔ جرمن تحریک میں بڑھتی ہوئی اصلاح پسندی کے رجحان کا ایک مخصوص اور نمایاں اظہار وہ سلوک تھا جو پارٹی کے رہنما نے مارکس کی کتاب "فرانس میں طبقاتی جدوجہد" کے ساتھ روا رکھا جس سے کچھ کلیدی عبارتیں قطع کردی گئیں۔ جرمن پارٹی کی قیادت نے ۱۸۷۵ء کے گوتھا پروگرام پر مارکس کی تنقید کو چھپائے رکھا اسی طرح ۱۸۹۱ء میں کارل کاؤتسکی کے ارفرٹ پروگرام پر اینگلز کی تنقید دس برس تک شائع نہیں کی گئی۔

انٹرنیشنل میں دائیں بازو کے بڑھتے ہوئے رجحانات، پروگرام اور تنظیم کے مقابلے میں بائیں بازو کی لڑائی زیادہ پُراثر نہیں رہی تھی۔ اسی زمانہ میں ببیل، کاؤتسکی، پلیخانوف اور دوسرے لوگ جنہیں بالآخر اعتدال پسند رویہ اختیار کرنا تھا، دائیں بازو کے رجحانات کا مظاہرہ کرنے لگے تھے لیکن وہ ابھی تک مارکسزم کے بعض بنیادی اصولوں سے وابستہ تھے اس عہد کا بین الاقوامی "بایاں" بازو ایک ایسا بے ڈھنگا گروہ تھا جس میں بہت سے نیم موقعہ پرست اور اصلاح پسندوں کے ساتھ ساتھ روزا لکسمبرگ، کلارا زیٹکن اور فرانز مہرنگ ایسے ثابت قدم مجاہد بھی شریک تھے۔ اینگلز نے اس ترقی پذیر دائیں بازو کے خلاف طویل جنگ آزمائی کی لیکن ۱۹۱۴ء میں جب انتہائی بحران کا آخری وقت آن پہنچا اور معظم انقلابی عمل کیلئے نہایت اہم ضرورت پیش آئی تو پارٹی اپنے بدعنوان دائیں بازو سے چھٹکارا نہ پاسکی۔ ۵ اگست ۱۸۹۵ء کو انگلستان میں فریڈرک اینگلز کی وفات سے عالمی مزدوروں کو زبردست صدمہ پہنچا اور عالمی مزدور تحریک اپنے ایک ممتاز مفکر سے محروم ہوگئی۔ مارکس کی وفات کے بعد اینگلز نے اپنی زندگی کے آخری گیارہ سال خاص طور پر "سرمایہ" کی دوسری اور تیسری

جلدوں کو آخری شکل دینے میں صرف کر دیئے اور ساتھ ہی ساتھ عالمی مزدور تحریک میں روزمرہ کی عملی سیاسی رہنمائی میں بھی بیحد مصروف رہا۔ بلاشبہ اینگلز سوشلزم کا ماہر معمار تھا۔

بین الاقوامی ٹریڈ یونین ازم

ٹریڈ یونین مزدور طبقہ کی بنیادی عوامی جتھہ بندی ہیں کیونکہ یہ صرف مزدوروں کے لئے مخصوص ہوتی ہیں۔ ان کی تنظیم ورکشاپوں میں اُس مقام پر ہوتی ہے جہاں براہ راست پیداوار اور استحصال کیا جاتا ہے۔ ان میں مزدوروں کی کثیر تعداد شامل ہوتی ہے۔ ان کا بیشتر تعلق بالعموم محنت کش عوام کی اہم ترین ضروریات مثلاً اُجرت، اوقاتِ کار اور کام کے حالات سے ہوتا ہے۔ یہ مزدوروں کی اوّلین قسم کی تنظیم ہوتی ہے۔ جب ٹریڈ یونینیں کسی سیاسی عمل کی طرف مائل ہوتی ہیں تو وہ پارلیمنٹری کمیٹیوں، لیبر پارٹیوں یا مارکسی پارٹیوں کی شکل میں مخصوص سیاسی تنظیمیں وجود میں لاتی ہیں۔ یا پھر اُن کی مدد کرتی ہیں۔ وہ بذات خود اتنی مسلح نہیں ہوتیں کہ کسی سیاسی مہم کو کامیابی کے ساتھ چلا سکیں۔

۱۹۰۰ء تک مستحکم طور پر بڑھتی ہوئی ٹریڈ یونینوں نے بیسیوں سال کی جدوجہد کے بعد وسطی مغربی یورپ اور ریاست ہائے متحدہ میں اپنی تنظیم کا باقاعدہ حق حاصل کر لیا تھا۔ جبکہ مشرقی یورپ میں اس وقت یونینیں بالعموم نہایت خوف و تشدد کے تحت کام کر رہی تھیں۔ انگلستان جہاں سرمایہ داری نے سب سے پہلے جبت لگائی ٹریڈ یونین ازم کی جنم بھومی تھی۔ دوسرے تمام ممالک کے مزدوروں نے اپنی مزدور تنظیمیں قائم کرنے میں اپنے انگریز ساتھیوں سے بہت کچھ سیکھا۔ لیکن ان کے مخصوص قومی حالات نے ان کی اپنی یونینوں پر گہرا اثر ڈالا۔ لہٰذا بیسویں صدی کے آغاز تک ٹریڈ یونینیں تین وسیع درجوں میں منقسم ہو چکی تھیں۔ سادہ اور خالص ٹریڈ یونینیں، سوشل ڈیموکریٹک یونینیں اور انارکو سنڈیکلسٹ یونینیں۔ بہت سے ملکوں میں کچھ کیتھولک یونینیں بھی قائم ہوئیں۔

خالص اور سادہ ٹریڈ یونینیں جنہیں لینن نے اکنامک ازم کہا ہے اگرچہ اپنی ٹکسالی شکل میں اب فی الواقع ختم ہو چکی ہیں۔ سرمایہ داری کو علانیہ یا خاموشی سے قبول کر لینا اُن کی خصوصیت تھی۔ طبقاتی شعور کی کمی اور بین الاقوامیت کا کمزور جذبہ اس کی علامتیں ہیں۔ یہ اس اصول پر کام کرتی تھیں کہ وسیع محنت کش عوام کو قربان کر کے ماہر مزدوروں کی حفاظت کی جائے۔ یہ ایک ایسا رویہ تھا جو مزدور اشرافیہ اور ٹریڈ یونین دفتر شاہی کو بدعنوان بنانے کی مالکوں کی پالیسی سے عین مطابقت رکھتا تھا۔ سیاسی معاملات میں وہ بورژوازی کے آزاد خیال حصہ کا دُم چھلہ بنے رہتے تھے۔

سادہ اور خالص ٹریڈ یونینوں کے برعکس سوشل ڈیموکریٹک یونین سوشلزم کی کامیابی کے امکانات کی تصدیق کرتی تھیں اور سرکاری یا غیر سرکاری طور پر سوشل ڈیموکریٹک پارٹیوں کی سیاسی قیادت کو تسلیم کرتی تھیں۔ ان کے زیادہ سیاسی ہونے کی کچھ وجہ تو مارکسی پارٹیوں کا اثر تھا اور کچھ یہ وجہ تھی کہ یورپی ممالک میں بچے کھچے جاگیرداری کے اثرات زیادہ طاقتور تھے اور انگلستان یا امریکہ کی نسبت مزدوروں کو ابتدائی سیاسی حقوق، ووٹ، تنظیم، ہڑتال وغیرہ کا حق حاصل کرنے پر زیادہ توجہ دینی پڑتی تھی۔ عموماً ان یونینوں کی تعمیر سوشلسٹ پارٹیوں کی زیر قیادت ہوئی۔ جرمن مزدور تنظیمیں اس قسم کے ٹریڈ یونین ازم کی عالمی مثالیں تھیں۔ ۱۹۰۰ء تک جرمن یونینوں کے اراکین کی تعداد چھ لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ ۱۸۹۰ء میں جب جنرل فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز کی تشکیل ہوئی تو کارل لیجن اس کا جنرل سکریٹری مقرر ہوا اور آخری دم تک مسلسل جرمن مزدور تحریک کا سربراہ رہا۔

لیکن جرمن ٹریڈ یونین کی اعلیٰ قیادت موقعہ پرستی کا شکار ہوتی جا رہی تھی حقیقت تو یہ تھی کہ نظریاتی طور پر نہ سہی مگر تنظیمی طور پر پوری جرمن مزدور تحریک سیاسی اور اقتصادی دونوں طرح سے ترمیم پسندی کا سب سے مضبوط گڑھ تھی۔ رہنماؤں نے نہایت سخت مرکزی اقتدار قائم کر رکھا تھا۔ ٹریڈ یونین کی جمہوریت کو کم سے کم کر دیا گیا اور باقاعدگی کے ساتھ عوام کے

جنگجویانہ جذبے کے اظہار کو ختم کر دیا گیا۔ سوشل ڈیموکریٹک ٹریڈ یونین کے رہنما ایک طرف تو پارٹی سے وفاداری کا دم بھرتے تھے تو دوسری طرف ٹریڈ یونینوں کی "غیر جانبداری" کے اصول کی تلقین کرتے تھے۔ یہی وہ رجحان تھا جس نے جرمن مزدور تحریک کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

انارکو سنڈیکلسٹ یونینیں بھی ۱۹۰۰ء تک مزدور طبقہ میں نہایت واضح رجحان بننے لگی تھیں۔ یہ یونینیں عموماً پرودھن اور باکونن ازم کے جلوہ میں پیدا ہوئی تھیں۔ اس قسم کی ٹریڈ یونین کا زور فرانس، اٹلی، اسپین اور پرتگال میں تھا۔ ان کے پیش نظر مستقبل کے ایسے سماج کا خاکہ تھا جس پر ٹریڈ یونینوں کا عمل دخل ہوگا۔ عام ہڑتال جو انقلابی شکل اختیار کرے اُن کا انقلابی ہتھیار تھا۔ وہ شدت سے راست اقدام کے قائل اور غیر سیاسی تھے۔ انتخابی اور منظم پارلیمانی سرگرمیوں میں شمولیت سے اجتناب ان کا شیوہ تھا۔ تنظیمی طور پر سنڈیکلسٹ یونینیں لامرکزیت اور انتہائی خود مختار تھیں متحدہ عمل کے لئے ان کا انحصار عموماً عوام کی خودروی اور "جنگجو اقلیت" کی منظم سرگرمیوں پر تھا۔ لینن انارکو سنڈیکلزم پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "چھوٹے کاموں" سے انہیں نفرت ہے اور یہ "عظیم دنوں" کی منتظر ہیں، ان میں اُن قوتوں کو مجتمع کرنے کی قابلیت نہیں ہے جو عظیم واقعات کی تخلیق کرتی ہیں۔

مختلف ملکوں کی ٹریڈ یونینیں اپنے آغاز ہی سے مضبوط بین الاقوامی رجحانات کا اظہار کرنے لگی تھیں۔ یہ فرانس اور انگلستان کی یونینیں تھیں جنہوں نے پہلی انٹرنیشنل کی بنیاد رکھی پہلی انٹرنیشنل نے اپنا بہت زیادہ تعلق ٹریڈ یونین جدوجہد کے سوالات سے رکھا۔ بعد کے سالوں میں جب ٹریڈ یونینوں پر مشتمل ایک ہمہ گیر ٹریڈ یونین انٹرنیشنل کے قیام کا تقاضہ جاری رہا اور طاقت پکڑتا گیا۔ ٹریڈ یونین انٹرنیشنل کی راہ میں بڑی رکاوٹ ڈالنے والے دائیں بازو کے سوشل ڈیموکریٹ تھے جو مخالف سوشل ڈیموکریٹی رجحانات کو دیکھ کر ڈرتے تھے کہ ایسی انٹرنیشنل اُن کے اقتدار سے باہر نکل جائے گی لیکن بالآخر ۱۹۰۳ء میں ڈبلن میں ٹریڈ یونین انٹرنیشنل کے بڑھتے ہوئے مطالبے کے پیش نظر نیشنل ٹریڈ یونین مرکزوں کے انٹرنیشنل سیکریٹریٹ کی شکل میں

مصالحتی منصوبہ اختیار کر لیا گیا۔ یہ تنظیم بالآخر ۱۹۱۳ء میں مزدوروں کے مسلسل دباؤ کے تحت ایک ڈھانچہ کی شکل میں قائم ہوئی لیکن ۱۹۱۹ء تک وسیع رہنمایانہ بین الاقوامی تحریک نہ بن سکی۔

سامراج، ہلیرانڈ اور برنسٹین ترمیم پسندی

دوسری انٹرنیشنل کی پانچویں کانگریس ستمبر ۱۹۰۰ء میں پیرس میں منعقد ہوئی۔ اسوقت تک سرمایہ داری کا سامراجی دور بخوبی شروع ہو چکا تھا۔ لینن نے اپنی عظیم تصنیف "سامراج سرمایہ داری کی آخری منزل" میں سامراج کی بنیادی خصوصیات بیان کی ہیں۔ ۱: پیداوار اور سرمایہ کا ارتکاز بڑھ کر اپنے ارتقا کی اس قدر اونچی منزل پر پہنچ گیا ہے کہ اب اس نے اجارہ داریوں کو جنم دیا ہے۔ ۲: بینکوں کا سرمایہ اور صنعتی سرمایہ ایک دوسرے میں ضم ہو گئے ہیں۔ ۳: سرمائے کی برآمد جو اجناس کی برآمد سے مختلف چیز ہے غیر معمولی اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔ ۴: بین الاقوامی سرمایہ دارانہ اجارہ دار دھڑوں کی تشکیل ہوتی ہے جو آپس میں دنیا کے حصے بخرے کر لیتے ہیں۔ ۵: سب سے بڑی سرمایہ دار طاقتوں کے درمیان دنیا کی علاقائی تشکیل مکمل ہو چکی ہے۔

اس نئے سامراجی دور کی خصوصیت یہ تھی کہ بڑے بڑے سرمایہ داروں نے اپنی حکومتوں کی مدد سے پسماندہ ممالک کی معیشت پر قبضہ جما لیا۔ سامراجی طاقتوں نے دنیا کے مختلف پسماندہ علاقوں کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ ہوبسن کے تخمینے کے مطابق ۱۸۸۴ء سے ۱۹۰۰ء تک کے زمانے میں ۳۷ لاکھ مربع میل کے رقبے کا علاقہ انگلستان کے قبضے میں آیا جس کی مجموعی آبادی ۵ کروڑ ۷۰ لاکھ تھی۔ اسی طرح فرانس نے ۳۶ لاکھ مربع میل پر قبضہ کیا جس کی مجموعی آبادی ۳ کروڑ ۶۵ لاکھ تھی۔ جرمنی ۱۰ لاکھ مربع میل اور ایک کروڑ ۴۷ لاکھ آبادی کو اپنے تحت لایا۔

سرمایہ داری کی خاصیت ہے کہ مختلف ملکوں میں اس کی ترقی کی رفتار بہت مختلف رہی

ہے۔ لینن کہتا ہے "عالمی معیشت کے مختلف حصوں کی نشوونما کی رفتار میں جو تضادت ہوتا ہے اسے مالیاتی سرمایہ اور ٹرسٹ ختم نہیں کرتے بلکہ اُلٹا بڑھاتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ ترقی کی یہ نابرابری سرمایہ دار قوتوں کے درمیان منافسہ کو تیز سے تیز تر کرتی ہے اور یہی عہد جدید کی سامراجی جنگ کا بنیادی سبب ہے۔

سامراج کے عروج کے دوران اہم سرمایہ دار ملکوں میں ماہر اور غیر ماہر مزدوروں کی اُجرتوں میں تفاوت کا فروغ عالمی مزدور تحریک کے لیے خاص اہمیت کا حامل تھا۔ انیسویں صدی کے آخری ربع میں جو تیز سے تیز تر صنعتی پھیلاؤ اور روز افزوں مزدور استحصال کا دور تھا بڑے سرمایہ دار ممالک میں حقیقی اُجرتوں میں آہستگی اضافہ ہوا۔ چنانچہ جرمنی میں جبکہ مزدور طبقہ کی حقیقی اُجرتیں (عموماً افلاس کی سطح سے) ۱۸۷۷ء میں ۱۰۰ سے بڑھ کر ۱۹۰۹ء میں ۱۰۵ تک پہنچیں اس دوران میں مزدور اشرافیہ کی اُجرتوں میں ۱۱۳ تک کا اضافہ ہوا۔ دائیں بازو کے موقعہ پرست سوشل ڈیموکریٹوں نے اپنے ترمیم پسند نظریات اور طبقاتی مفاہمت کی پالیسی کی بنیاد نسبتاً زیادہ خوشحال مزدور اشرافیہ پر رکھی۔ تاہم اُجرت کا یہ رجحان بعد کے سالوں میں پلٹ گیا۔

سامراج کی نشوونما کے اس دور میں دوسری انٹرنیشنل کی پوری مدت میں اہم سرمایہ دار ملکوں کی سوشلسٹ پارٹیوں میں دائیں بازو کی موقع پرستی نے فروغ پایا۔ یہ منفی رجحان پیرس کی ۱۹۰۰ء کی کانگریس میں فرانس کے میلیراںڈ اور جرمنی کے برنسٹین کے مشہور معاملات میں نقطہ عروج کو پہنچا۔ ان دونوں موقعہ پرستوں کی لڑائیوں میں جو دوسری انٹرنیشنل میں دائیں اور بائیں بازو کے درمیان پہلی حقیقی جدوجہد تھی، تحریک میں پھوٹ کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ واقعہ یہ تھا کہ فرانس کی "خودمختار سوشلسٹ پارٹی" کے ایک فرد میلیراںڈ نے پارٹی سے مشورہ کئے بغیر بورژوا حکومت میں وزیر تجارت کا عہدہ سنبھال لیا، جو اُس وقت انتہائی رجعتی اقدامات اُٹھا رہی تھی۔ اس معاملے پر بحث و مباحثے کے بعد تین واضح رجحانات سامنے

آئے۔ پہلا رجحان وہ تھا جس کے مطابق "بورژوا سماج میں سوشل ڈیموکریسی کو اپنی فطرت کی بنیاد پر مخالف پارٹی کا کردار ادا کرنا چاہیئے اور یہ اُسی وقت منقدر پارٹی بن سکتی ہے جب بورژوا سماج کا خاتمہ ہو جائے"

دوسرا نقطہ نظر انتہائی دائیں بازو کا تھا جس میں سوشلسٹ پارٹی سے بورژوا پارٹیوں کے ساتھ مل کر مخلوط حکومت بنانے کی پرزور حمایت کی گئی اور سرمایہ دارانہ حکومت میں اس قسم کی شمولیت کو سوشلسٹ انقلاب کا آغاز قرار دیا گیا۔ تیسرا نقطہ نظر جو اعتدال پسندوں کا تھا کاؤٹسکی نے پیش کیا جس کے مطابق یہ کوئی اُصولی مسئلہ نہیں بلکہ طریق کار کا سوال ہے۔ اُس نے کہا "کانگریس کو اس بارے میں کوئی فیصلہ صادر نہیں کرنا چاہیئے" اس طرح موقعہ پرستوں کے لئے دروازہ کھلا چھوڑ دیا گیا۔ کاؤٹسکی کی قرارداد منظور کرلی گئی اور بائیں بازو کے موقف کو شکست دے دی گئی۔ اس تاریخی کشمکش سے حاصل ہونے والا ایک اہم سبق بڑھتی ہوئی اعتدال پسندی اور دائیں بازو کی موقع پرستی کا اظہار تھا اس کے باوجود عسکریت پسندی اور نوآبادیات کے سوال پر بائیں بازو کا پلڑہ بھاری رہا۔ کانگریس نے مزدوروں سے سفارش کی کہ وہ سامراجی ریاستوں کی نوآبادیاتی پالیسی کے خلاف سرگرمی سے حصّہ لیں اور کہا کہ نوآبادیاتی ممالک میں سوشلسٹ پارٹیاں قائم کی جائیں۔ اب تک دوسری انٹرنیشنل نے نوآبادیاتی اقوام کی طرف سے سخت اغماض برتا تھا۔ درحقیقت یہ تنظیم لٹنے والے نوآبادیاتی عوام کے لئے اور اُن سے مل کر کسی موثر پروگرام کو ترقی دینے میں ناکام رہی تھی۔

پیرس کانگریس میں ایک اہم قدم جو اُٹھایا گیا وہ بین الاقوامی سوشلسٹ بیورو کا قیام تھا۔ اپنے قیام کے ایک عشرہ بعد تک دوسری انٹرنیشنل بغیر کسی منظم عالمی مرکز کے کام کرتی رہی یہ اعلان بھی کیا گیا کہ صرف وہی تنظیمیں، پارٹیاں، ٹریڈ یونینیں، امداد باہمی کی انجمنیں وغیرہ جو سوشلزم کے عام اصولوں کو تسلیم کرتی ہیں انٹرنیشنل کے ساتھ اپنا الحاق کر سکتی ہیں۔ بیورو کی تشکیل اگرچہ ایک اگلا قدم تھا لیکن اس کا کام خط و کتابت اور اعداد و شمار مہیا

کرنے والے مرکز سے آگے نہ بڑھا تھا۔ بیورو کے قیام کے بعد اس تنظیم کو قیادت کا حق نہ دینا اس بات کو ظاہر کرتا تھا کہ ملحقہ پارٹیوں میں بورژوا قوم پرستی کا خطرہ پرورش پا رہا تھا۔ بالآخر دوسری انٹرنیشنل کا بیڑہ جس چٹان سے ٹکرا کر غرق ہوا وہ قومی جارحانہ وطن پرستی کا جذبہ ہی تھا۔

ایمسٹرڈیم میں منعقد ہونے والی چھٹی کانگریس کے سامنے مرکزی سوال "برنسٹین ترمیم پسندی" تھی۔ یہ رجحان سامراج کے عروج اور دوسری انٹرنیشنل میں پرورش پانے والے دائیں بازو کے میلانات کا نتیجہ تھا۔ سرمایہ داری کا پھیلاؤ اور نسبتاً استحکام، جا بجا بڑے بڑے ٹرسٹوں کا قیام، مزدوروں خصوصاً ماہر مزدوروں کی حقیقی اجرتوں میں قدرے اضافہ، مزدور طبقہ کی اقتصادی اور سیاسی تنظیموں کی توسیع، کچھ جمہوری حقوق خصوصاً رائے دہندگی، اور "نئے متوسط طبقہ" (دانشوروں ماہروں وغیرہ) کی نشوونما وغیرہ ابتدائی سامراجی دور کی وہ خصوصیات تھیں جن کی بناء پر برنسٹین نے یہ دعوی کیا کہ مارکسزم یکسر غلط ہے اور سرمایہ داری ساخوردہ اور رجعت پسند ہونے کی بجائے بتدریج سوشلزم کی طرف جا رہی ہے۔ برنسٹین نے سوشلزم تک "تدریجی رسائی" کا نظریہ پیش کیا جو بنیادی طور پر انگلستان کے فیبئینوں کے پیش کردہ نظریات سے مماثل تھا۔ اس نے طبقاتی جدوجہد کی حقیقت سے انکار کرتے ہوئے، اپنے پروگرام کی بنیاد طبقاتی مفاہمت پر رکھی۔ روزا لکسمبرگ نے برنسٹین کے نظریات پر شدید ترین حملے کئے اور اسے رجعتی قرار دیا۔

برنسٹین کی ترمیم پسندی ۱۹۰۳ کو جرمن پارٹی کے ڈریسڈن کنونشن میں نقطہ عروج کو پہنچی۔ اس سال جرمن سوشل ڈیموکریسی کو انتخابات میں اہم کامیابی حاصل ہوئی تھی جس کی بنیاد پر دائیں بازو نے محسوس کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ حکومت میں حصہ لینے پر اصرار کیا جائے۔ کنونشن میں اپنے نظریات کی شکست کے باوجود برنسٹین ٹریڈ یونین رہنماؤں میں موقعہ پرستی کا بیج بونے میں کامیاب ہو گیا جس نے جرمن پارٹی اور پوری انٹرنیشنل کو

تباہی کے غار میں دھکیل دیا۔ برنسٹین پرستی کے خلاف بائیں بازو کے وسیع محاذ نے عالمی پیمانے پر جدوجہد کی۔ لیکن اس کی ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ بائیں بازو کے طرفدار ہر قیمت پر پارٹی اتحاد کو قائم رکھنے کے لئے کوشاں تھے۔ انہیں اس بات کا احساس نہیں تھا کہ برنسٹین کے پیروکاروں کے ساتھ اتحاد پارٹیوں کو طاقتور بنانے کی بجائے انہیں کمزور کرنے کا سبب ہے۔ سب سے زیادہ لینن نے اس خطرے کا احساس کیا۔ ۱۹۰۳ء میں عام جدوجہد کے اسی دور میں بالشویکوں نے منشویکوں سے علیحدگی اختیار کر لی

دوسری انٹرنیشنل میں موقع پرستی کی سب سے گھناؤنی شکل وہ تھی جس کا اظہار امریکی سوشلسٹ پارٹی نے حبشی عوام کے ساتھ سلوک روا رکھ کر کیا۔ سال ہا سال سے حبشی عوام کو امریکی خانہ جنگی میں زرعی غلامی سے نجات کے بعد مسلسل بربریت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ انہیں تعلیم حاصل کرنے، صنعتوں میں کام کرنے، ووٹ دینے اور مسلح افواج میں ملازمت کرنے کے حقوق حاصل نہ تھے اُنہیں وحشیانہ طریقے پر قتل کر دیا جاتا۔ کوڑے لگائے جاتے اور زندہ جلا دیا جاتا مگر سوشلسٹ پارٹی اس خوفناک حالت کو خاموشی کے ساتھ نظرانداز کر رہی تھی۔ حبشی عوام کی اندوہناک حالت سے بے اعتنائی پر پردہ ڈالنے کے لئے پارٹی نے یہ نظریہ گھڑ کر بار بار اعلان کیا "چونکہ پارٹی کا تعلق کل مزدوروں سے ہے اس لئے آبادی کے کسی ایک گروہ کے خصوصی مطالبات کے لئے آواز بلند نہیں کی جا سکتی اور جب تک سوشلسٹ نظام نہیں آجاتا اُس وقت تک یہ برائیاں ختم نہیں ہو سکتیں"۔

ایمسٹرڈیم کانگریس میں ترمیم پسندوں کو شکست ہوئی اور حسب ذیل قرارداد منظور کی گئی "کانگریس اُن ترمیم پسندوں کی کوششوں کی مذمت کرتی ہے جن کا مقصد ہماری آزمودہ اور فتح مند پالیسی میں، جس کی بنیاد طبقاتی جنگ پر ہے تغیر و تبدیل کرنا ہے۔ اس ترمیم پسندانہ طریقہ کار کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ وہ پارٹی جو لبورژوا سماج کو سوشلسٹ سماج میں جلد از جلد تبدیل کرنے کی جدوجہد کر رہی ہے اور جو صحیح ترین معنوں میں انقلابی پارٹی

ہے ایک ایسی پارٹی میں منتقل ہو جائے گی جو بورژوا سماج میں صرف اصلاح پر قناعت کرنا چاہتی ہے۔

لینن اور ایک نئے قسم کی پارٹی۔

موجودہ صدی کے آغاز تک دوسری انٹرنیشنل کا تاریخی رجحان قطعی طور پر مارکسزم سے ہٹ کر دائیں بازو کی موقع پرستی کی طرف ہو گیا تھا بہت سی سوشلسٹ پارٹیوں کی قیادت میں موقع پرست پروگرام بیش از بیش داخل ہوتا چلا گیا ترقی پذیر اور متزلزم اعتدال پسندوں کا گروہ بڑھتے ہوئے دائیں بازو کا مستحکم طور پر مقابلہ کرنے میں ناکام ثابت ہو رہا تھا جبکہ بایاں بازو بھی اس رجحان کا موثر توڑ کرنے میں ابھی تک ناکام رہا تھا۔ البتہ روس کے مارکسی اس ترمیم پسندی کا مقابلہ کرنے کے لئے میدان میں اتر رہے تھے، جو صنعتی طور پر پسماندہ ملک تھا۔ اب تک انٹرنیشنل میں ان کا کردار بہت مختصر تھا۔ روسی مارکسیوں کے اس طاقتور گروہ کی قیادت لینن کر رہا تھا۔

لینن ازم ترقی پذیر عالمی سامراج اور روسی انقلاب کی پیداوار تھا۔ اس کا فطری نقطہ آغاز زار شاہی روس تھا جہاں سامراج کا تضاد زیادہ تیز تھا۔ اور جہاں پرولتاری انقلاب سرعت کے ساتھ پروان چڑھ رہا تھا۔ مارکس اور اینگلز کی طرح لینن بھی نظریہ اور عمل دونوں کا مرد میدان تھا۔ اس نے نہ صرف مارکس کے اُن نظریات کو زندہ کیا جنہیں ترمیم پسندوں نے دفن کر دیا تھا بلکہ مارکسزم میں ایسے اضافے بھی کیے جن کی وجہ سے وہ تمام ممالک کے سامراجی دور کے بہت سے مسائل کو حل کرنے کے قابل ہو گیا۔ مارکسی اصولوں کی ٹھوس بنیادوں پر لینن نے نے سامراجی دور کے لئے پرولتاری انقلابی حکمت عملی اور طریق کار کی بھی تشکیل کی۔ عہد جدید کے بورژوا یا سوشلسٹ انقلابات میں پرولتاریہ کا رہنمایانہ کردار، مزدوروں اور کسانوں کے مابین اتحاد اور سامراجی ممالک کے مزدوروں اور نو آبادیاتی ممالک کی جدوجہد آزادی کے درمیان اشتراک، دیہی علاقوں میں طبقاتی اختلافات، مظلوم قوموں کے حق خود ارادیت

کا مسئلہ، فوری مطالبات اور سوشلزم کے لئے لڑائی کے درمیان تعلق، ٹریڈ یونینوں کا کردار اور پارٹی کے ساتھ ان کا تعلق، پرولتاری بغاوت کا قانون، ایک ملک میں سوشلزم کے قیام کا امکان، اور بورژوا انقلاب کی پرولتاری انقلاب میں تبدیلی وہ چند بنیادی مسائل تھے جس سے لینن نے مارکسزم کو مالا مال کیا۔ یہ تمام امور مزدور طبقہ کو بورژوا طبقہ کا دم چھلہ بنانے والی دائیں بازو کی مروجہ پالیسی سے بنیادی طور پر مختلف تھے جو کسانوں کو رجعت پسند عوام سمجھتی تھی۔ جسے حق خود ارادیت اور نوآبادیاتی عوام کی جدوجہد سے نفرت تھی، جس کی تمام تر توجہ فوری مطالبات پر مرکوز تھی اور جو بالعموم سوشلزم کے لئے لڑنے سے قاصر تھی۔

لینن کی ایک عظیم ترین کامیابی خود کمیونسٹ پارٹی سے متعلق نظریہ سازی اور اس کی تخلیق تھی جس کے بغیر مزدور طبقہ کی آزادی اور سوشلزم کی گفتگو بے معنی ہوتی۔ اب تک دائیں بازو کی پارٹی بنا کسی پروگرام کے ایک ایسی بے ہنگم پارٹی تھی جس میں ہر طرح کے ابن الوقت، موقعہ پرست اور نظم وضبط سے مبرا لوگ شامل ہوں۔ اس کے برعکس لینن کی پارٹی ایک انقلابی پارٹی تھی، مزدور طبقہ اور اس کے اتحادیوں پر مبنی یہ پارٹی مزدور تحریک، عوامی جتھے بندیاں، امداد باہمی کی انجمنوں وغیرہ میں بہترین جنگجو اور وفا شعار مزدوروں سے تشکیل پائی ہوئی، خود تنقیدی اور انتہائی ترقی یافتہ مارکسی تصورات کی حامل ایک ایسی پارٹی تھی جو جنگ کے میدانوں میں ورکشاپوں کھیتوں، کالجوں اور قانون سازی کے ایوانوں میں ہر لحاظ سے مزدور طبقہ اور پوری قوم کی رہنمائی صحیح معنوں میں کر سکتی ہے۔

روس میں پہلی منظم مارکسی قوت "آزادی مزدور گروپ" نام کی تنظیم تھی جس کی قیادت پلیخانوف کر رہا تھا۔ پلیخانوف نرودنک یا پاپولسٹ تھا لیکن اپنی عمر کے ابتدائی ایام میں اس نے مارکسزم کو قبول کر لیا تھا۔ دوسری انٹرنیشنل میں وہ سب سے ذہین مارکسی نظریہ ساز تھا۔ آگے چل کر وہ بالعموم مارکسزم سے دور ہٹتا گیا اور اعتدال پسندی کے ذریعے ترمیم پسندی کی طرف جھک گیا۔ لینن ۱۸۹۳ء میں سینٹ پیٹرز برگ پہنچا اور مزدور طبقہ کی آزادی کے لئے جدوجہد

کی لیگ" نامی تنظیم میں سرگرم عمل ہوگیا، لینن کی جماعت بڑھتی ہوئی ہڑتال کی تحریک میں جنگجویانہ حصہ لینے کے ساتھ ساتھ روسی مارکسیوں کے نقطہ نظر کی مزید وضاحت کرنے لگی ۔ جیسا کہ مارکسی پارٹی کے لئے لازمی ہے پارٹی نے زارشاہی روس میں نہ صرف آجروں اور رجعت پرست جاگیرداروں کے خلاف جدوجہد کو آگے بڑھایا بلکہ مزدور طبقہ اور اس کے اتحادیوں میں رونما ہونے والے مختلف بیگانہ رجحانات کے خلاف بھی مورچہ بٹھایا ۔ اسے سب سے پہلے نظریاتی دشمن سے واسطہ پڑا اسے نرودازم (پاپولزم) کہا جاتا ہے ۔ وہ اس غلط نظریہ کے حامل تھے کہ اصل انقلابی طاقت مزدور طبقہ نہیں بلکہ کسان ہے اور صرف کسان انقلاب ہی زار کی حکومت اور جاگیرداروں کا تختہ الٹ سکتا ہے لینن نے بڑی ذہانت سے بسرعت ترقی پذیر سرمایہ داری کی نشاندہی کی جس کی ابتدا روس میں ہو چکی تھی اور اسے مسلسل نشوونما دینے والے عناصر کا انکشاف کیا ۔ اس نے ثابت کیا کہ پرولتاریہ ہی وہ طبقہ ہے جو انقلاب کی قیادت کر سکتا ہے ۔

بڑھتی ہوئی ٹریڈ یونین جدوجہد میں خصوصاً ۱۸۹۹ء کے دوران روسی محنت کش عوام کی صفوں میں انحراف پسندوں کا ایک نیا گروہ سر اٹھانے لگا اس گروہ کو نام نہاد "معاشیات پسند" کہا جاتا تھا ۔ ان کا خیال تھا کہ "مزدوروں کو اپنے آجروں کے خلاف صرف معاشی جدوجہد کرنے کی ترغیب دینا چاہیئے ۔ جہاں تک سیاسی جدوجہد کا تعلق ہے یہ کام آزاد خیال بورژوا طبقہ کا ہے وہی سیاسی قیادت کے لئے موزوں ہیں" لینن نے اس ترمیم پسند گروہ کے ساتھ مناظرے کے دوران اپنی کتاب "اب کیا کرنا چاہیئے" میں ٹریڈ یونین ازم کا ایسا تجزیہ کیا کہ اس کی نظیر نہیں ملتی ۔ ان نازک اور ترکیبی سالوں میں روسی مارکسی صفوں میں "آئینی مارکسزم" نے بھی فروغ پکڑا ۔ یہ گروہ پرولتاری انقلاب اور پرولتاریہ کی آمریت کے سرے سے مخالف تھا ۔ لینن نے بڑی بے دردی سے اس پیٹی بورژوا رجحان کی دھجیاں اڑائیں ۔

لندن کنونشن جس نے پارٹی کی بنیاد رکھی اس وقت منعقد ہوا جب روس میں عوامی جدوجہد کی لہریں اٹھ رہی تھیں صنعتی بحران کا دور دورہ تھا جس نے ۱۹۰۱ء ۔ ۰۳ء کے درمیانی عرصہ میں بیشتر

صنعتوں کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا اور ملک کے بہت سے حصوں میں بڑی ہڑتالیں ہو رہی تھیں۔ یہ ہڑتالیں جو وسیع سے وسیع تر اور طرز عمل میں زیادہ سے زیادہ انقلابی ہوتی جا رہی تھیں زار شاہی کے وحشیانہ تشدد کا شکار تھیں۔ ۱۹۰۲ء میں تحریک کسانوں میں بھی پھیل گئی۔ روس ۱۹۰۵ء کے انقلاب کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ کنونشن میں اصل لڑائی پارٹی کے آئین پر ہوئی۔ مارتوف جسے ٹراٹسکی کی حمایت حاصل تھی ایک وسیع اور بے ہنگم تنظیم چاہتا تھا۔ اُس کے نزدیک رکن بننے کے لئے صرف یہی کافی تھا کہ پروگرام کو تسلیم کیا جائے۔ اور مالی امداد دی جائے۔ حقیقی ممبر شپ اور عملی کام ضروری نہیں تھا۔ فرق یہ تھا کہ لینن ایک جنگجو انقلابی پارٹی چاہتا تھا جو ایک مضبوط ہراول دستے کا کام دے جبکہ مخالفین ایسی تنظیم وجود میں لانے کے لئے کوشاں تھے جو مغرب کے موقعہ پرست سوشل ڈیموکریٹوں کے نمونے پر ڈھیلی ڈھالی اور غیر منضبط ہو۔ لینن کانگرس کو پوری طرح اپنے خیالات سے متفق نہ کر سکا۔ لیکن جب مرکزی کمیٹی کے انتخاب اور اسکرا کی ادارت کا سوال آیا تو لینن کے ساتھی کامیاب رہے۔ انتخابات میں رائے شماری کا یہی مشہور واقعہ تھا جس میں دونوں گروہوں نے بالشویک (اکثریت) اور منشویک (اقلیت) کا نام پایا۔ اس گروہی نزاع کی وجہ سے جنوری ۱۹۰۵ء تک پارٹی منقسم ہو گئی دوسری انٹرنیشنل نے روسی پارٹی کے اختلاف میں مداخلت کی تاکہ اتحاد کا مسلمہ اصول قائم رہے لیکن اُسے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ دوسری انٹرنیشنل کو روس میں بالشویک تحریک کی معین شکل کی عظیم الشان اہمیت کا ذرہ برابر احساس بھی نہ تھا۔ لینن کی اس نئی قسم کی پارٹی کا مقصد مغرب کی موقعہ پرستی سے متاثر پارٹیوں سے جو روز بروز مارکسی اصولوں کو فراموش کرتی جا رہی تھیں جداگانہ ایک طاقتور موڑ قطع کرنا اور کمیونسٹ مینی فیسٹو کے وضع کردہ ابتدائی اصولوں کی مضبوط اساس پر ایک صحیح انقلابی پارٹی کی ابتداء کرنا تھا۔ درحقیقت یہ ایک نئی اور بہتر انٹرنیشنل کے لئے بویا جانے والا محفوظ بیج تھا جسے بالآخر حالات کی انقلابی رفتار نے بارآور کیا اور نہ صرف دوسری انٹرنیشنل پر بلکہ پوری دنیا پر گہرے اثرات نقش کیے۔

۱۹۰۵ء کا روسی انقلاب

روس جاپان کی جنگ (۰۵-۱۹۰۴ء) دو عظیم طاقتوں کے مابین ایک سامراجی تصادم تھا جو چین کے شمالی علاقے منچوریا کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس پر قابض ہونا چاہتی تھیں۔ روسی محنت کشوں کو ابتداً ہی سے اس رجعت پرست سامراجی جنگ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ پہلے ہی انقلابی موڈ سے بھرے بیٹھے تھے۔ زار کی حکومت نے بے دردی سے ساتھ فاقہ مست نیم مسلح افواج کو جنگ کی بھٹی میں جھونکنا شروع کر دیا تو مظلوم عوام کے ظلم و ستم کا پیمانہ چھلک اٹھا اور انہوں نے ۱۹۰۵ء کے عظیم انقلاب سے اس کا جواب دیا۔ جنگ ابھی جاری تھی کہ انقلاب پھوٹ پڑا۔ اس تاریخی تحریک کا آغاز مسلسل ہڑتالوں سے ہوا جن کی رہنمائی خاص طور پر پارٹی کا بالشویک بازو کر رہا تھا۔ دسمبر ۱۹۰۴ء میں بالشویکوں کی سرکردگی میں باکو میں تیل کے مزدوروں کی بڑی ہڑتال ہوئی جس میں مزدوروں کی جیت ہوئی اور ایک ایسا اجتماعی سمجھوتہ ہوا جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کے بعد پیٹرزبرگ کے دھات سازی کے کارخانے کے مزدوروں نے بھی ہڑتال کر دی جو پورے شہر میں پھیل گئی۔

اسی دوران روسی مزدور تحریک میں ایک انتہائی المناک سانحہ رونما ہوا۔ یہ تھا "خونی اتوار" کا قتل عام جو پیٹرزبرگ کے سرمائی محل کے سامنے ہوا۔ اس ہولناک قتل عام کے نتیجے میں ایک ہزار سے زائد افراد مارے گئے۔ زار کو امید تھی کہ اس بھیانک اقدام سے سینٹ پیٹرزبرگ کی ہڑتال کچل دی جائے گی اور پورے روس میں مزدوروں میں خوف و ہراس پھیل جائے گا۔ لیکن انقلابی تحریک مدھم پڑنے کی بجائے اور زیادہ تیزی سے بھڑک اٹھی ملک کے بیشتر علاقوں میں ہڑتالیں پھوٹ پڑیں۔ انقلاب کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس انقلابی سال میں تقریباً ۸۱ لاکھ مزدوروں نے ہڑتالوں میں حصہ لیا۔ یہ تعداد کل مزدوروں کی تعداد سے دوگنی تھی۔ انقلابی تحریک کسانوں میں بھی پھیل گئی۔ بہت سی مظلوم قومیتوں کے انقلابی جذبات بھی بھڑک اٹھے۔

انقلاب کی بڑھتی ہوئی لہر سے خوفزدہ ہو کر زار نے روسی عوام کا مطالبہ "سلطنت کی دوما" (مشاورتی پارلیمنٹ) منعقد کرنا منظور کر لیا اس کا سیاسی مقصد یہ تھا کہ بڑھتی ہوئی انقلابی لہر کو بے ضرر پارلیمانی رو میں تبدیل کر دیا جائے، روسی سوشل ڈیموکریٹک لیبر پارٹی عظیم عوامی ہلچل میں تیزی

کے ساتھ اُبھرنے لگی۔ لیکن پارٹی بالشویک اور منشویک گروہوں میں رُسماً نہیں بلکہ حقیقتاً بٹی ہوئی تھی۔ منشویکوں کا خیال تھا کہ روس میں اس زمانے کی جدوجہد محض قدیم نوعیت کا بورژوا انقلاب ہے اس لئے اس کی رہنمائی بورژوا طبقہ کو کرنی چاہئیے اور مزدور طبقہ کا کردار یہ ہے کہ وہ زار کی مطلق العنانیت کو ختم کرنے میں بورژوا کی مدد کریں۔ انہیں اپنے طور پر کسی انقلابی سرگرمی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئیے کیونکہ بورژوا طبقہ اس سے خوفزدہ ہو کر انتہائی رجعت پرست جاگیردار کی گود میں چلا جائے گا۔ ان امکانات کے مطابق فتح کے بعد روسی سرمایہ داری کا ایک طویل عہدِ ارتقاء وجود میں آتا جس میں سوشلزم کی توقعات مستقبل بعید کے دھندلکے میں دھکیل دی جائیں۔ بالشویکوں کا بھی خیال تھا کہ بڑھتا ہوا انقلاب بورژوا خصوصیت کا حامل ہے، صرف اسی ایک نقطہ پر ان کا منشویکوں سے اتحاد تھا۔ لینن نے واضح طور پر بتایا کہ بورژوا طبقہ مستقل مزاجی کے ساتھ نہ انقلاب لا سکتا ہے اور نہ لائے گا۔ مزدور طبقہ کے خوف سے زار سے سمجھوتہ کرے گا۔ اس لئے مزدور طبقہ کو رہنمائی کرنا لازمی ہے۔ بالآخر یہی ہو کر رہا۔ لینن نے بتایا کہ کسان مزدور طبقہ کا طاقتور انقلابی حلیف ہے جو پرولتاریہ کی رہنمائی میں سرگرم عمل ہوگا۔ لینن کے سامنے ایک وسیع انقلابی راستہ تھا جس پر چل کر روسی کسانوں اور مزدوروں نے نومبر ۱۹۱۷ء میں زار شاہی اور سرمایہ داری پر فتح حاصل کی۔

اکتوبر ۱۹۰۵ء میں ریلوے مزدوروں کی عام ہڑتال نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دوسری صنعتوں کے بیشتر مزدور، سرکاری ملازمین، طلباء اور دانشور بھی ہڑتال میں شامل ہو گئے۔ ہڑتال میں تقریباً پندرہ لاکھ مزدوروں نے حصّہ لیا۔ ہڑتالیوں کا مطالبہ آٹھ گھنٹے کے کام کا دن تھا۔ ملک بیشتر حصّوں میں کسان بھی بھڑ اُٹھے، محنت کشوں کی شورشیں قومی بغاوتوں کے روپ میں ڈھلنے لگیں، فوج اور بحریہ میں بھی اکا دکا بغاوتیں رونما ہونے لگیں۔ بہت سے شہروں میں مزدوروں کے نمائندے کی سوویٹ پنچایتی کمیٹیاں قائم ہونا شروع ہو گئیں۔ اس تحریک کے نتیجے میں زار مزید پیچھے ہٹا اور اپنے منشور میں سیاسی

اصلاحات اور قانون ساز پارلیمنٹ کا وعدہ کیا۔ بالشویک جنہوں نے اس سے قبل زار کی "مشاورتی" ڈوما کی پیشکش کو رد کر دیا تھا انہوں نے دوسری پیش کش کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا۔ لینن نے دوسرے مقاطع کو غلطی سے تعبیر کیا کیونکہ ان دنوں انقلاب انحطاط پذیر تھا لیکن پہلا مقاطع درست تھا دوسری طرف منشویک جو مسلح جدوجہد سے زار شاہی کا تختہ اُلٹنے کی بجائے اس میں "اصلاح اور سدھار" چاہتے تھے زار کے منشور سے پوری طرح متفق تھے۔

دسمبر ۱۹۰۵ء میں ماسکو کی شورش بھرپور انقلاب کا نقطۂ عروج تھی۔ پارٹی نے مسلح بغاوت کا نعرہ دے دیا اور سیاسی ہڑتال نے بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ مظلوم عوام نے اس نعرہ کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ لیکن منشویکوں اور دیگر موقعہ پرستوں نے اس کی ڈٹ کر مخالفت کی۔ ٹراٹسکی اور بعض دیگر افراد جو سینٹ پیٹرزبرگ سوویت کی رہنمائی کر رہے تھے نے اس سب سے زیادہ طاقتور شاخ کو مسلح جدوجہد میں حصہ لینے سے روکے رکھا، ۲۰ دسمبر کو ماسکو میں بغاوت کا آغاز ہوا اور پورے شہر میں مورچہ بند لڑائی چھڑ گئی۔ فوج اور عوام کے درمیان نو روز تک مقابلہ ہوتا رہا لیکن زار کی زبردست مسلح فوج کے سامنے انہیں بالآخر شکست اُٹھانی پڑی۔ دوسرے شہروں میں بھی بغاوتیں کچل دی گئیں۔

۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۷ء کے دوران ہڑتال کی لہریں اُٹھتی رہیں لیکن اب ان کا زور کم ہو چکا تھا۔ انقلاب کا شباب گزر چکا تھا۔ ۱۹۰۵ء کے انقلاب کی ناکامی کی متعدد بنیادی وجوہات تھیں ان میں مزدوروں اور کسانوں کے درمیان مسلسل اتحاد کا فقدان، کسانوں کے بڑے حصے کا زار کی حکومت کا تختہ اُلٹنے پر نہ آمادہ ہونا اور مغربی سامراجی طاقتوں کی جانب سے سیاسی اور مالی امداد وغیرہ شامل تھیں۔ لیکن شکست کا سب سے بڑا سبب پارٹی کا داخلی اختلاف تھا۔ لینن نے اس انقلاب کو نومبر ۱۹۱۷ء کے عظیم انقلاب کے لئے "آزمائشی مشق" قرار دیا اس مشق کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ دایئں بازو کے سوشل ڈیموکریٹوں نے بھی انقلاب دشمنی کا سبق سیکھ لیا تھا۔

۱۹۰۵ء کے انقلاب نے پوری عالمی مزدور تحریک پر دور رس اثرات مرتب کیے۔ مشرقی وسطی و بعید کے مظلوم عوام پر بھی اس کے گہرے اثرات نمایاں ہوئے جس کا اظہار اس کے بعد چین، ایران اور ترکی میں قومی آزادی کے انقلابات سے ہوا۔ پیرس کمیون کے بعد یہ پہلا واقعہ تھا جس سے تمام دنیا کے سرمایہ دار حلقے پوری طرح دہل گئے۔ انقلاب کا ایک حتمی اثر یہ ہوا کہ مزدور تحریک میں نظریاتی اختلاف شدید ہو گیا۔ اعتدال پسند زیادہ ٹھوس شکل اختیار کرتے ہوئے دائیں جانب جھکنے لگے۔ اور بایاں بازو ایک قطعی پروگرام اور تنظیم کی طرف مائل ہو گیا۔ انقلاب نے بین الاقوامی تحریک کے لیے متعدد ضروری اسباق مہیا کیے۔ مثلاً اس زمانہ کے حالات میں مسلح بغاوت پر کیونکر عمل ہو سکتا تھا۔ عام سیاسی ہڑتالوں کے طریقے اور نتائج کیا ہو سکتے تھے۔ سوویت کا کردار کیونکر مستقبل کے سماج کی بنیاد بن سکتا ہے۔ ایک ٹھوس اور منضبط پارٹی کی ضرورت کیوں پیدا ہوئی۔ دائیں بازو کے موقع پرستوں نے روسی مزدوروں کی مسلح جدوجہد کو مسخ کر کے پیش کیا اور پورے معاملہ پر یہ کہہ کر پردہ ڈالنے کی کوشش کی کہ مسلح جدوجہد کی طرف رجوع کرنا روسی جاگیرداری نظام کے اوگھڑپن کی نشانی ہے لہٰذا مغربی سرمایہ دار ملکوں پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا کیوں کہ وہاں پر مزدوروں کو حق رائے دہی حاصل ہے۔

پہلی اور دوسری انٹرنیشنل کی پوری زندگی میں یہ مطالبہ بارہا کیا گیا کہ عام ہڑتال کے استعمال کی تصدیق کی جائے لیکن اسے عموماً مسترد کر دیا جاتا رہا۔ بالشویکوں نے اپنی عظیم الشان عوامی سیاسی ہڑتالوں کا مظاہرہ کر کے اس حقیقت کا ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ثبوت فراہم کر دیا کہ اس ابتدائی ہتھیار کی عظیم طاقت مزدوروں کی جدوجہد کی سب سے اعلیٰ شکل ہے۔ چنانچہ عوامی ہڑتالوں کے جذبات تیزی کے ساتھ بہت سے ملکوں میں پھیل گئے۔

نومبر میں آسٹریا کے تمام صنعتی اداروں کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی اور مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں اُن کے حق رائے دہی کا مطالبہ منظور کر لیا گیا۔ عام ہڑتال کا معاملہ دوسری انٹرنیشنل کی بنیادی تنظیم جرمن سوشل ڈیموکریسی کے سامنے آیا تو پارٹی نے اس کی حمایت کی لیکن پارٹی

سے ملحقہ نیشنل ٹریڈ یونین اس کی شدید مخالفت کر رہی تھی۔ یہ اُس رسہ کشی کا نقطہ عروج تھا جو ٹریڈ
یونین عہدہ داروں اور پارٹی کے درمیان کئی سال سے نشوونما پا رہا تھا۔ اس بحرانی کیفیت سے نکلنے
کا یہ طریقہ تلاش کیا گیا کہ فروری ۱۹۰۶ء میں پارٹی کی مرکزی کمیٹی اور ٹریڈ یونین کے جنرل کمیشن
کے درمیان خفیہ اجلاس ہوا جس میں پارٹی کے رہنما اپنا عام سیاسی ہڑتال کا منصوبہ ترک کر دینے
پر راضی ہو گئے۔ بیبل اور کاؤتسکی پر مشتمل پارٹی قیادت کا موقع پرست ٹریڈ یونین افسر شاہی
کے آگے یوں ہتھیار ڈال دینا جرمن سوشل ڈیموکریسی کی تاریخ کا المناک باب ہے اور اس میں
بائیں بازو کی پوزیشن بہت کمزور ہو گئی

دوسری انٹرنیشنل کی ساتویں کانگریس ۱۹۰۷ء میں سٹٹگارٹ (جرمنی) میں منعقد ہوئی
اس کانگریس میں ایک ہزار ڈیلی گیٹ شریک ہوئے۔ ایک بنیادی مسئلہ جو کانگریس کے سامنے
پیش آیا۔ نو آبادیات کا تھا۔ جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں گزشتہ تیس برسوں کے دوران تمام بڑی
طاقتیں وسیع علاقوں پر قابض ہو گئی تھیں۔ تمام ممالک کے سوشل ڈیموکریٹوں نے انتہائی
بے غیرتی سے اپنے سامراجیت پسند سرمایہ دار طبقہ کی نو آبادیاتی پالیسی کی حمایت کی۔ ٹریڈ یونین افسر
شاہی نے فوراً بھانپ لیا کہ سرمایہ دار اس بات کا مخالف نہیں کہ نو آبادیاتی عوام سے نچوڑے
ہوئے بھاری منافع کے کچھ حصہ میں ماہر مزدور اشرافیہ کو بھی چند ٹکڑے دے کر شریک کر لیا
جائے تاکہ منظم مزدوروں کی حمایت حاصل کی جا سکے۔ مارکسیوں کے مسلسل احتجاج کے باوجود
انگلستان کی مزدور تحریک نے انیسویں صدی کے آخری نصف تک برطانیہ کے سامراجی سلطنت
بننے میں کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔ امریکی سوشلسٹوں نے جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ اس کے
مطابق سامراج قطعاً کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یہ چھوٹے اور بڑے سرمایہ داروں کا تنازعہ تھا اور
اور اس سے مزدور طبقہ کو کوئی واسطہ نہیں تھا۔ چونکہ مزدور جو کچھ پیدا کرتے ہیں اس کا صرف
نصف خود خرید سکتے ہیں۔ کانگریس میں ترمیم پسندوں کی جانب سے پیش کی جانے والی اس قرارداد
کے خلاف مارکسی ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے جس کے مطابق "نو آبادیات کی افادیت یا ضرورت

کو خصوصاً مزدور طبقہ کے لئے بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ کانگریس نوآبادیاتی پالیسی کو ہمیشہ کے لئے مسترد نہیں کرتی کیونکہ سوشلسٹ دور میں اس کے ذریعہ تہذیب کے مفاد کا کام لیا جاسکتا ہے،، اس طرح کے تصور کا مطلب رسمی طور پر سامراج کو تسلیم کر لینا تھا بائیں بازو کے عناصر نے "نو سوشلسٹ،، استعماریت کا نو ہین آمیز پیرایہ پسندی کے انداز میں مسترد کر دیا۔ بالآخر کانگریس نے جو ترمیم شدہ قرار داد منظور کی اُس میں سرمایہ داروں کی نوآبادیاتی پالیسی کی قطعی طور پر مذمت تو کی گئی لیکن صنعتی اور سیاسی لحاظ سے پسماندہ عوام کی آزادانہ ترقی کے لئے کوئی واضح امکان پیش نہیں کیا گیا۔

کانگریس میں جنگ کے خلاف چار قرار دادیں پیش کی گئیں۔ سخت بحث و مباحثہ کے بعد لینن اور روزا لکسمبرگ کی پیش کردہ قرار داد منظور کر لی گئی جس کے مطابق "جنگ کی صورت میں ایجی ٹیشن کا رُخ نہ صرف جنگ کے خاتمہ کی طرف ہونا چاہیئے بلکہ مجموعی طور پر اس کا استعمال طبقاتی اقتدار کا تختہ جلد از جلد اُلٹ دینے کے لئے بھی ہونا چاہیئے۔ جنگیں سرمایہ داری کی فطرت میں داخل ہیں۔ ان کا خاتمہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام نہیں مٹا دیا جاتا۔ جنگیں قومی تعصبات کو ہوا دیتی ہیں تاکہ پرولتاری عوام کا دھیان اپنے طبقاتی مسائل پر بین الاقوامی طبقاتی اتحاد کے فرائض سے ہٹ جائے،،

ایسی بہت سی سوشل ڈیموکریٹک پارٹیاں تھیں جن میں جارحانہ وطن پرستی سرایت کئے ہوئے تھی۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی سوشلسٹ پارٹی اس کی ایک بھونڈی مثال تھی۔ انٹرنیشنل کی دونوں کانگریسوں میں تبدیلی وطن کا سوال زیر بحث آیا کئی سال سے ریاستہائے متحدہ کے ٹریڈ یونین حلقوں میں تبدیل وطن کر کے آنے والوں کو روکنے کے لئے بڑا ایجی ٹیشن ہو رہا تھا۔ ہنرمند مزدور اجارہ داری قائم کر کے اپنے مخصوص پیشوں کے اردگرد دیوار کھڑی کر دینا چاہتے تھے۔ ان کے خیالات کا بدترین مظہر ساحل بحرالکاہل پر ان کا نعرہ "چینی چلے جائیں" تھا یہ نعرہ نہ صرف چینیوں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا بلکہ یورپی ملکوں سے آنے والے مزدوروں کے

خلاف بھی استعمال ہوتا تھا ۔ سٹٹگارٹ کانگریس نے امریکی تجویز مسترد کر دی اور ترک وطن کے بارے میں زیادہ معقول تجویز منظور کی ۔ ٹھیکہ پر مزدوروں کی برآمدگی کی مذمت کرتے ہوئے قرارداد نے ان تمام کارروائیوں کو قابلِ مذمت ٹھہرایا جو نسلی یا قومی بنیادوں پر ترک وطن کی آزادی پر پابندی عائد کرتی ہیں ۔ اس نے تجویز کیا کہ تارکین وطن کو منظم کر کے ان کے سماجی اقتصادی اور سیاسی حقوق کی نگرانی کی جائے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ میں کام کرنے والے غیر ملکی ہمیشہ ان مزدوروں کی صف اوّل میں رہے جو اضافہ اجرت، کام کے حالات کو بہتر بنانے، ٹریڈ یونین کی تنظیم اور مضبوط مارکسی سیاسی پارٹی کے قیام کے لئے لڑتے رہے ۔

کوپن ہیگن کانگریس ۱۹۱۰ء اور قوم پرستی کا روگ

دوسری انٹرنیشنل کی آٹھویں کانگریس کے اجتماع کا وقت وہ دور تھا جبکہ اسلحہ کی دوڑ تیز سے تیز تر ہوتی چلی جا رہی تھی ۔ لہٰذا ایک مرتبہ پھر یہ اہم مسئلہ کانگریس میں زیر بحث رہا کہ لڑائی چھڑ جانے پر کیا طرز عمل اختیار کیا جائے اور اسی اثنا میں بڑھتی ہوئی عسکریت پسندی کے خلاف کیونکر محاذ قائم کیا جائے ۔ عام ہڑتال کے مبلغین نے جو ہڑتال کو جنگ کے روکنے کا تریاق سمجھتے تھے حسب دستور پھر اپنا نقطہ نظر پیش کیا ۔ البتہ اس مرتبہ اُن میں خاصی قوت تھی ۔ اُن کی قرارداد کا بیان تھا کہ "خاص طور پر ان صنعتوں میں جو سامان جنگ فراہم کرتی ہیں مزدوروں کی ہمہ گیر ہڑتال اور انتہائی شدید عوامی ایجی ٹیشن موثر ترین حربہ ہے جسے جنگ کو روکنے کے لیے کام میں لانا چاہیئے" ۔ جنگ کے خلاف عام ہڑتال کی تحریک کو اسپین کے حالیہ واقعات سے بھی تقویت ملی جہاں مراکش میں اسپین کی رجعت پسندانہ جنگ کے خلاف بطور خاص عام ہڑتال کا حربہ بہت موثر رہا تھا ۔

دوسری انٹرنیشنل کی تباہی کی بڑی ذمہ دار، یعنی سرمایہ دارانہ قوم پرستی تھی ترمیم پسند رہنما جو مختلف پارٹیوں کے نگراں تھے اپنے قومی تعصبات اور مصلحت کوشیوں کو مزدوروں کے طبقاتی مفاد پر حاوی کرتے رہے ۔ یہاں تک کہ پہلی جنگ عظیم نے تحریک کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا ۔ اس

نے ٹھوس شکل خصوصاً اُس وقت اختیار کی جب آسٹریا کی ٹریڈ یونین تحریک میں قومی اختلافات کا مسئلہ سامنے آیا۔ اُسی زمانے میں لینن نے پیچیدہ قومی مسئلہ کے متعلق پرولتاریہ کی پالیسی وضع کی جو اس کی بڑی کامیابی تھی۔ لینن نے اس مسئلہ کا جو حل پیش کیا وہ دو بنیادی دعووں پر مبنی تھا۔ پہلا یہ کہ روس کے تمام سوشلسٹ بین الاقوامیت کا صحیح جذبہ رکھتے ہوئے ایک سوشل ڈیموکریٹک پارٹی سے منسلک رہیں۔ دوسرا یہ کہ پارٹی اور اس کے اپنے ملکی عوام دیگر مظلوم قوموں کیلئے حق خود ارادیت کا مطالبہ کریں جس میں علیحدگی کا حق بھی شامل ہو۔

سوشل ڈیموکریٹک ترمیم پسند چونکہ خود قوم پرست اور سامراج کے حامی تھے اس لئے انہیں قومی مسئلہ کا یہ بین الاقوامی حل قابل قبول نہ تھا۔ وہ قومیت کے مسئلہ کے مروجہ سرمایہ دارانہ حل کو درہم برہم کرنا مناسب نہ سمجھتے تھے۔ بعض اعتدال پسندوں نے بھی موقعہ پرستوں کا وہ منصوبہ اپنا لیا جو مظلوم عوام کے لئے موجودہ سامراجی ڈھانچہ کے اندر "قومی ثقافتی خود مختاری" کے نام سے گھڑا گیا تھا متعدد قوموں پر مشتمل ریاست ہونے کیوجہ سے آسٹریا اس نظریہ کے اطلاق کی مخصوص سرزمین تھی، اس کا عام اثر یہ ہوا کہ مزدور تحریک میں پھوٹ پڑ گئی مزدوروں میں بدترین قومی تعصبات سر اُٹھانے لگے۔ اس نظریہ نے عملی صورت کس طرح اختیار کی۔ سٹالن اسے بیان کرتا ہوا کہتا ہے، "۱۸۹۶ء تک آسٹریا میں ایک متحدہ سوشل ڈیموکریٹک پارٹی تھی۔ اس سال چیک لوگوں نے لندن کی انٹرنیشنل کانگریس میں جداگانہ نمائندگی کا مطالبہ کیا جو منظور کر لیا گیا، ۱۸۹۷ء کی پارٹی کانگریس میں متحدہ پارٹی توڑ دی گئی اور اس کی جگہ چھ قومی "سوشل ڈیموکریٹک گروپوں" کی ایک وفاقی لیگ وجود میں آئی۔ آخر کار یہ گروپ خود مختار پارٹیوں میں تبدیل ہو گئے۔ ان پارٹیوں نے بتدریج ایک دوسرے سے اپنا تعلق منقطع کر لیا، اس کے بعد ٹریڈ یونینوں کی باری آئی یہ بھی قومی خطوط پر تقسیم ہو گئیں" انٹرنیشنل کیجانب سے اتحاد کی تمام کوششیں بے سود تھیں پھوٹ کا اصل روگ سرمایہ دارانہ قوم پرستی کی صورت میں جڑ پکڑے ہوئے تھا۔

کوپن ہیگن کانگریس میں کارل کاؤتسکی اور کارل لیبخت کے درمیان ایک مشہور مناظرہ ہوا۔ زیر بحث فوری مسئلہ یہ تھا کہ مارکس کا پیش کردہ مزدوروں کا مطلق افلاس کا نظریہ آیا صحیح ہے یا

نہیں۔ کاؤتسکی اس کی صحت کا قائل تھا مگر اسکی نفی کرتا تھا۔ اس نظریاتی چپقلش کے پیچھے جرمن پارٹی میں ترمیم پسندوں کا سب سے طاقتور گروہ کام کر رہا تھا، یہ ٹریڈ یونین افسر شاہی تھی جو بائیں بازو کے پیٹی بورژوا دانشوروں کا وقار ختم کر کے پوری سوشل ڈیموکریٹک تحریک کی قیادت کی خواہش مند تھی۔ کاؤتسکی اس وقت مارکسی اصولوں کے آخری راگ الاپ رہا تھا۔ اس نے پارٹی کو متنبہ کیا کہ وہ کسی احمقانہ حرکت کا ارتکاب نہ کرے اور نہ ہی حکمران طبقہ کو کسی فضول اشتعال انگیزی کا موقعہ دے کر اس کے سیاستدان سوشلسٹوں کے خلاف تشدد پر اتر آئیں۔ لیکن اُس کا یہ نشانہ غلط سمت میں تھا۔ جرمن پارٹی میں یہ خطرہ ہی نہ تھا کہ بایاں بازو والے "احمقانہ بغاوت" برپا کرسکے اصل خطرہ تو یہ تھا کہ دائیں بازو کے زیر اثر ٹریڈ یونینیں اور پیٹی بورژوا ترمیم پسند پارٹی کے مجاہدانہ جذبہ کو قتل کر رہے تھے۔ لینن نے اپنے کتابچہ میں ان برنسٹینی نظریات کی برملا نمائندگی کی کہ سرمایہ داری کے تحت بنیادی طور پر محنت کش عوام کی حالت میں بہتری ہو رہی ہے اور ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ ٹریڈ یونینوں نے ترقی کا راستہ کھول دیا ہے۔

باسیل کانگریس اور جنگ کے خطرات

انٹرنیشنل سوشلسٹ بیورو کو نومبر ۱۹۱۲ء میں باسیل میں خاص اجلاس طلب کرنا پڑا۔ اس کا مقصد مزدور مفادات اور عالمی امن کی حفاظت کے لئے اقدامات اختیار کرنا تھا۔ بڑے سامراجی ممالک اور ان کے طفیلیوں کے درمیان کشیدگی تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ مخصوص بحران جس نے دوسری انٹرنیشنل کی طاقتوں کو یکجا ہونے کا موقعہ فراہم کیا۔ اکتوبر ۱۹۱۲ء میں بلقانی ریاستوں کے درمیان جنگ کی ابتدا تھی۔ اس میں ترکی، یونان، سربیا، بلغاریہ اور مانٹی نیگرو الجھے ہوئے تھے۔ پہلے پہل ان جنگوں کا آغاز ان خطوں میں بسنے والے محکوم عیسائی عوام نے کیا جو اپنے مسلمان

آقاؤں سے آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت ان جنگوں کی حیثیت قومی آزادی کی جدوجہد کی مانند تھی لیکن فوراً ہی اس کا رخ یورپ کی بڑی طاقتوں کی باہمی کھینچا تانی کی طرف مڑ گیا۔

باسیل کانگریس نے ایک منشور شائع کیا جس کا مقصد جنگ بلقان کو پھیلنے سے روکنا اور ہمہ گیر یورپی جنگ کے خطرہ کو ٹالنا تھا۔ کانگریس کو اطمینان تھا کہ "جنگ کے خلاف جدوجہد کرنے پر تمام ملکوں کی ٹریڈ یونین تنظیموں اور سوشلسٹ پارٹیوں میں مکمل ہم آہنگی ہے۔" چنانچہ اس نے ضرورت سے زیادہ رجائیت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے اعلان کیا "حکمران طبقہ کو یہ خوف ہے کہ عالمی جنگ مزدور انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ چنانچہ یہی خوف امن کی لازمی ضمانت ہے۔" باسیل کانگریس میں محض اصلاحات کے ذریعہ انسانیت کے سر پر منڈلاتی ہوئی سامراجی جنگ کے انقلابی اقدامات کی دعوت دی گئی تھی۔ مگر ان الفاظ کو عملی جامہ پہنانے کا بندوبست کیا جاتا تو نتیجہ کچھ اور نکلتا یعنی انسانیت سوز پہلی جنگ عظیم کی سازش کے خلاف پورے یورپ میں ہمہ گیر اور زبردست جوابی کارروائی کا آغاز کر دیا جاتا۔ اس وقت انٹرنیشنل ایک طاقتور تنظیم کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے وقت ۲۲ ملکوں کی ۲۷ سوشلسٹ پارٹیاں، دوسری انٹرنیشنل سے ملحق تھیں۔ ان کے رائے دہندوں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ تھی۔ لیکن اس میں بایاں بازو بہت کمزور اور ناپختہ کار تھا۔ دوسری انٹرنیشنل کا ۲۵ سالہ دور چونکہ سرمایہ داری کی خوشحالی کا دور تھا اس لیے عموماً بائیں بازو کے تنظیمی یا سیاسی طور پر پھلنے پھولنے کے لیے حالات سازگار نہیں تھے۔

پوری انٹرنیشنل میں بائیں بازو کا دل و دماغ روسی بالشویک تھے۔ ان کے پاس بائیں بازو کا وسیع تر پروگرام اور قیادت دونوں چیزیں موجود تھیں۔ جنگ کے آغاز کے وقت تک انٹرنیشنل سوشلسٹ بیورو ٹراٹسکی اور دوسرے منشویکوں کی مدد سے روسی پارٹی کے بالشویک اور منشویک دھڑوں میں اتحاد پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کرتا رہا۔ مگر

خوش قسمتی سے اُسے کامیابی نہ ہوئی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنگ کے آغاز کے وقت کم از کم ایک پارٹی ایسی تھی جس میں یہ قابلیت تھی کہ پرولتاری بین الاقوامیت کے اصولوں کو کو عملی جامہ پہنا سکے۔

پہلی جنگ عظیم

پہلی جنگ عظیم وہ آگ تھی جسے بڑی سرمایہ دار طاقتیں اپنی سامراجی رقابتوں کے ذریعے گزشتہ ایک نسل سے متواتر ہوا دیتی آرہی تھیں۔ سرمایہ داری کی فطرت میں جنگ بھی اسی طرح شامل ہے جس طرح نفع خوری اور دیگر مظاہر اس نظام کا خاصہ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس جنگ میں الجھنے والی تمام حکومتوں نے اپنے لئے عیارانہ اخلاقی جواز ڈھونڈ نکالا تھا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ اپنے قومی تحفظ کی غرض سے لڑ رہی ہیں لیکن اٹل حقیقت یہ تھی کہ یہ جنگ بڑی طاقتوں کے درمیان نوآبادیات، منڈیاں، خام مال اور فوجی اہمیت کے مقامات چھیننے کی ذلت آمیز سامراجی کشمکش کے سوا اور کچھ نہ تھی اس کا مقصد دنیا کو تقسیم کرنا تھا۔ بڑی طاقتوں کو جس شے نے اس قسم کی بندر بانٹ پر اس قدر شدت سے ابھارا، وہ مختلف ملکوں کی انتہائی مختلف رفتار سے ہونے والی صنعتی ترقی تھی جس کی وجہ سے ان کے مابین سیاسی توازن ہمیشہ درہم برہم رہتا تھا۔

جنگ کی ابتداء نے دوسری انٹرنیشنل کو تحفظ امن کی عظیم ذمہ داری سے دوچار کر دیا۔ انٹرنیشنل نے اپنے اجلاس میں متعدد بار اس بات کو دھرایا تھا کہ سوشلسٹ پارٹیاں جنگ کے خلاف نہ صرف ایجی ٹیشن برپا کریں گی۔ بلکہ اس کے لئے آدمی اور روپیہ مہیا کرنے کے خلاف ووٹ دیں گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ "جنگ کی وجہ سے پیدا ہونے والے اقتصادی اور سیاسی بحران کو لوگوں کو متحرک کرنے کے لئے استعمال کریں گی تاکہ سرمایہ دارانہ طبقاتی اقتدار جلد از جلد ختم ہو۔" لیکن جب آزمائش کا نازک موقعہ آیا تو دوسری انٹرنیشنل کی بیشتر پارٹیاں اس سارے عہد و پیمان کو بھول کر قومی بورژوا طبقہ کا

دم چھلہ بن گئیں اور سامراجیوں کے جنگی نعرہ " مادر وطن کی حفاظت" کے پیچھے لگ گئیں اور اپنے اپنے عوام کو سامراجی بوچڑ خانے کی طرف ہانک دیا۔ جنگ کو روکنے میں بڑی ناکامی عالمی مزدور تحریک کے لئے ایک ایسی ہولناک شکست تھی جس کی نظیر نہیں ملتی۔

متعدد پارٹیوں میں اس غداری کی خاص سماجی بنیادیں تھیں۔ اچھی تنخواہ پانے والے ہنرمند مزدور، مزدور عہدیداروں کی وسیع افسر شاہی کے ادارے اور موقعہ پرست ٹٹ پونجیئے بورژوا دانشوروں کی کثیر تعداد جو محض اپنی اپنی ملکی پارٹیوں پر تسلط قائم کرنے کے لئے ان میں شامل ہوئے تھے۔ موقعہ پرستوں کے زیر اختیار دوسری انٹرنیشنل بین الاقوامیت کی جو باریک تہہ چڑھی ہوئی تھی اس بحران نے اسے بورژوا قوم پرستی میں تحلیل کر کے رکھ دیا۔ ۴ اگست بڑی پر آشوب تاریخ تھی۔ اس روز جرمن پارٹی نے ریشتاغ میں جنگ کی حمایت کا اعلان کیا۔ ایک دن پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ سماجی امن بحال رکھا جائے اور مالکوں کے ساتھ ہڑتال نہ کرنے کا معاہدہ کیا جائے۔ لائب نخ اور لکسمبرگ ہی چند ایسے لوگ تھے جو اس کی مخالفت کر رہے تھے۔

صرف روس اور سربیا کی پارٹیوں نے جنگ کی بھرپور مخالفت کی۔ ان کے ساتھ کناڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی پارٹیاں تھیں۔ سوشل ڈیموکریٹک پارٹیوں نے اپنی غداری کو چھپانے کے لئے مارکسزم کی آڑ لی۔ ان کا موقف تھا کہ یہ ایک قومی جنگ ہے اور ان کے عوام کے مفاد کو سخت خطرہ لاحق ہے اس لئے وہ جنگ کی حمایت کرنے میں حق بجانب ہیں۔ یہ حقیقت کہ جنگ میں ایک کروڑ سپاہی مارے گئے، دو کروڑ اپاہج ہو گئے اور کروڑوں افراد محتاجی اور مفلسی کا شکار ہو گئے ان کے لئے یقیناً اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

انسانیت کے اس عظیم قتل عام میں جس سامراج کو آخری فتح حاصل ہوئی وہ امریکی سامراج تھا تاہم اس جنگ میں بین الاقوامی پرولتاریہ تاریخی فاتح کی حیثیت سے ابھر آیا۔ انسانی اور دیگر وسائل کے بھاری نقصانات کے باوجود عالمی مزدوروں نے روسی

مزدور طبقہ سے مل کر جس نے نومبر ۱۹۱۷ء کا عظیم روسی انقلاب برپا کر کے فیصلہ کن ضرب لگائی عالمی سرمایہ داری پر ایسا بھرپور حملہ کیا پھر یہ نظام سنبھالا نہ لے سکا اور نہ ہی آئندہ کبھی لے سکتا ہے۔

دوسری انٹرنیشنل کا آغاز بحیثیت ایک مارکسی تنظیم کے ہوا تھا مگر عالمی سامراج کے عروج سے پیدا شدہ اثرات نے اس کی قیادت کو بدعنوان بنا دیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد دوسری انٹرنیشنل سوشلزم کی طرف بڑھتے ہوئے عالمی مزدوروں کی راہ میں ایک سنگ گراں کی طرح مخالف انقلاب قوت بن کر رہ گئی اس عظیم غداری کے معنی صرف یہ نہیں تھے کہ دوسری انٹرنیشنل سامراجی جنگ کے خلاف مورچہ نہیں لینا چاہتی تھی بلکہ اس نے سوشلزم کی طرف سے اپنا منہ موڑ لیا تھا۔ وہ بورژوا پارلیمانی طریق اور بورژوا ضابطہ پرستی کی پوجا کرتے رہے۔ انھوں نے ضابطہ پرستی کے طلسم کو توڑنے اور بحران کے وقت غیر قانونی تنظیم اور ایجی ٹیشن برپا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

دوسری انٹرنیشنل عالمی سامراج کی ترقی اور پھیلاؤ کے مخصوص دور میں سرسبز اور بارآور ہوئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی خارجہ پالیسی کے بارے میں سرمایہ دارانہ مخاصمت میں بھی اضافہ ہوا اور بورژوا طبقہ کا ترقی پسندانہ رول رجعت پسندی میں تبدیل ہو گیا۔ دوسری انٹرنیشنل کے غلبہ کا دور کم و بیش پر امن ماحول میں پرولتاری فوج کی تشکیل و تربیت کا دور تھا۔ ۱۹۱۶ء سے قبل نسبتاً بہت کم لڑائیاں اور انقلاب ہوئے اور نظام سرمایہ داری میں نسبتاً استحکام رہا۔ لہٰذا انٹرنیشنل نے اپنی توجہ تنظیم اور تعلیم پر منعطف رکھی۔ پچھلی دہائیوں میں مشینوں اور بہتر سرمایہ دارانہ تکنیکوں کے ذریعہ پیداوار میں عظیم اضافہ بھی مزدوروں کا معیار زندگی بلند کرنے میں بہت کم مددگار ثابت ہو سکا۔ اصل منافع سرمایہ داروں کی تجوریوں میں چلا جاتا۔ بیروزگاری، بیماری اور بڑھاپے کی حالت میں کوئی مالی تحفظ نہ تھا وہ بیشتر ابتدائی سیاسی حقوق سے

محروم تھے۔ سوشل ڈیموکریٹوں نے اپنی توجہ انہی برائیاں پر مرکوز رکھی لیکن نظام سرمایہ داری جو ان برائیوں کو پیدا کرنے کا سبب تھا ان کے حملوں سے محفوظ رہا، دوسری انٹرنیشنل نے اجرتوں، کام کے گھنٹے، سماجی تحفظ فیکٹری قانون اور محنت کش مرد اور عورتوں کے حق رائے دہندگی کے بارے میں مالکوں اور حکومت سے بہت سی مراعات حاصل کیں اس کے ساتھ ہی ان کامیابیوں نے بہت سے بڑے سامراجی ملکوں میں بڑے مالکوں کے اس رجحان کو بہت حد تک فروغ دیا کہ مزدور اشرافیہ کو کچھ مراعات دی جائیں تاکہ بحیثیت مجموعی مزدور طبقے کا اتحاد اور انقلابی جذبہ کمزور پڑ جائے بڑھتی ہوئی مزدور تحریک نے حکمران طبقے کو اس بات پر مجبور کر دیا تھا کہ مزدوروں میں بے چینی کو ظالمانہ طریقے پر کچلنے کی پالیسی میں فیاضانہ اعتدال پسندی پیدا کریں۔

دوسری انٹرنیشنل نے منظم مزدور تحریک کی حدود کو وسیع کیا پہلی انٹرنیشنل کا اثر بمشکل مغربی یورپ سے باہر پہنچا تھا لیکن دوسری انٹرنیشنل کا اثر پورے یورپ اور امریکہ کے بہت سے حصوں تک پھیلا پھر بھی بہت سے عظیم نوآبادیاتی اور نیم نوآبادیاتی ممالک ہندوستان، چین، مشرق وسطیٰ، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے بیشتر ملک دوسری انٹرنیشنل کے لئے بند کتاب تھے۔ ان ممالک کے محنت کشوں کو اپنی حقیقی رہنمائی کے لئے تیسری انٹرنیشنل کے ظہور کا انتظار کرنا تھا جو حقیقی معنوں میں پہلی پرولتاری عالمی تنظیم تھی۔

کمیونسٹ انٹرنیشنل ۱۹۱۹ء تا ۱۹۴۳ء

جنگ کے بارے میں موقع پرستانہ غداری نے دوسری انٹرنیشنل کو تنظیمی اور نظریاتی دونوں اعتبار سے انتشار کا شکار بنا دیا۔ دائیں، بائیں اور اعتدال پسند عناصر کے نظریاتی اختلافات جو دوسری انٹرنیشنل میں حقیقت میں کم موجود ہے جنگ کی وجہ سے زیادہ شدید ہو گئے اور بالآخر تین واضح بین الاقوامی تنظیموں کی شکل میں منظر عام

پر آ گئے۔ دائیں بازو نے دوسری انٹرنیشنل کو دوبارہ زندہ کیا، اعتدال پسندوں کی ڈھائی انٹرنیشنل تھی۔ اور تیسری تنظیم کمیونسٹ انٹرنیشنل (کمینٹرن) بن کر سامنے آئی جسے تیسری انٹرنیشنل بھی کہا جاتا ہے۔ دایاں بازو طبقاتی امن اور سامراجی طاقتوں کی پوری پوری امداد کا نقطۂ نظر رکھتے ہیں، اعتدال پسند محض امن کے طلب گار تھے جب کہ بایاں بازو جنگ کے مخالف عوامی جذبہ کو سوشلزم کے لئے انقلابی لڑائی میں تبدیل کرنا چاہتا تھا۔

تیسری انٹرنیشنل روس میں بالشویک پارٹی کی بنیاد پڑتے ہی جڑ پکڑنے لگی تھی۔ جنگ سے قبل کے دور میں مارکس کے ساتھ لینن کی گوناگوں تحریریں اس کے انقلابی نظریہ کی بنیاد تھیں۔ لینن ابتدا ہی سے سمجھ چکا تھا کہ جنگ عظیم میں دوسری انٹرنیشنل کے رہنماؤں کی غداری کے معنی پرولتاریہ کی عالمی تنظیم کی حیثیت سے اس جماعت کی موت تھا لہٰذا اس نے ایک نئی انٹرنیشنل کا قیام اپنا اہم فریضہ سمجھا۔ جنگ کے شروع ہونے پر مرکزی کمیٹی نے لینن کا تحریر کردہ منشور جاری کیا۔ منشور نے جنگ کی سامراجی نوعیت کو طشت از بام کرتے ہوئے اعلان کیا کہ انٹرنیشنل کے رہنماؤں نے جنگ کے مطالبہ زر کی حمایت کرکے اپنے اپنے ملک کے سرمایہ دار طبقہ کا جارحانہ وطن پرستی کا نعرہ اپنا کر جنگ کو جائز قرار دیتے ہوئے اس کی حمایت کرکے اور متحارب ممالک کی بورژوا حکومتوں میں شامل ہو کر سوشلزم سے غداری کی ہے۔ منشور میں ریاست ہائے متحدہ یورپ کی بنیاد پر جرمنی آسٹریا اور روسی شہنشاہیت کے خاتمہ کی تجویز پیش کی گئی (بعد میں یہ نعرہ غلط کہہ واپس لے لیا گیا)۔ پارٹی کے بیان میں کہا گیا کہ "اس وقت تمام ترقی یافتہ ممالک میں روزمرہ کارروائی کا پروگرام سوشلسٹ انقلاب کا نعرہ ہونا چاہیئے"۔

جنگ کی مخالفت میں بالشویکوں کے جرأت مندانہ موقف نے روس میں جبر و تشدد کے دروازے کھول دیئے۔ ڈوما کے بالشویک رکن اور مرکزی کمیٹی کے اراکین حراست میں

لے لئے گئے۔ پراوادا بند کر دیا گیا اور بہت سے پارٹی گروپ توڑ دیئے گئے۔ لیکن پارٹی کی
طاقتیں جلد ہی دوبارہ منظم ہوگئیں۔ دریں اثنا جنگ کی مخالف اٹلی کی سوشلسٹ
پارٹی نے جب محسوس کیا کہ بڑی جماعتیں ایک عمومی مخالف جنگ کانفرنس کرنے پر آمادہ
نہیں ہیں تو اس نے اپنی ذمہ داری پر ستمبر ۱۹۱۵ء میں برن کے قریب ایک گاؤں زمر والڈ
میں عام کانفرنس طلب کر لی۔ کانفرنس میں جنگ کے خلاف مورچہ نہ لگانے پر پرانی قیادت
کی مذمت کی گئی۔

زمر والڈ تحریک کی دوسری کانفرنس اپریل ۱۹۱۶ء میں سوئٹزرلینڈ کے ایک
گاؤں کینتھال میں منعقد ہوئی۔ پہلی کانفرنس کے انعقاد کے بعد سے مخالف جنگ سرگرمیوں
میں اضافے اور جنگ کے خلاف عوام کے بڑھتے ہوئے جذبات کی وجہ سے تحریک نے خاص ترقی
کر لی تھی۔ تقریباً ۲۵ پارٹیاں اور گروپ اس سے ملحق ہو چکے تھے۔ بالشویک گروپ نے
کانفرنس میں جو قرارداد پیش کی اس کے مسودہ میں کہا گیا ہے کہ مزدوروں سے یہ مطالبہ
کیا جائے کہ وہ اپنے اوزار رکھ دیں اور اپنے مشترکہ دشمن یعنی سرمایہ دار کے خلاف صف آرا
ہو جائیں۔ اس تجویز کو کانفرنس کے اعتدال پسندوں اور دائیں بازو کی اکثریت نے مسترد
کر دیا۔ اس کے باوجود کینتھال کانفرنس کی اہمیت یہ تھی کہ اس نے ان بین الاقوامی عناصر کو
ابھرنے میں مدد دی جنہوں نے بالآخر (کیمونسٹ) تیسری انٹرنیشنل کو تشکیل دیا۔

پہلی عالمگیر جنگ کے دوران پیدا ہونے والی عظیم انقلابی جدوجہد میں سب سے
زیادہ اہم عنصر یورپ کی مختلف مظلوم اقوام کا بڑھتا ہوا انقلابی موقف تھا جس نے بالآخر
کچھ عرصہ بعد روس، جرمنی، آسٹریا اور ترکی کی ریاستوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ
دیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے آئرلینڈ کی بغاوت رونما ہوئی۔ انگریزی اقتدار واستحصال
کے خلاف آئرلینڈ کی ۷۰۰ سالہ جدوجہد میں بغاوت کے طویل سلسلے کی یہ تازہ ترین
کڑی تھی۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ کارل مارکس کے لئے آئرلینڈ کی تحریک آزادی

بڑی اہمیت تھی۔ نہ صرف اس لئے کہ یہ مظلوم آئرش عوام کی جدوجہد آزادی تھی بلکہ اس لئے بھی کہ انگریز سرمایہ داری کے خلاف عام جدوجہد میں یہ ایک ہتھیار کی حیثیت رکھتی تھی لیکن باغیوں کی مختصر سی افواج انگلستان کی زبردست فوجی قوت کا مقابلہ نہ کر سکی اور پانچ دنوں میں کچل دی گئیں۔ لینن نے اس دلیر مگر لاحاصل بغاوت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا "وہ محض ایک مہم باز انقلابی کوشش نہ تھی بلکہ حقیقی عوامی تحریک کو پیش کرتی تھی۔ لیکن آئرش لوگوں کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ قبل از وقت اٹھ کھڑے ہوئے جب یورپ میں مزدور طبقہ کی بغاوت کے لئے حالات ابھی پختہ اور سازگار نہ ہوئے تھے" بغاوت کا سرکردہ رہنما جیمز کونامی تھا جو ایک ذہین مارکسی تھا اس کی سب سے بڑی نظریاتی کامیابی یہ تھی کہ اس نے آئرلینڈ میں سوشلزم کی جدوجہد کو قومی آزادی کی لڑائی سے ہم آہنگ کیا۔

روسی انقلاب

جنوری ۱۹۱۷ء میں روس میں ایک طاقتور انقلابی ہڑتالی تحریک کی نشوونما سے دنیا چونک پڑی۔ ۹ مارچ تک باکو، نووگورو، ماسکو اور پیٹروگراڈ کے دو لاکھ مزدور ہڑتال میں شامل ہو چکے تھے۔ ان ہڑتالوں نے عام شکل اختیار کر لی، جبکہ مزدوروں کے جھنڈوں پر لکھا تھا "زار مردہ باد" "جنگ مردہ باد" "ہم روٹی چاہتے ہیں" ۱۲ مارچ کو پیٹروگراڈ کے فوجی دستہ نے لوگوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ شام تک ۶۰ ہزار فوجی مظاہرین کے ساتھ شامل ہو گئے۔ مزدوروں نے جیلوں کے دروازے کھول کر مقید انقلابیوں کو آزاد کر دیا۔ زار تخت سے دست بردار ہو گیا اور ایک عبوری حکومت قائم ہو گئی یہ ایک بورژوا جمہوری انقلاب تھا۔ سیاسی عنان اقتدار سرمایہ دار اور جاگیر دار طبقہ کے ہاتھوں میں منتقل ہو گیا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی بورژوا اقتدار کو بالواسطہ چیلنج بھی نشوونما پا رہا تھا۔ زار کے دست بردار ہونے سے قبل ہی محنت کشوں نے انقلاب ۱۹۰۵ء کے نمونہ پر مزدوروں

اور فوجیوں کی سوویٹ کی تنظیم شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دوسرے سے الجھی ہوئی دو طاقتیں، دو آمریتیں وجود میں آگئیں ایک آمریت تو بورژوازی کی تھی جس کی نمائندگی حکومت کر رہی تھی۔ دوسری تھی پرولتاریہ اور کسانوں کی آمریت جس کی نمائندگی مزدوروں، کسانوں کی سوویٹ کے مندوبین کر رہے تھے۔ اس کا نتیجہ دوہری حکومت کی شکل میں نمودار ہوا۔

بورژوا حکومت کے لئے ابھی سوویٹوں کا وجود اس قابل نہ تھا کہ اُسے کسی قسم کا خطرہ محسوس ہوتا۔ کیونکہ چند ایک کو چھوڑ کر ان سوویٹوں پر منشویکوں اور سوشلسٹ انقلابیوں کا قبضہ تھا جو اس بات پر تیار تھا کہ زمام اقتدار بورژوا کے ہاتھوں ہی میں رہے سوویٹوں پر منشویک اور سوشلسٹ انقلابیوں کے قبضہ کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس عرصے میں بالشویک پارٹی کے رہنما یا تو جیلوں میں تھے یا جلاوطن تھے۔ انقلاب بالشویکوں کی اختیار کردہ سیاسی لائن کی عظیم الشان تائید تھا۔ لینن کا یہ دعویٰ سچ ثابت ہوا کہ دوران انقلاب محنت کش عوام جبریہ بھرتی کے فوجی انقلابیوں کے گرد جمع ہو جائیں گے۔ اس سے دوسری انٹرنیشنل کے رہنماؤں کا یہ عقیدہ باطل ثابت ہوا کہ جدید فوج کے خلاف عوامی بغاوت ناممکن ہے۔ لینن کا یہ دعویٰ بھی حق بجانب ثابت ہوا کہ بورژوا انقلاب میں پرولتاریہ ہی کو رہنمایانہ حیثیت حاصل ہوگی اور زارشاہی کے خلاف لڑائی میں کسانوں کی ایک بڑی تعداد پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے اس طرح منشویکوں کا یہ ترمیم پسند نظریہ بھی غلط ثابت ہوا کہ کسانوں کو مخالف انقلاب عنصر سمجھتے ہوئے انہیں دور رکھا جائے۔ لینن کا یہ عظیم پروگرام حق بجانب ثابت ہوا کہ جنگ کا مقابلہ انقلاب ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

مارچ انقلاب کے پیچھے بڑھتی ہوئی سرمایہ داری کی پھٹ پڑنے والی قوت اور وسعت پذیر پرولتاریہ کارفرما تھے۔ وحشی صنعت نیم جاگیردارانہ استبداد کا شکار روسی

مزدور طبقہ خاص طور پر طبقاتی شعور اور انقلابی جذبہ رکھتا تھا۔ مزدوروں کو گیارہ سے لے کر ۱۳ گھنٹے تک نہایت قلیل اجرت پر کام کرنا پڑتا تھا ان کی زندگی یکسر غلامانہ تھی انہیں صنعتی یا سیاسی طور پر منظم ہونے کا کوئی حق نہیں تھا۔ کسانوں کے ساتھ بھی اسی قسم کا ظالمانہ سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ منظم طریقہ پر ان کی زمینیں چھینی جاتی تھیں۔ ٹیکسوں اور سود خوروں نے انہیں اپنے شکنجے میں لے رکھا تھا حکومت جب چاہتی لاکھوں کی تعداد میں مزدوروں اور کسانوں کو بھرتی کر کے زار شاہی کی جنگی خدمات کے لئے ... جنگ میں موت کے منہ میں جھونک دیتی۔ زار شاہی کے تحت بہت سی قومیں بھی بے انتہا ظلم و تشدد کا شکار تھیں۔

عبوری حکومت کی کلیدی پالیسی تھی کہ روس کو جنگ میں شامل رکھا جائے دریں اثنا حکومت سوویٹیوں کو ناکارہ اور محکوم بنا رہی تھی۔ وہ "دوہری حکومت" کی حالت کو ختم کرنے کے درپے تھی۔ مارچ کے انقلاب کے وقت لینن سوئٹزرلینڈ میں تھا اپنے "پردیس سے خطوط" میں اس نے انقلابی مزدوروں سے کہا "آپ کو جلد یا بدیر سامراجی جنگ کو جاری رکھنے والے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا تختہ الٹنے کے لئے ایک بار پھر اسی طرح کی حیرت انگیز بہادری دکھانے کی ضرورت ہوگی۔ اپریل میں لینن اور دوسرے بالشویک جرمنی کے راستے روس واپس پہنچے۔ وہ غالباً یہ سمجھے ہوئے تھے کہ اس سے جرمن مقصد کو فائدہ پہنچے گا۔ پیٹروگراڈ پہنچتے ہی لینن نے اپنا مشہور اپریل مقالے کا خاکہ پیش کیا اس مقالے نے روس میں بورژوا جمہوری انقلاب کو سوشلسٹ انقلاب میں تبدیل کرنے کے لئے پارٹی کے سامنے جدوجہد کا روشن راستہ پیش کیا مقالے میں مانگ کی گئی کہ زمین کو قومی ملکیت قرار دیا جائے جاگیریں ضبط کی جائیں اور صنعتوں پر مزدوروں کا اقتدار تسلیم کیا جائے۔ وسیع معنوں میں مقالے کی تجویز تھی کہ بورژوا جمہوریت کے مقابلے میں ایک ایسی سوویت جمہوریہ کی طرف قدم بڑھایا جائے جو پرولتاریہ غریب ترین کسان

طبقے پر مشتمل ہو۔اس کا مطالبہ تھا کہ موجودہ فوج کی جگہ عوام کو مسلح کیا جائے اس مقالے
میں لینن نے ایک نیا انکشاف کیا جس نے مارکس ازم کو مالا مال کر دیا وہ اس نتیجہ پر پہنچا
کہ پرولتاری اقتدار کی بہترین سیاسی شکل پارلیمانی جمہوری ریپبلک کی بجائے سوویٹوں کی
جمہوریہ ہے اس دانشمندانہ دریافت نے ملک میں سوویٹ اقتدار کو یقینی بنا دیا۔

مرکزی کمیٹی نے اندرونی کشمکش کے بعد جس میں لینن نے اپنا استعفیٰ پیش کیا تھا
(جو بعد میں واپس لے لیا گیا) بالآخر لینن کے انقلابی اپریل مقالہ پر مہر تصدیق ثبت کر
دی۔ لینن کی پالیسی یہ تھی کہ اس وقت پارٹی کا کام عارضی حکومت کے خلاف جسے اس
وقت سوویٹوں کا اعتماد حاصل تھا، بغاوت کی دعوت دینا نہیں تھا بلکہ وہ چاہتا تھا کہ
نظریاتی تعلیم اور شعور پیدا کر کے سوویٹوں میں اکثریت حاصل کرنے کے بعد حکومت کی بناوٹ
اور پالیسی میں تبدیلی لائی جائے۔ یہ دور انقلاب کی پرامن نشوونما کا دور تھا۔ اپنی
اس پالیسی کی بدولت پارٹی بری و بحری افواج، فیکٹری کمیٹیوں اور ٹریڈ یونینوں
میں تیزی کے ساتھ اپنی جگہ بنانے لگی۔ ۳ر جون تک سوویٹوں کی پہلی کل روس کانگریس
تک بالشویک نسبتاً اقلیت میں تھے لیکن حکومت کے اس فیصلہ پر کہ جولائی میں نئے حملے
کا آغاز کیا جائے عوام کو سخت مایوسی ہوئی اور پارٹی کا اثر تیزی سے پھیلنے لگا۔

حکومت نے اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے اس عظیم عوامی تحریک کو جبر و تشدد
سے دبانے کی ٹھانی۔ عوام کو جمہوری حقوق سے محروم کر کے حکومت نے خانہ جنگی کے لئے
راستہ ہموار کر دیا۔ مزدوروں اور کسانوں کے پاس امن، روٹی اور زمین کے حصول
کا صرف ایک ہی ذریعہ رہ گیا۔ وہ یہ کہ ان مقاصد کے لئے اب ہتھیار اٹھا کر جنگ کی
جائے۔ روس براہ راست عظیم اکتوبر انقلاب کی طرف بڑھنے لگا۔

درین اثنا مارچ کے روسی انقلاب نے عالمی مزدور صفوں میں زبردست ہلچل
پیدا کر دی۔ اس نے عالمی محنت کش عوام میں گہری گرم جوشی پیدا کر دی اور امن کے

بڑھتے ہوئے جذبات میں ہیجان برپا کر دیا۔ جرمنی میں غذائی قلت پر ہنگامے شروع ہو گئے۔ سوشل ڈیموکریٹک پارٹی میں پھوٹ پڑ گئی۔ ریشتاغ میں پورے سوشلسٹ گروپ نے جنگ کے مطالبہ زر پر ووٹ دینے سے انکار کر دیا۔ فرانس میں جنگی صنعتوں میں ہڑتالیں شروع ہو گئیں۔ آخر کار انٹرنیشنل سوشلسٹ بیورو نے اگست ۱۹۱۷ء میں سٹاک ہوم میں اپنی کانفرنس طلب کر لی۔ مجوزہ کانفرنس نے بہت سی سوشلسٹ پارٹیوں کا وسیع تعاون حاصل کیا۔ دوسروں کے علاوہ جرمن فرانسیسی، انگریز اطالوی، روسی اور امریکی پارٹیاں شرکت کرنے پر راضی ہو گئیں۔ لیکن اتحادی حکومتوں نے جن کی فتح کے امکانات روشن ہوتے جا رہے تھے سمجھا کہ یہ کانفرنس ایک ایسی تحریک امن ہے جسے ہارنے والے انگریز چلا رہے ہیں دریں اثنا انٹرنیشنل سوشلسٹ کمیٹی میں زمروالڈیوں نے جن میں اس مسئلہ پر سخت اختلاف تھا کہ اس کانفرنس میں شرکت کی جائے یا نہیں ستمبر ۱۹۱۷ء کو سٹاک ہوم ہی میں اپنی کانفرنس منعقد کی اور اپنے پچھلے فیصلوں کو دوبارہ دھرایا۔ بائیں بازو نے لینن کی سرکردگی میں اعتدال پسندیم کاؤتسکیوں کی شدید مخالفت کی جو اس تحریک کی رہنمائی کر رہے تھے انہوں نے ان رہنماؤں پر الزام لگایا کہ وہ جنگ ختم کرنے کے لئے کسی انقلابی پالیسی کو اختیار کرنے میں ناکام رہے ہیں، دوسری انٹرنیشنل سے تعلق قطع کر کے ایک انقلابی تیسری انٹرنیشنل کی تشکیل سے گریز کرتے رہے ہیں اور دیگر تمام سیاسی سوالات پر الجھن اور قدامت پسندی کا شکار رہے ہیں۔

روس میں جولائی اور نومبر ۱۹۱۷ء کا آزمائشی دور ایک زود رفتار نشوونما اور انقلابی تیاریوں کا دور تھا۔ عبوری حکومت کی جانب سے جنگ بند کرنے سے انکار کسانوں کو زمین دینے سے گریز، شہری حقوق پر پابندیاں جیسی مجرمانہ حرکات کا ثبوت دے کر اپنا سارا اعتماد کھو چکی تھی اس دوران میں مختلف قسم کی عوامی تنظیموں

میں بہت اضافہ ہوا۔ ماسکو اور پیٹروگراڈ کی سوویٹوں میں بالشویک اکثریت میں آگئے۔ فوج میں بالشویک طاقت روز بروز بڑھتی گئی اور ملک کے مختلف حصّوں میں کسانوں نے زمین پر قبضہ شروع کر دیا۔ انقلابی بحران زیادہ سے زیادہ نزدیک آتا گیا۔ جولائی میں پارٹی نے پیٹروگراڈ میں اپنی خفیہ کانگرس منعقد کی۔ اس وقت پارٹی کے دو لاکھ چالیس ہزار ارکان تھے جب کہ مارچ انقلاب کے وقت یہ تعداد صرف ۴۵ ہزار تھی۔ اس کانگرس میں ٹراٹسکی کا چھوٹا سا گروپ، بالشویک پالیسی سے مکمل اتفاق کرنے پر پارٹی میں شامل کر لیا گیا۔

فن لینڈ میں اپنے جبریہ قیام کے دوران لینن نے ایک اور بنیادی مارکسی تخلیق "ریاست اور انقلاب" پیش کی۔ اس عظیم تصنیف نے ریاست کے طبقاتی کردار کی پھر سے توثیق کی۔ لینن نے یہ بھی کہا کہ اس ریاست کو حاصل کر کے مزدور اپنا مقصد پورا نہیں کر سکتے بلکہ اس ختم کر کے اس کی جگہ پرولتاریہ کی آمریت قائم کرنا ناگزیر ہے اس نے پرولتاریہ کی آمریت کے ڈھانچے پر مفصل روشنی ڈالی، دوران تحریر انقلابی بحران کی مداخلت کی وجہ سے لینن اسے مکمل نہ کر سکا اس کی توضیع لینن اس طرح کرتا ہے

"۱۱ اکتوبر ۱۹۱۷ء کے سیاسی حالات کی نزاکت اسے مکمل کرنے میں مانع آئی۔ انقلاب کے تجربوں سے گزرنا اس پر لکھنے سے کہیں زیادہ خوش آئند اور مفید ہے"۔

فن لینڈ سے واپس آنے پر لینن نے انقلابی حالت کے پختہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ پارٹی کی مرکزی کمیٹی میں لینن کو کافی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ کامینف، زینوویف گروپ عموماً بغاوت کا مخالف تھا ٹراٹسکی اس کا التوا چاہتا تھا جس سے انقلاب کی تباہی ناگزیر تھی۔ آخر کار لینن کے نقطہ نظر کی جیت ہوئی مرکزی کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ ۱۰ اکتوبر کو مسلح بغاوت کا آغاز کر دیا جائے مرکزی کمیٹی کے حکم پر پیٹروگراڈ میں ایک انقلابی فوجی کمیٹی منظم کی گئی جو انقلاب کا جنرل ہیڈ کوارٹر (سمولنی) بن گئی ۶ نومبر

کو لینن نے سمولنی میں وارد ہو کر انقلاب کی باگ دوڑ اپنے ہاتھ میں لے لی ۔ ۷ نومبر کو سرخ گارڈ اور انقلابی دستوں نے ریلوے اسٹیشن، پوسٹ آفس، ٹیلگراف آفس وزارتوں اور اسٹیٹ بنک پر قبضہ کر لیا۔ اسی شام سرمائی محل میں عبوری حکومت کے ارکان گرفتار کر لئے گئے۔ انقلاب کامیاب ہو گیا ۔ ۷ نومبر کو رات گئے سوویٹوں کی دوسری کل روسی کانگریس منعقد ہوئی اس وقت تک انقلابی بغاوت کامیابی سے ہمکنار ہو چکی تھی ۔ بالشویک بہت بڑی اکثریت میں تھے ۔ منشویک اور دائیں بازو کے سوشلسٹ انقلابیوں نے مقاطعہ کیا۔ کانگریس نے انہیں دھکے مار کر نکال دیا اور سرکاری طور پر کل طاقت سوویٹوں کو منتقل کرنے کا اعلان کر دیا ۔ لینن عوامی کمیساروں کی کونسل کا چیرمین منتخب ہوا ۔ اس وقت پارٹی ممبروں کی تعداد تین لاکھ تھی اس کے علاوہ سوویٹوں اور ٹریڈ یونینوں کے ذریعہ سے لاکھوں لوگ قریبی ہمدرد اور معاون تھے ۔

اس طرح مزدوروں اور کسانوں نے بین الاقوامی سامراج کی کمزور ترین کڑی کو توڑا اور عالمی نظام سرمایہ داری پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ وہ پھر سنبھالا نہ لے سکا۔ یوں تو لیننی پالیسی کے بہت سے طاقتور اجزا نے متحد ہو کر عظیم فتح کو ممکن بنایا تھا لیکن ان تمام کا مرکزی عنصر لینن کی وہ کامیابی تھی جو اس نے پرولتاریہ اور کسانوں کے درمیان انقلابی اتحاد قائم کر کے حاصل کی ۔ اب لینن اور اس کی پارٹی کو اس سے بھی بڑا سیاسی معجزہ سرانجام دینا باقی تھا اور وہ تھا چھوٹے مالکان زمین کے اس عظیم انبوہ کی قیادت کرتے ہوئے، جس کی نسبت خیال تھا کہ یہ سوشلزم سے مانوس نہیں ہو سکتا، مزدور طبقہ کی عمومی رہنمائی میں بالآخر سوشلزم کی تعمیر کا آغاز ۔

اقتدار پر قبضہ کرنے کے دوسرے دن سوویٹوں کی کانگریس نے امن کا فرمان صادر کر کے شریک جنگ قوتوں سے فوراً التواء جنگ کی تحریک کی ۔ اسی روز کانگریس

نے زمین کا حکم نامہ جاری کر کے جاگیرداری ملکیت کا بلا معاوضہ خاتمہ کر دیا، دریں اثنا مزدوروں نے اپنی شاپ کمیٹیوں کے ذریعہ صنعتوں پر قبضہ کر لیا۔ اقتدار سنبھالنے کے چار دنوں کے اندر آٹھ گھنٹے کام کا دن اور سماجی تحفظ کا نظام قائم کر دیا گیا۔

برطانیہ، فرانس اور امریکہ نے سوویٹ حکومت کی التواء جنگ کی تجویز کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اس پر موخرالذکر نے جرمنی سے علیحدہ امن کی گفت و شنید شروع کر دی جرمنوں نے جنگ کے التواء کے بدلے میں سخت شرائط پیش کیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وفد کے رہنما ٹراٹسکی نے گفت و شنید کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس پر جرمنوں نے روس پر دوبارہ پیش قدمی شروع کر دی۔ روسی فوج موثر مداخلت کے قابل نہ رہی تھی۔ لینن کے اصرار پر جرمنوں کی سخت شرائط مان لی گئیں۔ لینن کا کہنا تھا کہ انقلاب کو دم لینے کا موقعہ ملنا چاہیے ورنہ یہ تباہ ہو جائے گا۔ ٹراٹسکی اور پارٹی میں بائیں بازو کے دوسرے عناصر کے ساتھ تلخ جدوجہد کے بعد لینن کے نقطہ نظر کی جیت ہوئی۔ ورنہ عین ممکن تھا کہ انقلاب ناکام ہو جاتا۔ بورژوا جنگ بازوں اور ان کے ہمنوا سوشل ڈیموکریٹوں نے تمام دنیا میں غیظ و غضب کا طوفان برپا کر دیا کہ بالشویکوں نے مقدس جنگ سے غداری کی ہے۔

کسانوں کو زمین دینے کا فیصلہ بھی لینن کا معرکتہ الآرا کارنامہ تھا۔ اس سے کسانوں کی عظیم اکثریت مستقل مزاجی کے ساتھ انقلاب کی طرف دار ہو گئی ورنہ آنے والے صبر آزما سالوں میں سوویٹ دور کا عہدہ برا ہونا ممکن نہ تھا۔ لینن نے بتایا کہ سوشلزم کی تعمیر کے اس دور میں خوشحال کسانوں سے لڑنا۔ متوسط کسانوں کو غیر جانبدار بنانا اور غریب کسانوں کی عظیم اکثریت کو طرف دار بنانا ازحد ضروری ہے فیصلہ کن اہمیت کا دوسرا فیصلہ ابتدا ہی سے روس میں بسنے والے تمام لوگوں میں سیاسی مساوات قائم کرنا اور حق خود ارادیت کو تسلیم کرنا تھا اس نے اب تک

بُری طرح ستائی جانے والی چھوٹی قومیتوں کی پشت پناہی حاصل کرکے نئی حکومت کیلئے
مزید ٹھوس بنیادیں استوار کیں۔ بسا اوقات بیرونی عالمی، محنت کشوں کو بھی لینن کی
انقلابی پالیسیاں نئی اور عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں سے بہت سی ایسی ہیں جنہیں
بورژوا دنیا میں بسنے والے بائیں بازو کے لوگ نہ سمجھ سکے۔ یہاں تک روزا لکسمبرگ
جیسی سیاسی طور پر ترقی یافتہ رہنما نے اس نئے دور کی "غلطیوں" پر تیز و تند تنقید
کی خصوصاً کسانوں میں زمین کی تقسیم، حق خود ارادیت کا قیام، دستور ساز اسمبلی
کی برخاستگی، مخالف انقلاب پارٹیوں کی شہری آزادیوں پہ پابندی وغیرہ اس
کی تنقید کا نشانہ تھے۔

عالمی سرمایہ داری نے روسی سوشلسٹ انقلاب کو گھریلو روسی رجعت
پرستوں سے کم اپنا جانی دشمن نہیں پایا۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء کے آخر سے لے کر ۱۹۲۱ء کے آغاز
تک روسی انقلابی حکومت کو اپنی بقا کے لئے مخالف انقلاب روسیوں اور مسلح
سامراجی مداخلت کے خلاف سخت خانہ جنگی کا سامنا کرنا پڑا۔ رجعت پرستوں کی
کی منظم فوجوں کے شدید مسلح حملوں کی وجہ سے کشمکش میں مبتلا سوویٹ عہد کا
دفاع عالمی مزدور تحریک کے لئے سب سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ انٹرنیشنل سوشلسٹ
کمیٹی (زمروالڈ) نے اپنے بہت سے بیانات میں مزدوروں کو جنگ میں الجھے ہوئے
سوویٹ یونین کی امداد کے لئے مدعو کیا۔ جنوری ۱۹۱۸ء میں آسٹریا اور جرمنی کے
مزدوروں نے بڑی حد تک روسی انقلاب سے متاثر ہو کر بڑی بڑی ہڑتالیں کیں
برطانیہ میں بھی اس تحریک نے زور پکڑا حتیٰ کہ دور دراز سیٹل اور فلاڈیلفیا میں
بھی لانگ شورمین نے سوویٹ یونین میں مداخلت کرنے والی فوجوں کے لئے جہازوں
میں سامان لادنے سے انکار کر دیا۔

جرمنی اور ہنگری کے انقلابات

انسانوں کے عظیم قتل و غارت گری اور بے پناہ وسائل کی تباہی کے بعد پہلی جنگ عظیم چار بڑی سلطنتوں کی شکست وریخت پر منتج ہوئی زار روس، قیصر جرمنی، شہنشاہ آسٹریا اور سلطان ترکی ایسے مطلق العنان جاگیردار معہ اپنے شاہی نظام کے ختم ہوگئے اس کے ساتھ ہی روس میں سرمایہ دارانہ نظام ملیا میٹ ہوگیا اور اگر دائیں بازو کے سوشل ڈیموکریٹوں نے انتہائی غداری کا ثبوت نہ دیا ہوتا تو مشرقی اور وسطی یورپ میں بھی یہ نظام جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہوتا۔

جب جنگ کا سلسلہ ختم ہوتا ہوا نظر نہ آیا اور خونریزی و مصائب کی وہی گرم بازاری رہی تو جرمنی اور یورپ کے دوسرے مقامات کے مزدوروں میں بغاوت زور پکڑنے لگی۔ ۱۹۱۸ء کے آغاز میں جرمنی میں ہڑتال کی تحریک میں ایک لاکھ سے زائد مزدور شامل ہوگئے پڑوسی ملک روس میں انقلاب کی کامیابی کی عظیم الشان مثال جرمن مزدور طبقہ کو عمل کی طرف راغب کرنے میں زبردست محرک ثابت ہوئی جنگ کے دوران میں دائیں بازو کی غداری سے متاثر ہوکر جرمن سوشل ڈیموکریٹک پارٹی بائیں، مرکزی اور دائیں تین حصوں میں تقسیم ہوچکی تھی۔ دائیں بازو نے پارٹی پریس، تنظیم اور رکنیت کے بیشتر حصہ پر قبضہ کررکھا تھا۔ ٹریڈ یونینیں زیادہ تر انہیں کے کنٹرول میں تھیں۔

وہ چنگاری جس نے شعلہ بن کر جرمن انقلاب کو بھڑکایا۔ ۵ نومبر ۱۹۱۸ء کو کیل میں عظیم جنگی جہاز کے ملاحوں کی کامیاب بغاوت تھی۔ یہ بغاوت جنگل کی آگ کی طرح سارے جرمنی میں پھیل گئی۔ روسی انقلاب کے اثرات بھی فوراً نمایاں ہونے لگے اسی کی پیروی میں باغی مزدوروں، سپاہیوں، اور ملاحوں نے تمام ملک خاص طور پر بڑے شہروں اور اہم فوجی مراکز میں سوویٹیں قائم کردیں۔ قیصر ہالینڈ بھاگ گیا اور جرمنی میں جمہوریہ کا اعلان کردیا گیا۔ اس وقت اگر مزدور طبقہ کو متحد

قیادت نصیب ہوتی تو وہ نہایت آسانی کے ساتھ پرولتاری سوشلسٹ انقلاب کو کامیابی سے ہمکنار کر سکتا تھا۔ لیکن بااثر سوشل ڈیموکریٹک قیادت کو یہ ہرگز منظور نہ تھا۔

۸ تا ۱۵ نومبر کو جب کہ ابھی سڑکوں پر مشین گنوں کی گھڑگھڑاہٹ ہو رہی تھی، برلن میں ایک انوکھی سرمایہ دار مزدور کانفرنس منعقد ہوئی، اس کانفرنس میں تمام سرمایہ کی نمائندگی کروڑ پتی ہیوگو اور تمام مزدوروں کی طرف سے سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کا ٹریڈ یونین رہنما کارل لیجن نمائندہ تھا۔ اس مخالف انقلاب اجتماع پر تکیہ کرتے ہوئے کہ سرمایہ دارانہ نظام بدستور قائم رہے گا اور صنعتوں کو وسیع پیمانے پر اشتراک کے تحت نہیں لایا جا سکتا، کانفرنس نے ایک مفصل اجتماعی معاہدہ سے متعلق کام شروع کیا اور یونینوں کو تسلیم کرنے، آٹھ گھنٹے کام کا دن مقرر کرنے، ورکشاپ کمیٹیوں کے قیام وغیرہ وغیرہ کے شرائط طے کئے، جرمن انقلاب نوعیت کے اعتبار سے بورژوا جمہوری تھا۔ لیکن انقلاب کی موج کے سہارے جو حکومت برسر اقتدار آئی اس کی سربراہی دائیں بازو کے سوشل ڈیموکریٹوں کے پاس تھی۔ وہ انقلاب کو جلد سے جلد روک دینے اور اس کے مزید ارتقاء کا سدباب کرنے کی فکر میں تھے واقعہ تو یہ ہے کہ یہ حکومت سرمایہ داروں اور امراء کے مفادات کا تحفظ کرتی رہی اگرچہ اس نے اپنے سے پہلے والی حکومت سے قدرے مختلف حربے استعمال کئے۔ اس نے رجعت پرست فوجی حلقوں کے ساتھ معاہدہ کیا اور انقلابی فوجی دستوں کے ہتھیار اتروا لینے کی کوشش کی۔ بیشتر انقلابی مزدور رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا اس سب کے جواب میں ۵ جنوری ۱۹۱۹ء کو برلن کی پرولتاریہ نے مسلح بغاوت کر دی، بغاوت کی تیاری کافی اور مناسب نہیں کی گئی تھی حکومت نے فوج اور رجعت پرست دستے بھیج کر اسے بے رحمی سے کچل دیا۔ جرمن مزدور طبقہ کے رہنماؤں کارل لیبکنخت اور روزا

لکجمبرگ کو قتل کر دیا گیا۔ مارچ میں پھر سے شدید لڑائی چھڑ گئی لیکن ایک بار پھر پرولتاریہ کو شکست ہوئی۔

ان تمام شکستوں کے باوجود ۱۹۱۹ء کے موسم بہار میں جرمنی میں پے در پے بہت سی اہم ہڑتالیں ہوئیں اس بار انقلابی تحریک باویریا میں شروع ہوئی اپریل میں باویریا کے دارالحکومت میونخ میں مزدوروں نے اقتدار اپنے قبضے میں لے لیا اور سوویت جمہوریہ کا اعلان کر دیا۔ لیکن ایک لاکھ سپاہیوں پر مشتمل رجعت پرست افواج یکم مئی کو میونخ میں داخل ہوئیں اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، یوں باویریائی سوویت جمہوریہ کا خاتمہ ہو گیا۔

جرمن انقلاب کی ناکامی نے پہلی جنگ عظیم کے بعد سوشلزم کو پورے یورپ میں نہ سہی پھر بھی اس کے بہت بڑے حصے میں پھیلنے سے روک دیا گیا۔ جرمن انقلاب عالمی سرمایہ داری پر ایسی کاری ضرب ہوتی کہ دنیا کی حالت بدل جاتی، چنانچہ عالمی فاشزم کا ابھار، دوسری عالمی جنگ کا قتل عام اور دوسری سماجی برائیاں جو دقیانوسی نظام سرمایہ داری کی توسیع کے سبب نوع انسانی پر آئیں ان سب کی مجرمانہ ذمہ داری بڑی حد تک دائیں بازو کے سوشل ڈیموکریٹوں کے کاندھوں پر ہے۔ جرمن انقلاب کی شکست میں اور بھی بہت سے عوامل کارفرما تھے۔ جرمن بورژوا طبقہ نسبتاً زیادہ طاقتور اور لڑنے کے زیادہ قابل تھا روسیوں کی بہ نسبت جرمن مزدور بورژوائی فریب کے زیادہ شکار تھے پھر بھی انہیں اگر موثر رہنمائی ملتی تو انقلاب میں کامیابی ہو جاتی۔ انقلاب کی ناکامی میں دوسرے اسباب کے ساتھ ساتھ کمیونسٹ پارٹی کی نظریاتی اور تنظیمی کمزوری کا بھی ہاتھ تھا پارٹی اس قدر طاقت ور نہ تھی کہ اس وقت کی پیش آمدہ بہت سی مشکلات میں مزدور طبقہ کو متحرک کر سکتی اور قیادت کے فرائض انجام دے سکتی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ہونے والی عظیم انقلابی ہلچل نے آسٹرو ہنگری سلطنت کے پرخچے اڑا دیئے۔ اس سلطنت میں جو آج صرف آسٹریا کی مختصر سی ریاست پر مشتمل ہے، پولینڈ، چیک، سلوواک، سربیا، مانٹی نیگرو، کروٹ اور ہنگری کی قومیں شامل تھیں، جنہوں نے سلطنت سے اپنا تعلق منقطع کر کے خود مختار بورژوا جمہوریتیں قائم کر لیں۔ ہنگری میں انقلابی ہلچل بورژوا مرحلہ تک پہنچ کر ختم نہیں گئی بلکہ قطعی طور پر سوشلسٹ انقلاب کی جانب بڑھتی گئی۔ سیاسی و اقتصادی افراتفری کی وجہ سے بورژوا جمہوری حکومت کو مارچ ۱۹۱۹ء میں ایک ایسی حکومت کے سامنے جھکنا پڑا جو سوشل ڈیموکریٹوں اور کمیونسٹوں کے اتحاد پر مبنی تھی اس نئی حکومت کا اصل سربراہ اس کا وزیر خارجہ بیلاکن ایک کمیونسٹ تھا۔

لیکن سامراجی طاقتوں کو یورپ کے وسط میں ایک سوشلسٹ ریاست کسی طرح بھی گوارا نہیں تھی۔ اتحادی طاقتوں کے براہ راست فوجی دباؤ کی وجہ سے اگست ۱۹۱۹ء میں جمہوریہ کا تختہ الٹ دیا گیا۔ ہنگری کے سوویٹ دور کی مختصر سی زندگی میں حکومت کے رہنماؤں نے پالیسی کے تعین میں جو خطرناک غلطیاں کیں ان میں سب سے زیادہ اہم سوویٹ روس کی پیش کردہ مثال کے باوجود کسانوں میں زمین تقسیم کر کے انھیں انقلابی جدوجہد میں شامل نہ کرنا تھا۔ علاوہ ازیں لینن کی دانشمندانہ حکمت عملی کو نظر انداز کرتے ہوئے انہوں نے اتحادیوں سے سمجھوتہ نہ کر کے امن قائم کرنے کا موقعہ ہاتھ سے کھو دیا۔ صنعتوں اور تجارت کو قومیانے میں بھی انہوں نے جلد بازی اور ناعاقبت اندیشی کا ثبوت دیا۔ قیادت کی ان خطرناک غلطیوں کے ساتھ ساتھ جن منفی قوتوں نے پورے وسطی یورپ میں جدوجہد کو نقصان پہنچایا، ان میں انقلاب جرمنی میں دائیں بازو کے سوشل ڈیموکریٹوں کی غداری کے مضرت رساں اثرات، آسٹروی سوشلسٹ پارٹی کا ہنگری کے باشندوں کی مدد نہ کرنا، ہنگری کی مزدور

تحریک کی کمزوری، کمیونسٹ قیادت کی ناتجربہ کاری اور اتحادیوں کا مسلح قوت کے ساتھ ہنگری میں کمیونزم کو بے دردی سے کچلنا خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ اگست ۱۹۱۹ء کو ہنگریائی سوویت جمہوریہ ۱۳۳ دن کی جانبازانہ مزاحمت کے بعد ہار گئی۔

یورپ میں انقلابی تحریک

روس میں سوشلسٹ انقلاب کی فتح نے فرانس کی انقلابی تحریک کو زبردست تقویت پہنچائی۔ فرانسیسی مزدوروں نے معاشی میدان میں اپنے مطالبات مثلاً کام کرنے کے بہتر حالات، اجرت کی بلند تر شرح، آٹھ گھنٹے کے کام کا دن وغیرہ کے علاوہ وسیع تر سیاسی مطالبات کے لئے بھی پرعزم جدوجہد کی۔ انھوں نے سوویت روس میں مسلح مداخلت کو فوراً بند کرنے، مسلح افواج کو توڑنے اور سیاسی قیدیوں کو عام معافی دینے کا مطالبہ کیا۔ ۱۹۱۹ء میں بحیرہ اسود میں فرانسیسی جنگی جہازوں کے جہازیوں نے بغاوت کرتے ہوئے سوویت جمہوریہ کے خلاف ہتھیار اٹھانے سے انکار کر دیا۔ اسی سال یوم مئی کے موقع پر ۵ لاکھ افراد کا اجتماع حکومت کے خلاف مظاہرے میں تبدیل ہو گیا۔ مزدوروں کی عظیم الشان جدوجہد کے نتیجے میں فرانسیسی حکومت اُن کے بعض مطالبات تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئی مثلاً آٹھ گھنٹے کے کام کا دن، اجرتوں میں اضافہ اور ٹریڈ یونینوں کے لئے وسیع تر اختیارات۔

۲۰-۱۹۱۸ء کی فرانسیسی مزدور تحریک کا کمزور پہلو ایک موثر انقلابی لیڈرشپ کے فقدان میں مضمر تھا۔ سوشلسٹ پارٹی کے اندر بائیں بازو کی جماعتیں بن گئی تھیں لیکن وہ کافی مضبوط نہیں تھیں اور آپس میں تعاون نہ کر سکیں۔ صرف دسمبر ۱۹۲۰ء ہی میں یہ ممکن ہوا کہ سوشلسٹ پارٹی کانگریس میں مندوبین کی اکثریت نے آخرکار کمیونسٹ پارٹی قائم کی۔

اسی اثنا میں انقلابی تحریک سے عام لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لئے فرانسیسی بورژوازی نے قوم پرستانہ جذبات پیدا کرنے کے لئے وسیع تر مہم چلائی، جرمنی پر فتح کو اس طرح استعمال کیا گیا کہ یہ تحریک جلد ہی بڑھ کر جنگجو قوم پرستی میں تبدیل ہو گئی۔ دائیں بازو والوں سے لے کر ریڈیکلوں تک کی ساری بورژوا پارٹیاں ایک "قومی بلاک" میں سمٹ آئیں۔

۱۹۱۹ء ۱۹۲۰ء کے برسوں میں اٹلی میں بھی انقلابی تحریک میں بے مثال ابھار آیا۔ جب اطالوی بورژوازی نے باقاعدگی کے ساتھ اجرتیں کم کرنے کی کوشش کی تاکہ جنگ کا خرچ مزدوروں کو اٹھانا پڑے تو اسے پر عزم مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ہڑتالی تحریک میں زبردست اضافہ ہوا یہاں تک کہ ۱۹۲۰ء میں ۲۲ لاکھ مزدور ہڑتال پر تھے۔ یہ انقلابی جوش دیہی اضلاع میں بھی پھیل گیا۔ ملک کے جنوب میں اور سسلی میں مسلح کسانوں نے اشراف کی زمینوں پر قبضہ کرنا اور انہیں آپس میں بانٹنا شروع کر دیا اس دور میں اٹلی کے مزدوروں کے دوسرے انقلابی اقدامات سے بڑھ چڑھ کر یہ اقدام تھا کہ اگست اور ستمبر ۱۹۲۰ء میں انہوں نے صنعتی کارخانوں پر قبضہ کر لیا۔ اٹلی کے شمال میں میلان، تورین اور دوسرے شہروں میں کوئی تین ہفتے تک عملی طور پر سارے اہم کارخانے مزدوروں کے قبضے میں رہے۔

۱۹۲۰ء کے موسم خزاں میں یوں لگتا تھا جیسے اٹلی کا پرولتاریہ سوشلسٹ انقلاب کے دھانے پر کھڑا ہے حکومت اور بورژوازی پر بوکھلاہٹ طاری تھی "تاہم جب فیصلے کی گھڑی آئی تو مزدور طبقہ نے دیکھا کہ اس کے پاس مناسب انقلابی لیڈر شپ نہیں تھی۔ سوشلسٹ پارٹی کے اندر اکثریت نے مزدوروں کی جنرل کنفیڈریشن آف لیبر میں قیادت اصلاح پسند لیڈروں کو سونپ کر خود الگ ہونے کا فیصلہ کیا ان اصلاح پسندوں نے بورژوازی سے سمجھوتہ کر لینے کو ترجیح دی، مزدور طبقے کی

شکست نے فاشسٹ یلغار کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء میں فاشسٹوں نے مسولینی کی قیادت میں اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ فاشزم کا مقابلہ کرنے والی واحد موثر قوت اطالوی کمیونسٹ پارٹی تھی جس کی رہنمائی گرامچی اور تولگیاتی کر رہے تھے۔ لیکن اس طبقاتی جدوجہد میں طاقتوں کا توازن اس کے حق میں نہیں تھا اور وہ ایک فاشسٹ ڈکٹیٹر شپ کے قیام کو نہ روک سکی۔

جنوری ۱۹۱۸ء میں فن لینڈ میں مزدوروں نے انقلاب برپا کر دیا اور اقتدار اپنے قبضے میں لے لیا اس کے باوجود کہ فنش مزدور جمہوریہ کا وجود صرف تین مہینے بعد ختم ہو گیا مگر فن لینڈ اور بین الاقوامی مزدور تحریک کے لئے اس کی اہمیت بہت حقیقی تھی کیونکہ روس کے بعد فن لینڈ دنیا کا پہلا ملک تھا جہاں ریاستی اقتدار عوام کے ہاتھوں میں پہنچ گیا تھا۔ ۱۹۱۸ء اور ۱۹۱۹ء کے دوران تھرانیہ لاتویہ اور الیتوینیہ میں بھی سوویت جمہوریتیں قائم ہو گئیں لیکن اندرونی اور بیرونی انقلاب دشمن قوتیں ان تحریکوں کو کچلنے میں کامیاب رہیں۔

فتح مند روسی پرولتاریہ کے انقلابی نعروں کو پولینڈ، چیکوسلوواکیہ بلغاریہ، آسٹریا، یوگوسلاویہ اور اسپین کے مزدوروں نے بھی اپنا لیا یورپ کے پورے براعظم میں انقلابی لڑائیاں لڑی جا رہی تھیں جو اکتوبر ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب سے شروع ہوئی تھیں۔ اگرچہ ان کی صورت اور پیمانے کا تعین متعلقہ ملک کے قومی کردار اور اس کے معاشی و سیاسی ارتقاء کی سطح نے کیا تھا۔

کمیونزم کے بعض مخالفین یہ دلیل دیتے ہیں کہ اکتوبر انقلاب تاریخ کے اتفاقات میں سے ہے۔ ان کے نزدیک روس کا انقلاب مارکس اور اینگلز کی تھیوری کے خلاف ہے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ سب سے پہلے سوشلزم ترقی یافتہ ملکوں میں آئے گا جب کہ روس ایک پسماندہ زرعی ملک تھا اور وہ سوشلسٹ انقلاب کے لئے بالکل تیار

نہیں تھا۔ اگر مارکسی نظریہ کا جائزہ لیا جائے تو نہ تو مارکس نے اور نہ ہی اس کے پیروکاروں نے کبھی یہ سوچا ہے کہ ہمیشہ کے لئے مختلف ملکوں میں انقلاب برپا ہونے کی کوئی ترتیب مقرر کر دی جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ مارکس کا خیال تھا کہ غیر اجارہ دارانہ سرمایہ دارانہ نظام میں انقلاب پہلے زیادہ ترقی یافتہ ملکوں برطانیہ اور فرانس میں آئے گا۔ جہاں پر سوشلسٹ انقلاب کے لئے مادی بنیادیں زیادہ پختہ ہیں۔ مختلف ممالک میں انقلاب کے معروضی حالات اور داخلی عمل ایک ساتھ ترقی نہیں کرتے اسی وجہ سے مختلف ملکوں میں انقلابی جدوجہد کی رفتار بھی مختلف ہے۔ اگر انیسویں صدی کے پہلے نصف میں یہ مرکز برطانیہ میں تھا تو بعد میں یہ فرانس اور پھر جرمنی میں منتقل ہو گیا لینن کے مطابق کسی ملک میں سوشلسٹ انقلاب کی پیش قدمی کا اندازہ صرف اس کی معاشی ترقی کی سطح سے ہی نہیں لگایا جاتا بلکہ اس کا انحصار سب سے پہلے اس معاشرے میں ہونے والے طبقاتی ٹکراؤ کی شدت پر ہے۔

بہت سے رجعت پسند لینن سے یہ بات منسوب کرتے ہیں کہ پسماندگی انقلاب میں فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے لینن ازم کبھی ملک کی پسماندگی کو انقلاب کے لئے شرط کے طور پر تسلیم نہیں کرتا۔ انقلاب آنے کے لئے ضروری ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے اندر ترقی کرتی ہوئی پیداواری قوتوں اور ٹوٹتے ہوئے پیداواری تعلقات کے درمیان ٹکراؤ شدید تر ہو۔ اس کے لئے سرمایہ دارانہ نظام کو ایک خاص حد تک ترقی کرنا ہوتی ہے۔

بین الاقوامی تحریک آزادی پر روس کے پرولتاری انقلاب کا اثر صرف براعظم یورپ تک ہرگز محدود نہیں تھا۔ یہ اثر ایشیا اور لاطینی امریکہ پر بھی اگر زیادہ نہیں تو اتنا ہی گہرا تھا۔ جن ممالک میں اکتوبر انقلاب کا نظریاتی اثر طبقاتی جبر و استبداد کے خلاف عام مزاحمت کا موجب بنا ان میں جاپان سرفہرست تھا۔

جہاں یہ عام مزاحمت "چاول والے فساد" کے نام سے مشہور ہوئی۔

ان بغاوتوں کا فوری سبب یہ تھا کہ شہری علاقوں میں چاول کی کمی تھی اور اس کی قیمتیں بے انتہا بڑھتی جا رہی تھیں۔ بڑھتی ہوئی صنعتی آبادی کی بڑھتی ہوئی مانگ کے باوجود چاول کی پیداوار میں اضافہ نہیں ہو رہا تھا۔ حکومت زمینداروں کے مفادات کی حفاظت کرنے پر تلی ہوئی تھی اس نے درآمدی چاول سے محصل اٹھانے سے انکار کر دیا۔ جس کی وجہ سے بڑے بیوپاریوں کو قیمتوں میں اضافے کا موقع مل گیا۔ چاول والے فسادات شروع میں تو تاجروں کی حرکتوں کے خلاف تھے جن میں تقریباً ایک کروڑ افراد نے حصّہ لیا۔ لیکن جلد ہی ان فسادات نے شہری علاقوں میں سرمایہ داروں کے خلاف اور دیہات میں زمینداروں کے خلاف اقدامات کی نوعیت اختیار کر لی کر لی۔ فسادات کے بیساختہ کردار اور مزدوروں میں تنظیم کی کمی وجہ سے فسادات کی مدت بہت مختصر رہی۔ سن یاکتاما نے انہیں جاپانی پرولتاریہ کی پہلی طبقاتی لڑائی قرار دیا۔ جس نے ملک کے استحصالی طبقوں میں کھلبلی مچا دی۔ بعد کے برسوں میں جاپان بے شمار ہڑتالوں کا میدان بن گیا جن میں لاکھوں مزدوروں نے حصّہ لیا۔ ساری صنعتوں میں ٹریڈ یونینیں منظم کی جانے لگیں۔ جولائی ۲۲ ۱۹ء میں مختلف مارکسی جماعتوں کی ایک غیر رسمی کانگریس نے کمیونسٹ پارٹی کی تشکیل کا اعلان کیا جاپانی رجعت پرستوں نے جو کمیونسٹ خیالات کے عام ہو جانے سے بہت ڈرتے تھے اس پر زبردست حملے شروع کر دیئے۔

انقلابی خیالات کے بحر اوقیانوس پار کر کے ریاست ہائے متحدہ امریکہ پہنچنے میں زیادہ دن نہیں لگے۔ عالمی سرمایہ داری کے اس گڑھ کے حکمران حلقوں نے جنگ میں بے انتہا منافع کمایا تھا اور اب وہ اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ مابعد جنگ کی دنیا میں اپنے اثر کو مضبوط تر کریں۔ امریکی مزدوروں نے بندرگاہوں پر

وہ سامان جہازوں پر لادنے سے انکار کر دیا جو روس میں مخالف انقلاب قوتوں کیلئے بھیجا جا رہا تھا جنگ عظیم ختم ہو چکی تو سرمایہ داروں نے پرولتاریہ پر حملہ کرنے کی کوشش کی مزدوروں نے اس کے جواب میں زبردست ہڑتالی تحریک چلائی ۱۹۱۹ء میں ۶۰ لاکھ سے زائد محنت کشوں نے ہڑتال کی فولاد کی صنعت میں ہڑتال ۱۰۰ دن تک چلتی رہی۔ اس کی راہنمائی امریکی مزدور طبقے کے مجاہد رہنما ڈبلیو فاسٹر کر رہے تھے جو بعد میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی کمیونسٹ پارٹی کے صدر ہوئے ان طبقاتی لڑائیوں نے وہ حالات پیدا کرنے میں معاونت کی جو کمیونسٹ پارٹی کی تشکیل کے لئے ضروری تھے لیکن امریکی مزدور تحریک میں بائیں بازو کی قوتوں کے ارتقاء نے اپنا ایک مخصوص انداز اختیار کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بیک وقت دو پارٹیاں بن گئیں۔ پروگرام کے معاملے میں دونوں میں کوئی بڑا اختلاف نہیں تھا اس لئے ۱۹۲۱ء میں دونوں مل کر ایک ہو گئیں۔

کمیونسٹ انٹرنیشنل کی تخلیق

جیسے جیسے طبقاتی لڑائیوں میں اضافہ ہوا ویسے ویسے بہت سے ملکوں میں کمیونسٹ پارٹیاں وجود میں آنے لگی تھیں۔ لیکن مغربی ملکوں میں یہ پارٹیاں چونکہ سوشل ڈیموکریٹک پارٹیوں اور ٹریڈ یونینوں میں پیدا ہونے والے بائیں بازو کے عناصر نے بنائی تھیں اس لئے وہ ابتداء میں نظریاتی اور تنظیمی طور پر بہت کمزور تھیں ان کے رہنماؤں کی عملی سرگرمیوں میں اکثر اہم غلطیاں ہو جاتی تھیں جو خاص طور سے تنگ نظری کی نوعیت کی ہوتی تھیں۔ اس طرح کی غلطیوں کو انقلاب دشمن عناصر انقلابی تحریک کو کچلنے کی غرض سے انتہائی چابکدستی کے ساتھ استعمال کرتے تھے

ان حالات نے ایک بین الاقوامی کمیونسٹ تنظیم کی تشکیل کو فوری ضرورت کا معاملہ بنا دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ بالشویکوں کی پارٹی جیسی سچی انقلابی پارٹیوں کے بغیر جو نظریاتی اور سیاسی اعتبار سے مارکسی لیننی نظریے سے مسلح ہوں کوئی سوشلسٹ

انقلاب کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اور اُس وقت جو حالات تھے ان میں اس وقت تک فتح حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ جب تک یہ پارٹیاں ایک واحد بین الاقوامی کمیونسٹ تنظیم میں متحد نہ ہوں۔ لینن کی پیش قدمی پر ۲ مارچ ۱۹۱۹ء کو ماسکو میں یورپ ایشیا اور امریکہ کے تیس ملکوں کی کمیونسٹ پارٹیوں اور بائیں بازو کے گروہوں کے نمائندے جمع ہوئے اور کمیونسٹ انٹرنیشنل کے قیام کا اعلان کیا۔ کمنٹرن (جیسا کہ کمیونسٹ انٹرنیشل کو کہا جانے لگا) کا قیام عالمگیر اہمیت کا فیصلہ تھا۔ یہ ایک نئے قسم کی بین الاقوامی پرولتاری تنظیم تھی۔

مغرب میں عام انقلابی تحریک سے ڈر کر سوشل ڈیموکریٹک پارٹیوں کے دائیں بازو کے رہنماؤں نے فروری ۱۹۱۹ء میں دوسری انٹرنیشنل کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی جس کا شیرازہ ۱۹۱۴ء میں بکھر چکا تھا۔ یہ کمیونسٹ انٹرنیشنل کی تشکیل کو روکنے کی کوشش تھی۔ لیکن ان کا مقصد پورا نہ ہوسکا۔ تیسری انٹرنیشنل نے ساری دنیا کی انقلابی قوتوں کی جانب سے اعلان کیا کہ عالمی مزدور تحریک کا نصب العین سوشلزم اور کمیونزم کی فتح ہے اور پرولتاریہ کی آمریت اس فتح کو حاصل کرنے کا وسیلہ ہے۔

سرمایہ داری کی جزوی پائیداری

دنیا میں اتنی شدید طبقاتی لڑائیاں کبھی نہیں ہوئی تھیں جتنی کہ ۱۹۱۷ء اور ۱۹۲۳ء کے درمیان ہوئیں پھر بھی ۱۹۲۳ء کے ختم ہوتے ہوتے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ انقلابی لہر اترنے لگی ہے۔ مشرق و مغرب کے ملکوں میں انقلابی جوش اتنا طاقت ور ثابت نہ ہوا کہ وہ سامراجیت کے غلبے کو ختم کر سکے بہت سے یورپی ملکوں میں مزدور طبقہ نے اقتدار پر قبضہ تو کر لیا لیکن اسے اپنے قبضے میں نہ رکھ سکا قوتوں کا توازن صریحی طور پر یورپی اور امریکی بورژوازی کے حق میں تھا۔ پرولتاریہ کی

شکست کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام کو بچانے کی لڑائی میں بورژوازی کو مختلف سوشل ڈیموکریٹک پارٹیوں اور اصلاح پسند ٹریڈ یونینوں کے دائیں بازو سے بھی کافی مدد ملی۔ جن کا اثر عام لوگوں میں اب بھی کافی تھا یہ حقیقت بھی کم نقصان دہ نہیں تھی کہ مغرب میں جب انقلابی تحریک شروع ہوئی تو کمیونسٹ پارٹیاں ابھی وجود نہیں رکھتی تھیں۔ بعض بڑے ملکوں میں وہ اس وقت بنیں اور زور پکڑنا شروع کیا جب انقلاب کی لہر کا اتار شروع ہو چکا تھا۔ دنیا دو مختلف سماجی نظاموں میں بٹ چکی تھی۔ ان کے درمیان جدوجہد اب اپنے دوسرے دور میں داخل ہو رہی تھی

۱۹۲۴ء تک سرمایہ داری کی جزوی پائداری کا دور شروع ہو چکا تھا جو ۱۹۲۹ء تک چلتا رہا اس مدت میں سرمایہ دار ملکوں نے مابعد جنگ کے معاشی بحران پر قابو پا لیا اور اپنی مجموعی پیداوار ۲۵۔۲۶ فیصد بڑھالی۔ لیکن یہ پائداری محض عارضی تھی۔ ایک طرف تو ۱۹۲۹ء تک ریاست ہائے متحدہ امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی اٹلی اور جاپان کی مجموعی پیداوار سے بھی آگے نکل گیا۔ دوسری طرف بعض ملکوں مثلاً برطانیہ کی معیشتیں امن پوری مدت میں عملی طور پر جامد و ساکت رہیں۔ ۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۹ء کے پائداری کے دور کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس وقت بھی ساری سرمایہ دارانہ ریاستیں زراعت میں بحران پر قابو نہ پا سکیں۔ اس عرصے میں سرمایہ دارانہ ملکوں میں داخلی سیاسی صورت حال بھی کچھ بہتر ہوئی۔ بورژوازی نے پہلے محنت کش عوام کے مظاہروں سے نمٹنے کے لئے جس تشدد اور خونریزی کا سہارا لیا تھا۔ اُسے زیادہ تر ملکوں میں ترک کر دیا گیا اور ان کی جگہ اپنا غلبہ برقرار رکھنے کیلئے نام نہاد بورژوا جمہوری طریقوں کو اپنایا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس پورے دور میں مزدور طبقے نے استحصال کی مزاحمت کرنے اور کام کرنے کے بہتر حالات اور بلند تر معیار زندگی کے لئے جدوجہد کرنا ایک لمحے

کے لئے بھی ترک نہیں کیا۔ برطانیہ میں قدامت پسند حکومت کی مزدور دشمن پالیسی کے نتیجے میں کانکنوں کی ہڑتال ہوئی جو مئی ۱۹۲۶ء میں بڑھ کر عام ہڑتال بن گئی جس میں تقریباً ۶۰ لاکھ مزدوروں نے حصّہ لیا۔ یہ برطانیہ کی تاریخ میں مزدوروں کا سب سے بڑا منظم اقدام تھا جس کے اثرات ساری دنیا میں محسوس کئے گئے۔ عام ہڑتال ختم ہونے کے بعد بھی کانکنوں نے اپنی ہڑتال مزید سات مہینے جاری رکھی۔

کچھ پارٹیوں میں پیٹی بورژوا انقلابیت اپنی جڑیں بنا رہی تھی۔ ان "انقلابیوں" نے اس حقیقت کو قابل توجہ نہیں سمجھا کہ انقلابی لہر میں کمی واقع ہو رہی ہے اُن کا خیال تھا کہ مزدور طبقے کی لڑاکا اقلیت اپنے جنگجویانہ اقدامات سے فتح یاب ہو سکتی ہے۔ اس رجحان کے نتیجے میں یہ خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ قبل از وقت کوئی قدم اٹھانے سے پارٹی ناکام ہو سکتی ہے بائیں بازو کی "گروہ بندی" کا یہ نظریاتی رجحان اور اس پر عمل درآمد مزدور تحریک میں ایک بڑا خطرہ بن گیا تھا۔ کمیونسٹ انٹرنیشنل نے گروہ بندی کے ان تمام رجحانات سے لڑتے ہوئے فیصلہ کیا کہ یورپ کی صورتحال میں جہاں مزدور طبقے کا بڑا حصہ سوشل ڈیموکریٹک پارٹیوں کے ساتھ ہے اس کا طریقہ کار یہ ہوگا۔ کہ پرانی یونینوں ہی میں کام کرتے ہوئے مزدور طبقے کی اکثریت کو اپنے ساتھ لایا جائے۔

جہاں پر ایک طرف تو دوسری سماجی پرتوں کے ساتھ پرولتاریہ کے متحدہ محاذ کی نوعیت کو نہیں سمجھا جا رہا تھا تو دوسری طرف بعض کمیونسٹوں نے یہ بھی سمجھا کہ متحدہ محاذ کے معنی یہ ہیں کہ اب چونکہ انقلاب کا سوال بہت دور جا پڑا ہے اس لئے سوشل ڈیموکریٹوں کے ساتھ بعض بنیادی نوعیت کے مسائل پر بھی سمجھوتہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۹۲۷ء کے آخر تک کمیونسٹ انٹرنیشنل "بائیں بازو" کے دباؤ کے سامنے جھک

گئی اور اس نے ایک نئی حکمت عملی اختیار کی جسے CLASS AGAINST CLASS کی پالیسی کا نام دیا گیا اس پالیسی کے تحت تمام اصلاح پسند تنظیموں کو بورژوازی کا آلہ کار قرار دیتے ہوئے ان سے کسی قسم کے اتحاد کی مخالفت گئی اس کے مطابق مزدور طبقے کے اتحاد کو صرف اُسی صورت میں حاصل کیا جا سکتا ہے جب ان تنظیموں سے اپنا رابطہ توڑا جائے اس پالیسی کا عملی نتیجہ یہ نکلا کہ اس سے مزدور اتحاد کو تو زیادہ مدد نہیں ملی البتہ اُس سے اصلاح پسند تنظیموں میں کام کرنے والے محنت کشوں اور کمیونسٹوں میں خلیج بڑھ گئی اور بعض جگہوں پر لڑاکا انقلابی کارکن عام دھارے سے کٹ کر رہ گئے۔

۱۹۲۹ء کے موسم خزاں میں بے مثال پیمانے کے ایک معاشی بحران نے سرمایہ دارانہ ملکوں کو آلیا۔ یہ بحران ۱۹۳۳ء تک چلتا رہا۔ بے شمار بینک، کارخانے اور طرح طرح کی کمپنیاں دیوالیہ ہو گئیں۔ دسیوں لاکھ چھوٹے کاروباری دھندے تباہ ہو گئے۔ تین کروڑ لوگ بیروزگار ہو گئے۔ سرمایہ دارانہ دنیا میں صنعتی پیداوار ۳۵ تا ۴۰ فیصد کم ہو گئی اور کچھ ملکوں میں تو اس سطح پر پہنچ گئی جو اس صدی کے شروع میں تھی۔ قیمتیں بڑھانے اور اجارہ داریوں کا منافع میں مزید کمی کو روکنے کے لئے کافی کے دسیوں لاکھ بوریاں سمندر غرق کر دی گئیں اور لاکھوں ٹن گیہوں کارخانوں کی بھٹیوں اور ریلوے انجنوں میں ملا دیا گیا۔ اس عرصے میں ۱۰ کروڑ سے زیادہ مزدور اپنے خاندانوں سمیت روزی سے محروم ہو کر غریبی اور فاقوں کا سامنا کر رہے تھے۔

۳۳-۱۹۲۹ء کے عالمی معاشی بحران نے طبقاتی جدوجہد پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ بیروزگار عوام کی جدوجہد میں تیزی سے اضافہ ہوا کسانوں اور شہری درمیانے اور شہری درمیانہ طبقے میں بھی بے اطمینانی اور بے چینی پھیل رہی تھی، انقلابی قوتوں کو کچلنے اور معاشی بحران کا تمام تر بوجھ محنت کشوں کے کندھوں پر ڈالنے کے لئے بورژوازی

کے انتہائی رجعتی حلقوں نے فاشزم کی شکل میں ایک نہایت موثر ہتھیار دیکھا۔ رجعتی اور فاشسٹ قوتوں کو موثر جواب دینے کے لئے پرولتاریہ کو تیزی سے اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرنا تھا۔ لیکن دائیں بازو کے سوشل ڈیموکریٹ پرولتاریہ کے اتحاد میں رخنے ڈالتے رہے اور حکمران بورژوازی کو زیادہ سے زیادہ مراعات دینے لگے۔ معاشی بحران کے گہرا ہونے کے ساتھ ساتھ یہ سوشل ڈیموکریٹ زیادہ اعلانیہ طور پر کمیونسٹ دشمن رویہ اختیار کرنے لگے چونکہ وہ ایک انقلابی طوفان کو ٹالنا چاہتے تھے۔

اس عرصہ میں کمینٹرن اپنی سابقہ تنگ نظر پالیسیوں پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی، جن کے مطابق صرف کمیونسٹ ہی معاشی جنگ لڑنے کے اہل تھے اور جو انقلابی ٹریڈ یونینوں کی اصلاح پسند ٹریڈ یونین سے تنظیمی علیحدگی کی وکالت کرتی تھیں۔ ۱۹۳۲ء میں کمینٹرن کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں اس رویّے کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور اصلاح پسند ٹریڈ یونینوں کی جانب تنگ نظری کے رویّے کو ختم کرنے کے لئے کہا گیا۔ ہمیں ان ٹریڈ یونینوں کو "سرمایہ داری کے اسکول" نہیں سمجھنا چاہیئے اس کی بجائے کمیونسٹوں کو ان میں کام کرنے کی ضرورت ہے اور آہستہ آہستہ ان کے اراکین میں اپنے لئے مقام بنانے کی ضرورت ہے۔ اس اجلاس میں اعلان کیا گیا کہ عوام کے روزمرہ کے مطالبات کے لئے جدوجہد وہ بنیادی ذریعہ ہے جس سے محنت کشوں کو بڑی انقلابی لڑائیوں کی طرف لایا جا سکتا ہے۔

اس اجلاس کی کارروائی سے معلوم ہوتا ہے کہ کمیونسٹ تحریک میں بائیں بازو کی تنگ نظر گروہی پالیسیوں کے خلاف عملی جدوجہد شروع کر دی گئی تھی جو فاشسٹ مخالف جدوجہد میں وسیع تر متحدہ محاذ کی راہ میں بڑی رکاوٹ تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ کمینٹرن نے ان نظریات کو بھی رد کر دیا جن کے مطابق فاشزم سرمایہ داری نظام کے معدوم ہونے میں ایک لازمی تاریخی مرحلہ ہے۔ اس طرح کی سوچ کا ماخذ "بائیں بازو"

کی وہ تھیوریاں تھیں جن میں فاشزم کے فوری اور خودبخود انہدام کی پیش گوئی کی گئی تھی۔ ایسے نظریات فاشزم کے خطرے کو کم کر کے دیکھتے تھے اور محنت کش عوام کی دیگر پرتوں سے پرولتاریہ کے اتحاد کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔ کمینٹرن کے مطابق فاشزم صرف سرمایہ داری کے کمزور ہونے کی نشانی ہی نہیں تھا بلکہ یہ سرمایہ داری کا ہتھیار بھی تھا جس میں ایسے عناصر موجود تھے جو سرمایہ داری کو اس بحران سے نکلنے میں مدد دے سکیں۔

فاشزم کے بڑھتے ہوئے خطرے کو محسوس کرتے ہوئے مختلف ممالک میں فاشسٹ دشمن عوامی محاذ بننے لگے لیکن بعض جگہوں پر اس حکمت عملی پر موثر طور پر عمل درآمد نہیں کیا جاسکا۔ بیشتر ممالک میں کیمونسٹوں نے رجعت پسندی اور فاشزم کے خلاف محنت کشوں کی جدوجہد کو فوری سوشلسٹ انقلاب کے لئے جدوجہد سے جوڑ کر دیکھا۔ بے شک یہ حکمت عملی کیمونسٹوں میں انقلابی جذبے کی نشاندہی کرتی ہے لیکن اس دور میں سرمایہ دار ممالک میں موجود پیچیدہ صورتحال اور طبقاتی قوتوں کے بدلتے ہوئے توازن کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ اسے مزدور طبقے کی اکثریت کی حمایت حاصل نہ ہوسکی۔

۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۳ء کے بحران کے بعد کساد بازاری کا ایک طویل دور شروع ہوا جسے ۱۹۳۷ء میں ایک نئے معاشی بحران نے ختم کیا۔ لیکن یہ بحران اتنا زیادہ شدید نہیں تھا۔ اس عرصہ میں جنگ کی تیاریوں نے سرمایہ دارانہ دنیا میں معاشی ارتقاء پر بہت گہرا اثر ڈالا اور بیشتر ملکوں کے صنعتی ادارے اپنی اپنی حکومتوں کے جنگی آرڈروں کی تکمیل کے لئے پوری صلاحیت بھر کام کرتے رہے۔ عالمی سطح پر ترک اسلحہ کے مسئلے کی اہمیت بڑھتی جارہی تھی سامراجی ریاستیں زبانی طور پر تو ترک اسلحہ کیلئے تیار ہونے کا اعلان کرتی تھیں لیکن عملی طور پر انہوں نے جنگ کی تیاری میں جنونی اسلحہ بندی شروع کر رکھی تھی۔

ستمبر ۱۹۳۱ء میں جب کہ یورپ میں ترک اسلحہ پر گرماگرم بحث ہو رہی تھی جاپان نے چین کے شمال مشرقی صوبوں (منچوریا) پر حملہ کر دیا۔ معاشی بحران اور داخلی گڑبڑ کے خطرے سے دوچار ہو کر جاپان نے یہ سمجھا کہ اس سے نکلنے کا واحد راستہ جنگ ہی ہے۔ جاپانی حکمران لوگوں کے ذہن میں یہ خیال ایک عرصے سے بیٹھا رہے تھے کہ چین کے وسیع علاقوں کو فتح کر لینے کے بعد ہی جاپان کے لئے مزید ارتقاء کے مواقع یقینی ہوں گے۔

جاپان نے ایشیاء میں جس دیدہ دلیری سے اپنی جارحیت جاری رکھی اس سے یورپ میں جرمن عسکریت پرستوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔ ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۳ء کے عالمی سرمایہ دارانہ معاشی بحران نے جرمنی کو خاص طور پر متاثر کیا تھا۔ ملک کی سبھی تمام شاخیں اس کی زد میں آ گئی تھیں، جرمن حکمران حلقوں کو یہ فکر تھی کہ بحران کے اس بار کو کسی طرح مزدوروں اور کسانوں کے کندھوں پر ڈال دیں۔ چنانچہ انہوں نے اجرتوں میں کمی، نئے ٹیکسوں، بیروزگاری اور معذوری کے الاؤنس میں کمی وغیرہ جیسے اقدامات اٹھانے کے لئے غیر معمولی احکامات جاری کئے۔ بنیادی حقوق اور آزادیوں پر روز بروز زیادہ پابندی عائد کی گئیں، جرمن بورژوازی کی رجعت پرستانہ پالیسیوں کو مزدوروں اور کسانوں کی بڑھتی ہوئی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ تیلمان کی سربراہی میں جرمن کمیونسٹ پارٹی ان کا ہراول دستہ تھی اگرچہ مزدوروں کا خاصا بڑا حصہ دائیں بازو کے سوشل ڈیموکریٹوں کے ساتھ بھی تھا۔ جنہوں نے بورژوا حکومت کی حمایت کرنے کی اپیل کی لیکن مزدوروں میں کمیونسٹوں کا اثر بڑھتا جا رہا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں رائخشاگ کے چناؤ میں ۳۲ لاکھ لوگوں نے کمیونسٹ امیدواروں کو ووٹ دیا۔

تھا جبکہ ۱۹۳۲ء کے چناؤ میں انہوں نے تقریباً ۶۰ لاکھ ووٹ حاصل کیے۔

لیکن اسی عرصے میں ہٹلر کے تحت فاشسٹ پارٹی نے کمیونسٹوں سے کہیں زیادہ تیزی سے

کام کرکے عام لوگوں پر اپنا اثر بڑھالیا تھا۔ ملک کی سرمایہ دار اجارہ داریاں فاشسٹ پارٹی کو ایک ایسی قوت کی حیثیت سے مضبوط بنا رہی تھیں جو ریاست کی ناخدائی کے لئے بورژوا اور سوشل ڈیموکریٹک پارٹیوں کی جگہ لینے والی تھی، اس لئے کہ ان پارٹیوں کی پالیسیاں عوام میں روز بروز زیادہ نامقبول ہو رہی تھیں۔ عوام میں خطابت کے وسیع استعمال سے فاشسٹوں نے دل کھول کر لوگوں سے مختلف فائدوں کے وعدے کئے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے سیاسی مخالفین کے خلاف دہشت پسندی کی مہم چلادی۔ اس وقت کی صورتحال میں جرمن حکمران حلقوں نے یہ محسوس کیا کہ اگر انہیں اپنا اصل مقصد حاصل کرنا ہے تو ایک مضبوط حکومت قائم کرنی ہوگی، ساری بورژوا جمہوری آزادیوں کو ختم کرنا ہوگا۔ اور کمیونسٹ پارٹی کو کچلنا ہوگا اور وہ اصل مقصد تھا۔ دنیا کی از سر نو تقسیم کے لئے جنگ شروع کرنا اور ۱۹۱۸ء کی شکست کا بدلہ لینا۔ سوشل ڈیموکریٹک پارٹی اور ٹریڈ یونین لیڈروں نے جو پالیسی اختیار کی اس سے یہ کام اور بھی آسان ہو گیا۔ جنوری ۱۹۳۳ء کو اقتدار پر نازی پارٹی کا قبضہ مکمل ہو گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ جرمن سرمایہ داروں میں سب سے زیادہ رجعت پرست اور جارحیت پرست عناصر نے اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ایک خون کی پیاسی نازی ڈکٹیٹر شپ قائم کر دی گئی جسے ۱۲ سال سے زیادہ عرصہ تک چلنا تھا۔ ملک کے اندر ساری جمہوری آزادیوں کا خاتمہ کر دیا گیا اور ترقی پسند عناصر کو جسمانی طور پر نیست و نابود کیا جانے لگا۔ جرمن فاشسٹ تھے تو اجارہ داریوں کے آلہ کار لیکن انہوں نے "محنت کش عوام کے دوست" ہونے کا دعویٰ کیا۔ انہیں بیرونی فتوحات کی صورت میں بے پناہ دولت دینے کا وعدہ کیا اور مزدوروں اور کسانوں کے بعض زمروں کو "بخشش" عطا بھی کی۔ بدقسمتی سے پیٹی بورژوازی، کسانوں، نوجوانوں اور کم سیاسی شعور رکھنے والے مزدوروں میں خاصی تعداد میں ایسے لوگ مل گئے جنہوں نے فاشسٹ پروپیگنڈہ پر کان دھرا اور اس کا شکار ہو گئے۔

۱۹۳۳ء میں جرمنی میں نازی جیت اور اس کے بعد بے مثال دہشت کے دور دورے نے

سرمایہ دار ملکوں میں تقریباً تمام ہی رجعت، تیرگی، جنگجو قوم پرستی اور جنگ کی قوتوں کو بیدار کر دیا، جو ابھی تک دبی پڑی تھیں۔ دنیا کی قوموں کے لئے فاشزم کے بھیانک خطرے کا مطلب اُن تمام سیاسی اور سماجی کامیابیوں کا خاتمہ تھا جو مزدور طبقہ نے جدوجہد کے طویل برسوں میں حاصل کی تھیں۔ فروری ۱۹۳۴ء میں جرمن فاشسٹوں کی تقلید میں فرانسیسی فاشسٹ گروہ بھی پیرس کی سڑکوں پر اُمڈ پڑے۔ فرانسیسی پرولتاریہ، کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں نے ان سے مقابلے کی ٹھانی اور فاشسٹوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ مزدوروں نے فاشزم کے خلاف اپنی جدوجہد میں اتحاد عمل پیدا کرنے کی کوشش کی۔ فرانسیسی کمیونسٹ پارٹی کی پیش قدمی پر فرانس کی سیاسی پارٹیوں، ریڈیکل، سوشلسٹ اور کمیونسٹ پارٹیوں، ٹریڈ یونینوں، مختلف جمہوری اور فاشسٹ دشمن تنظیموں اور ان کی لیڈرشپ کو ماننے والی مزدوروں، دانشوروں اور پیٹی بورژوازی کی اکثریت نے متحد ہو کر آزادی، جمہوری حقوق اور امن کے نام پر فاشسٹ، دشمن عوامی محاذ بنالیا۔ جولائی ۱۹۳۴ء میں اٹلی کی کمیونسٹ اور سوشلسٹ پارٹیوں کے درمیان اتحاد عمل کا سمجھوتہ ہو گیا۔

۲۵ جولائی سے ۲۵ اگست ۱۹۳۵ء تک کمینٹرن کی ساتویں کانگریس ہوئی۔ فاشزم کے خلاف عوام کی جدوجہد کے ارتقاء کے لئے اس کے فیصلے بہت اہم تھے۔ دیمتروف نے کانگریس میں بنیادی رپورٹ پیش کی جس میں انٹرنیشنل نے وسیع اور بڑی حد تک ترمیم شدہ فریضوں کا خاکہ پیش کیا جو اسے فاشزم اور جنگ کے خطرے کے خلاف جدوجہد میں انجام دینے تھے۔ جرمنی میں فاشزم کی جیت کے سبق اور فرانس میں فاشسٹ دشمن جدوجہد کے نتائج کو ذہن میں رکھتے ہوئے ساتویں کانگریس نے ساری کمیونسٹ پارٹیوں پر ہر جگہ ایک متحدہ پرولتاری محاذ قائم کرنے کا فریضہ عائد کیا جس میں کروڑوں لاکھ مزدور اور متوسط پرتوں کے لوگ متحد ہوں۔

متحدہ محاذ کے اصولوں کی وضاحت کرتے ہوئے دیمتروف کہتا ہے "یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ جمہوریت کے لئے جدوجہد پرولتاریہ کو سوشلسٹ انقلاب کے لئے جدوجہد سے بھٹکاتی ہے یا

اسے پس پشت ڈال دیتی ہے اس کے برعکس پرولتاریہ بورژوازی پر فتح حاصل کرنے کے لئے اُس وقت تک تیار نہیں ہو سکتا جب تک وہ مستقل مزاجی سے مختلف سطحوں پر جمہوریت کے لئے جدوجہد نہیں کرتا۔

بعد کے واقعات نے جلد ہی کانگریس کے پروگرام کی دانائی کی توثیق کردی۔ فرانس میں محاذ سے وابستہ پارٹیوں نے چناؤ میں ۵۷ فیصد نشستیں حاصل کرلیں ۱۹۳۶ء میں اسپین کی کمیونسٹ پارٹی ایک متحدہ محاذ بنانے میں کامیاب ہوگئی جس میں بائیں بازو کی جمہوری پارٹیاں اور مزدوروں کی تنظیمیں متحد تھیں۔ فروری ۱۹۳۶ء کے چناؤ میں اس محاذ نے فیصلہ کن فتح حاصل کی۔ چین میں کمیونسٹوں کی کوششوں سے ۳۷-۱۹۳۶ء میں ایک متحدہ جاپان مخالف قومی محاذ کا قیام عمل میں آیا۔ چلی میں عوامی محاذ کے لئے چلائی جانے والی تحریک کامیاب ہوئی۔ دوسرے لاطینی امریکہ کے ملکوں میں بھی ترقی پسندوں کو متحد کرنے کی تحریکوں نے زور پکڑا اگرچہ بعض ملکوں میں وہ رجعت پرستی کی قوتوں پر قابو نہ پاسکیں۔

۱۹۳۰ء کی دہائی کے آواخر میں امریکہ میں بھی ہڑتالوں کی لہر دوڑ گئی۔ امریکی ٹریڈ یونین تحریک بڑی تیزی سے بائیں بازو کی طرف جھک رہی تھی۔ اس رجحان کی نمائندگی ٹریڈ یونینوں کی فیڈریشن کے قیام سے ہوتی ہے۔ جس کا نام صنعتی تنظیموں کی کانگریس (سی آئی او) تھا روز بروز زیادہ بڑے پیمانے کے عوامی اقدام نے حکمران حلقوں کو مزدوروں کی مانگیں پوری کرنے یعنی اجرت بڑھانے، سماجی بیمہ وغیرہ رائج کرنے پر مجبور کردیا۔

ادھر یورپ میں فاشسٹ حملہ آوروں کی ہوس روز بروز بڑھتی جا رہی تھی ۱۹۳۶ء کے موسم گرما میں جنرل فرانکو کی سرکردگی میں ہسپانوی رجعت پرستوں نے عوامی محاذ کی قانونی حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کردی۔ یہ بغاوت بڑھ کر خانہ جنگی میں تبدیل ہوگئی جس میں جرمن اور اطالوی فاشسٹوں نے فوراً باغیوں کی حمایت شروع کردی ہسپانوی عوام کی

انقلابی جنگ سپین کی تاریخ اور پرولتاری بین الاقوامیت پسندی کے انتہائی عظیم الشان واقعات میں سے ہے۔ ساری دنیا کے ترقی پسند عناصر ہسپانوی جمہوریت پسندوں اور سپین کی قانونی حکومت کی حمایت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ درجنوں ملکوں سے رضاکاروں کی فوج سپین میں امڈ آئی جنہیں کئی بین الاقوامی دستوں میں منظم کیا گیا اور یہ دستے جمہوریہ کی فوجوں میں شامل ہو گئے۔ عالمی ترقی پسند قوتوں کی امداد اور ہسپانوی حریت پسند عوام کی جانبازی کی بدولت سپین اس یلغار کے سامنے ٹک سکا اور اس نے بڑے کٹھن حالات میں ڈھائی سال سے زیادہ تک لڑائی جاری رکھی بالآخر عالمی رجعت پسندوں کی مدد سے فاشسٹ فوجیں اپریل ۱۹۳۹ء میں میڈرڈ میں داخل ہو گئیں۔

۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء کے برسوں میں فاشسٹ طاقتوں کا کھلے طور پر گٹھ جوڑ بن چکا تھا۔ جارحیت پرستوں کے بلاک میں نازی جرمنی راہنمایانہ کردار ادا کر رہا تھا۔ فاشسٹ طاقتیں خود ایک بڑی جنگ کے لئے تیاریاں تیز تر کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ یورپ، ایشیا اور افریقہ میں برطانیہ، فرانس اور ریاستہائے متحدہ امریکہ پر یکے بعد دیگرے وار پر وار کرتی رہیں لیکن ان ملکوں کی حکومتیں سوویت یونین سے اپنی طبقاتی نفرت میں اندھی ہو کر یہی یقین کئے رہیں کہ جرمنی سوویت یونین تک پہنچنے کے راستے میں واقع چھوٹی ریاستوں کو اپنی مملکت میں ملا کر صرف سوویت یونین سے ہی جنگ کرے گا۔

مارچ ۱۹۳۸ء میں جرمنی نے آسٹریا پر قبضہ کر لیا اور چیکوسلاواکیہ کے حصے بخرے کرنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ فرانس اور برطانیہ نے اس تنازعے کے شروع ہوتے ہی نازی ہونا کیوں کی غیر مشروط حمایت کی۔ ۳۰ ستمبر کو میونخ میں چیمبرلین نے ہٹلر اور مسولینی کے ساتھ کانفرنس میں چیکوسلواکیہ کی قسمت کا فیصلہ کر دیا جس کے نتیجے میں اس ملک کے بعض اہم علاقے جرمنی کے سپرد کر دیئے گئے اس کانفرنس میں انگریز جرمن عدم جارحیت کے معاہدے پر دستخط کئے گئے اور اسی سال دسمبر میں فرانس اور جرمنی کے درمیان بھی اسی

طرح کے اعلان ناموں پر دستخط کر دیئے گئے۔ سوویت یونین کی ابتدا ہی سے کوشش تھی کہ برطانیہ اور فرانس سے فاشزم کے بڑھتے ہوئے خطرے کو روکنے کے لئے سمجھوتہ کیا جائے لیکن اس بات چیت کے دوران بھی برطانوی اور فرانسیسی مدبرین جرمنی کے ساتھ خفیہ سمجھوتے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے اور اس کے بدلے میں اسے مشرق میں پوری چھوٹ دینے پر تیار تھے۔ اس صورتحال میں جنگ کو مزید التوا میں ڈالنے کے لئے سوویت یونین کو بھی جرمنی سے عدم جارحیت کا سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

مگر جرمن سامراجیت کا اصل مقصد تو بنیادی طور پر دنیا کی از سر نو تقسیم کرنا تھا اس لئے ظاہر ہے کہ مغربی طاقتوں اور نازیوں کے درمیان کسی طرح کے اتحاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مغربی طاقتوں اور فاشسٹ بلاک کے درمیان جو تضادات تھے، وہ دوسری ریاستوں اور قوموں کو نقصان پہنچا کر دور نہ کیے جاسکتے تھے۔ یہ تضادات دو حریف سامراجی جتھہ بندیوں کو ناگزیر طور پر ایک مسلح جھڑپ کی طرف دھکیل رہے تھے۔

عالمگیر جنگوں کے درمیان ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں مزدور تحریک

روس میں اکتوبر انقلاب کی فتح نے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی قومی جدوجہد آزادی پر فیصلہ کن اثر ڈالا۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ استعماری مقبوضات اور محکوم ملکوں کی قوموں کو ایک طاقتور اتحادی مل گیا۔ لینن نے اس بات پر زور دیا کہ "ترقی یافتہ ملکوں کی پرولتاریہ کی مدد سے پسماندہ ممالک سرمایہ دارانہ مرحلے سے گزرے بغیر سوویت نظام قائم کر سکتے ہیں اور ارتقا کے بعض مراحل سے گزر کر کمیونزم تک پہنچ سکتے ہیں" یہ بالکل قدرتی بات تھی کہ اکتوبر انقلاب کی فتح کے فوراً ہی بعد ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ملکوں میں قومی تحریک آزادی میں زبردست ابھار آیا۔ اگلے چند برسوں کے انقلابی واقعات اس حقیقت کے شاہد تھے کہ استعماری نظام بری طرح کمزور ہو گیا ہے۔

چین

سامراجی غلبے کے تحت سب سے بڑا ملک چین تھا۔ اکتوبر انقلاب نے چینی عوام کی جدوجہد آزادی کے بے مثال اُبھار میں معاونت کی اور چین کے مزدور طبقے کی سیاسی تعلیم میں بھرپور کردار ادا کیا۔ چین کا مزدور طبقہ روز بروز زیادہ ہڑتالوں اور علانیہ سیاسی اقدامات سے کام لینے لگا تھا جن کا مقصد سامراجیوں کے غلبے کا مقابلہ کرنا ہوتا تھا۔ زیادہ تر صورتوں میں سرمایے کے طبقاتی جبر و استبداد کے ساتھ ساتھ بیرونی اجارہ داریوں کے ہاتھوں چینی پرولتاریہ کا استحصالی طرز کا استحصال بھی ہوتا تھا۔ مئی ۱۹۱۹ء میں جاپان کی طرف سے چین کے مالا مال صوبے شانتونگ پر قبضہ کرنے کے خلاف ملک بھر میں سامراج دشمن مظاہروں، سیاسی ہڑتالوں اور جاپانی مال کے بائیکاٹ وغیرہ کی ایک لہر شروع ہوگئی جس کی رہنمائی شنگھائی اور دوسرے صنعتی شہروں کے مزدوروں نے کی اور جس میں طالب علموں کے ساتھ ساتھ پیٹی اور قومی بورژوازی کے افراد نے بھی حصہ لیا۔

۱۹۱۷ء کے موسم خزاں میں چین کے جنوبی حصے کوانچو میں سن یات سین کی جمہوری حکومت قائم ہو چکی تھی جس کی مقبولیت بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ سامراج دشمن جدوجہد کا مرکز بن گئی تھی۔ انقلاب دشمن بغاوتوں کے باوجود یہ حکومت بڑی حد تک چینی کمیونسٹوں کی بدولت چینی عوام کی جدوجہد آزادی کا اصل گڑھ بن چکی تھی۔ چین کی کمیونسٹ پارٹی ۱۹۲۱ء میں قائم کی گئی تھی۔ یہ واقعہ چینی عوام کی تحریک آزادی پر روس کے اکتوبر کے انقلاب کا سب سے جامع اور قطعی اظہار تھا۔ ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۳ء میں مزدور طبقے کی سرگرمی میں اضافہ کمیونسٹ اثر کا نتیجہ تھا۔ جون ۱۹۲۳ء میں کوانچو میں منعقد ہونے والی کانگریس میں یہ اہم فیصلہ کیا گیا کہ کمیونسٹ پارٹی کومنتانگ میں شامل ہو جائے لیکن اپنی تنظیم، نظریاتی اور سیاسی آزادی برقرار رکھے۔ یہ فیصلہ مقبوضہ اور نیم مقبوضہ

ملکوں میں قومی بورژوازی کے رول کے بارے میں لینن کی اس رائے پر مبنی تھا جس کے مطابق بیرونی سامراجیت اور کسی مخصوص ملک میں جاگیرداری کی انتہائی مسموم باقیات کے خلاف جدوجہد میں بورژوازی کسی حد تک مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

۱۹۲۴ء کے بعد سے ایک متحدہ قومی محاذ کی تشکیل کے نتیجے میں چین کی انقلابی تحریک نے کافی زور پکڑنا شروع کر دیا۔ یہ محاذ سامراجیت اور جاگیرداری کی قوتوں کے خلاف تھا اور اسے مزدور طبقے، کسانوں اور قومی بورژوازی کی حمایت حاصل تھی۔ ظاہر ہے کہ انقلاب کی محرک قوت کا اور جمہوری اصلاحات کی وسعت وغیرہ کا تعین کرنے میں کومنتانگ کی لیڈرشپ اور کمیونسٹ پارٹی کے درمیان شدید نظریاتی اختلافات برقرار رہے۔ لیکن یہ کہنا ضروری ہے کہ اس زمانے میں قومی بورژوازی کا بڑا حصہ انقلاب کی حمایت کرتا تھا اس لئے کہ بیرونی سرمائے کا غلبہ اور جاگیردارانہ نظام کی باقیات اس کے مفادات کے لئے نقصان دہ تھیں اور اس کی سرگرمیوں کی ہر توسیع میں شدید رکاوٹ بنتی تھیں۔

مئی ۱۹۲۵ء میں برطانیہ اور امریکہ کے زیر ہدایت پولیس نے شنگھائی میں ایک وطن دوست مظاہرے پر گولی چلا دی۔ اس واقعہ سے چینی عوام میں سامراج دشمن جذبات بھڑک اٹھے اور شدید ردعمل ہوا، جو "۳۰ مئی کی تحریک" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مزدور طبقہ اتحاد کے ساتھ اس جدوجہد کی سربراہی کر رہا تھا۔ پہلی جون کو شنگھائی کے دو لاکھ پرولتاریوں نے ہڑتال کر دی۔ طالب علم اور شہر کی پیٹی بورژوازی کی بڑی تعداد مزدوروں کے ساتھ شریک ہو گئی۔ شنگھائی کے مزدوروں کے ساتھ یکجہتی کے اظہار میں کوانچو اور ہانگ کانگ میں بھی ہڑتال شروع ہو گئی۔ یہ ہڑتال ۱۶ مہینے چلی اور اس نے اپنی طوالت اور عزم کے اعتبار سے ریکارڈ قائم کر دیا۔

کومنتانگ کے دائیں بازو والے ان واقعات کو دیکھ رہے تھے اور ان کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ مارچ ۱۹۲۶ء میں انہوں نے کوانچو میں ایک انقلاب دشمن بغاوت کرنے کی پہلی

کوشش کی۔ لیکن ابھی وہ اتنے طاقتور نہیں تھے کہ کمیونسٹوں سے تعلق قطع کر سکیں البتہ ۱۹۲۶ء میں چیانگ کائی شیک نے اس امر میں کامیابی حاصل کر لی کہ اپنے آپ کو بیک وقت کومنتانگ کا صدر اور قومی انقلابی فوج کا کمانڈر انچیف بنوالے۔ موخر الذکر عہدہ اس لئے بھی اہم تھا کہ آزادی کی شمالی مہم کے شروع ہونے کے ساتھ ساتھ فوج درجہ اوّل کی سیاسی قوت بن گئی تھی۔

شمالی مہم نے مزدوروں کی تحریک کو نیا جوش و خروش عطا کیا۔ اس نے کسانوں کو جاگیرداروں کے خلاف اقدام کرنے پر اکسایا اور طبقاتی جنگ کو عام طور سے فروغ دیا۔ ٹریڈ یونینوں کی ممبر سازی تیزی سے بڑھی اور ہڑتالوں میں اضافہ ہوا۔ بڑھتی ہوئی انقلابی جدوجہد پر قومی بورژوازی کی پریشانی اور تشویش کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ مارچ ۱۹۲۷ء میں انقلابی فوجیں چین کے بڑے صنعتی مرکز شنگھائی کے قریب آگئیں اور شہر کے مزدوروں نے ایک عام ہڑتال کا اعلان کر کے بغاوت کر دی۔ جب باغیوں نے شہر پر قبضہ کر لیا تو قومی انقلابی فوج کے دستے شہر میں داخل ہو گئے۔ دو دن بعد نانکنگ پر بھی انقلابی فوجوں کا قبضہ ہو گیا جو سیاسی اعتبار سے ... چین کا اہم مرکز تھا۔

اسی عرصے میں شنگھائی کے صنعت کاروں کی طرف سے ایک بہت بڑی رقم چیانگ کائی شیک کی جیب میں پہنچ گئی اور اُس نے انہیں سامراجی طاقتوں کے نمائندوں سے سمجھوتہ کر لیا جن کی چین میں دیدہ دلیر مسلح مداخلت پر ساری دنیا میں غم و غصّے کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اپریل ۱۹۲۷ء کو چیانگ کائی شیک نے شنگھائی میں انقلاب مخالف بغاوت کر دی۔ دوسرے اضلاع میں بھی اُسی طرح کی بغاوتیں ہوئیں اور ہر جگہ پر ٹریڈ یونینوں کے خلاف تشدد سے کام لیا گیا۔ کمیونسٹوں کو گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اُتارا جانے لگا۔ ۱۹۲۷ء کے دوران میں بڑی بورژوازی اور زمینداروں کے بلاک نے قومی بورژوازی کے ساتھ مل کر اپنی رجعت پرست سیاسی حکمرانی پورے چین پر مسلط کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔

کومنتانگ کی قیادت نے انقلاب سے جو غداری کی تھی اُس کا بدلہ لینے کے لئے مزدوروں

اور کسانوں کی مسلح بغاوتیں ہوئیں۔ ان میں دسمبر ۱۹۲۷ء میں کوانچو کے ۳۰ ہزار مزدوروں کی بغاوت جسے "کینٹن کمیون"، کہا جاتا ہے، سب سے اہم تھی۔ باغیوں نے زمین پر جاگیردارانہ ملکیت، بیرونی کمپنیوں کی جائداد کی ضبطی اور سارے غیر مساویانہ عہدناموں کی منسوخی کا اعلان کر دیا۔ اس بغاوت کو خون میں نہلا دیا گیا۔ ۳۰-۱۹۲۸ء کے عرصے میں مرکزی اور جنوبی چین میں خاص طور سے پہاڑی علاقوں میں بہت سے انقلابی خطے نمودار ہونے لگے اور مزدوروں، کسانوں اور سرخ فوج کے کمانڈروں کی سوویتیں قائم کی گئیں۔ ان سوویتوں نے بہت سی جمہوری اصلاحات نافذ کیں جن میں زرعی اصلاحات سب سے اہم تھیں۔ بعد کے برسوں میں آزاد شدہ علاقوں کا رقبہ کافی بڑھ گیا۔

کومنتانگ حکومت نے سوویت علاقوں کو ختم کرنے کی متعدد کوششیں کیں جو بار آور نہ ہو سکیں۔ ۱۹۳۲ء کے شروع میں جاپان نے شنگھائی پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن شنگھائی کی پرولتاریہ یک جان ہو کر کمیونسٹوں کی آواز پر شہر کے دفاع میں اٹھ کھڑے ہوئے اپریل ۱۹۳۲ء میں انقلابی علاقوں کی مرکزی حکومت نے جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور جاپانی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لئے ساری قوتوں سے متحد ہونے کی اپیل کی۔ اس کے برعکس چیانگ کائی شیک نے خانہ جنگی کو اور زیادہ پھیلانے کی کوشش کی۔ آبادی کی ساری پرتوں کے لوگ روز بروز یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ ساری وطن دوست قوتیں متحد ہو کر خانہ جنگی کو ختم کر دیں، جس کی وجہ سے جاپانی نت نئے چینی علاقوں پر قبضہ کرتے جا رہے تھے۔ بالآخر کمیونسٹ پارٹی کی کوششوں سے کومنتانگ کے لیڈر سرخ فوج کے خلاف اپنی مہم ختم کرنے پر مجبور ہوئے اور ستمبر ۱۹۳۷ء میں جاپانی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے سوال پر دونوں فریقوں میں سمجھوتہ ہو گیا۔ حملہ آوروں کے خلاف جنگ کا اصل سامنا آٹھویں اور چوتھی فوج نے کیا جو دونوں کمیونسٹ کمان کے تحت تھیں۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان کا بیس سالہ وقفہ چینی تاریخ کا ایک اہم دور

تھا اس دور میں ایک عوامی انقلابی تحریک کی بے مثال نشوو نما ہوئی جس کا رخ سامراجیت اور جاگیرداری کے خلاف تھا اسی دور کی ایک زیادہ اہم خصوصیت یہ تھی کہ سیاسی میدان میں چینی مزدور طبقہ جنگ آزادی کے رہنما کی حیثیت سے ایک ایسا مزدور طبقہ بن کر نمودار ہوا جس نے اکتوبر انقلاب کے بلند مقاصد کو اپنایا تھا اور خود ہی اپنی پارٹی بنائی تھی۔ اگرچہ قومی بورژوازی کی دغابازی کی وجہ سے انقلاب کو شکست ہو گئی لیکن انقلابی قوتوں نے جو بیش بہا تجربہ حاصل کیا اس کی بدولت اور طبقاتی جنگوں کی بھٹیوں میں تپتے ہوئے کمیونسٹ پارٹی نے آئندہ فتوحات کی بنیاد رکھی۔

ہندوستان

پہلی جنگ عظیم کے برسوں میں ہندوستان کے سماجی اور معاشی ارتقا میں دور رس تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ہندوستانی انسانی قوت اور ملک کے خام مال اور غذا کے وسائل کو برطانوی فوج کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے وقف کر دیا گیا تھا

جس سے ہندوستان کے عوام کی مصیبتیں اور بھی بڑھ گئیں۔ جنگ کے بعد برطانیہ نے اپنے آپ کو اس بات پر مجبور پایا کہ ہندوستان کی صنعت خاص طور پر دھات سازی کے قیام میں مدد کرے۔ ہندوستان کی ہلکی صنعتوں خاص طور پر ٹیکسٹائل کی صنعت میں بھی کچھ نشوونما ہوئی۔ جنگ کے دوران میں ہندوستان کی بڑی بورژوازی ایک حد تک مضبوط ہو گئی تھی اور برطانیہ سے کافی سیاسی رعایتوں کی توقع کرنے لگی تھی۔ مزدور طبقہ تعداد کے اعتبار سے بڑھ گیا تھا اور چند صنعتی مراکز میں جمع ہو گیا۔ تھا جنگ کے ختم ہوتے ہوتے صرف ایسے اداروں میں جو بیس سے زیادہ مزدور رکھتے تھے، مزدوروں کی تعداد ۲۵ لاکھ سے تجاوز کر رہی تھی۔ سب سے زیادہ مزدور ٹیکسٹائل کی صنعت میں تھے ان تمام چیزوں کے باوجود ہندوستان پھر بھی ایک پسماندہ زرعی ملک تھا جس کی صنعت یک رخی تھی جو کہ نوآبادیاتی ممالک کی خصوصیت ہے۔

حالات زندگی جیسے جیسے خراب ہونے گئے۔ ویسے ویسے عام لوگوں میں غم و غصہ بھی بڑھتا گیا۔

اور وہ استعماری حکمرانی کے خلاف صف آرا ہونے لگے۔ ملک کا مزدور طبقہ بالآخر منظم طریقے سے کام کرنے لگا تھا اور تحریک میں نمایاں کردار ادا کر رہا تھا۔ 1919ء کے اوائل میں بمبئی کے کپڑا مل مزدوروں کی ایک عام ہڑتال شروع ہوئی جو وسیع پیمانے پر مزدوروں کا پہلا منظم مظاہرہ تھا۔

لینن نے ہندوستان میں قومی تحریک آزادی پر گہری توجہ دی اور مسلم اور غیر مسلم اتحاد کو اس جدوجہد کی کامیابی کی خاص شرط قرار دیا۔

برطانیہ سے زیادہ رعائتیں حاصل کرنے کی کوشش میں انڈین نیشنل کانگریس نے عام لوگوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے بڑے پیمانے پر ایسے طریقے استعمال کیے جیسے کہ عام جلوس، بدیسی مال کا بائیکاٹ وغیرہ۔ یہی وہ زمانہ تھا جب موہن داس کرم چند گاندھی تحریک آزادی کے مسلّمہ لیڈر بن گئے۔ آزادی کی جدوجہد میں کروڑوں لوگوں کو شریک کر لینے میں گاندھی کی کامیابی بہت بیش قیمت معاونت تھی۔ گاندھی ہندوستان کی پچھڑی ہوئی ذاتوں (اچھوتوں) مزدوروں اور کسانوں کے علمبردار تھے لیکن وہ طبقاتی جدوجہد کے حریف تھے۔ گاندھی کے نظریے کے اس پہلو سے صاحب جائیداد طبقوں کو فائدہ پہنچا جو محنت کش عوام کو آزادانہ اقدام سے روکتا اور عام لوگوں پر اپنا نظریاتی اثر برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

۲۱۔ ۱۹۲۰ء میں جنگ کے بعد کے پہلے بحران کے اثرات نے ہندوستان میں صورتحال کو عام تحریک کی نشوونما کے لئے زیادہ سازگار بنا دیا تھا۔ بیروزگاری میں شدید ترین اضافہ ہوا اور کسانوں کو اُن کی پیداوار کی قیمت بہت کم ملنے لگی۔ برطانیہ پر اس بحران کا اثر سب سے زیادہ تھا اور اس نے اس کا بار مقبوضات کے عوام پر ڈال کر اس سے نکلنے کی کوشش کی۔

اگرچہ مزدور طبقہ قومی تحریک آزادی کے لئے بڑی جدوجہد کر رہا تھا لیکن ہندوستانی پرولتاریہ کو ابھی تک اپنے تاریخی رول کا احساس نہیں تھا اور اس نے ابھی تک اپنی پارٹی نہیں بنائی تھی۔ اس وقت سوشلزم اور مزدور تحریک کا ہیجان ہونا بس شروع ہی ہوا تھا۔ مزدور طبقہ اتنا مضبوط نہیں تھا کہ کسان تحریک کی قیادت سنبھال سکتا جو ۲۲۔ ۱۹۲۰ء میں پورے زور پر تھی۔ بعض

علاقوں میں کسانوں کے اقدامات نے بغاوت کی شکل اختیار کرلی لیکن ان کا ایک دوسرے سے کوئی رابطہ نہیں تھا جس کی وجہ سے انہیں دبانا آسان ہوگیا تھا۔

۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۲ء کی انقلابی لہر کے اُتار کے بعد جن تضادات نے ہندوستان کے عوام کی سامراج دشمن جدوجہد شروع کی تھی، وہ اور بھی زیادہ شدید ہوگئے۔ برطانوی اجارہ داریوں نے ہندوستان پر اپنا معاشی دباؤ بڑھا دیا اور مقامی سرمایہ دار ہر ممکن طریقے سے منافع میں اپنا حصہ بڑھانے کے لئے بے چین تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ اجرتیں کم ہوتی گئیں اور مزدوروں کے لئے کام کرنے کے حالات بدسے بدتر ہوتے گئے۔ اب مسلم لیگ اور کانگریس پہلے کی طرح تعاون نہیں کرتی تھیں اور بعض علاقوں میں ہندو مسلم فسادات بھی رونما ہونے لگے۔ کانگریس کے لیڈروں کی شکست خوردگی نے جنہوں نے سول نافرمانی کی تحریک واپس لے لی تھی، عام لوگوں میں مایوسی کا احساس پیدا کردیا تھا۔

لیکن اس کے باوجود کہ رجعت پرستوں کا بول بالا تھا، ہندوستانی مزدور ہڑتالیں کرتے رہے۔ ۱۹۲۶ء کے آخر تک ٹریڈ یونینوں کی ممبری بڑھ کر تقریباً ۳ لاکھ ہوگئی۔ کیمونسٹ تنظیمیں اپنی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع کرتی رہیں اور دسمبر ۱۹۲۵ء میں کیمونسٹ پارٹی قائم ہوگئی۔ ۱۹۲۵ء اور اس کے بعد کے برسوں میں مختلف جگہوں پر (بنگال، بمبئی، پنجاب وغیرہ) مزدوروں اور کسانوں کی پارٹیاں منظم کی گئیں جنہوں نے مزدوروں، کسانوں، دانشوروں اور پیٹی بورژوازی کو متحد کرنے کا کام دیا۔ پیٹی بورژوازی کے انقلابی قوم پرست ان تنظیموں کی لیڈرشپ میں کیمونسٹوں کے ساتھ شریک تھے۔ ان پارٹیوں نے ملک میں جمہوری قوتوں کو مستحکم بنانے میں مدد دی یہ بات کہ قومی آزادی کی تحریک میں ایک نیا اُبھار آنے والا تھا خود انڈین نیشنل کانگریس کے اندر بائیں بازو کی بڑھتی ہوئی سرگرمی سے معلوم ہوتی ہے۔ یہ عناصر زیادہ تر طالب علموں، دانشوروں اور پیٹی بورژوازی کے اراکین پر مشتمل تھے۔

۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن کی ہندوستان آمد پر زبردست مظاہرے ہوئے۔ ہڑتال کی تحریک

نے بھی زور پکڑا اور ۱۹۲۸ء میں ۵ لاکھ سے زیادہ مزدوروں نے ہڑتالوں میں حصہ لیا۔ ان میں
اہم ترین ہڑتال بمبئی کے کپڑا مل مزدوروں کی تھی جو چھ مہینے چلتی رہی۔ مالکوں کے خلاف اس جدوجہد
کی خصوصیات یہ تھی کہ کمیونسٹوں، مزدور کسانوں پارٹیوں اور انقلابی ٹریڈ یونینوں کا اثر بہت
بڑھ گیا تھا۔ مزدوروں کی بڑھتی ہوئی تحریک کو روکنے کے لیے انگریز حکام نے جبر و تشدد سے کام لیا۔
مارچ ۱۹۲۹ء میں اس تحریک کے ۳۲ ممتاز لیڈر گرفتار کر لئے گئے جن میں ۸ انگریز اور تیرہ دوسرے
کمیونسٹ بھی تھے۔ اُن پر "میرٹھ سازش" کے مقدمے کی سماعت کا ڈھونگ رچایا گیا۔ بہت سے
صنعتی شہروں میں ٹریڈ یونین کے سرگرم اراکین کو گرفتار کر لیا گیا۔ ٹریڈ یونینوں کی سرگرمی اور
ممبری اگرچہ بڑھتی گئی مگر ٹریڈ یونین تحریک میں پھوٹ کی وجہ سے مزدور طبقے کی طاقت کم ہو کر
رہ گئی۔ اب ملک میں ٹریڈ یونین تحریک میں پھوٹ کی وجہ سے مزدور طبقے کی طاقت کم ہو کر
رہ گئی۔ اب ملک میں تین ٹریڈ یونین مرکز ہو گئے۔

۱۹۲۹ء میں جس معاشی بحران نے سرمایہ دار دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، وہ
ہندوستان کے لیے نئی نئی پریشانیوں کا باعث بنا۔ برطانوی اجارہ دار سرمائے نے ہندوستان
اور اپنے دیگر مقبوضات میں استحصال بڑھا کر خود اپنے وطن میں بحران کے اثرات کو کم کرنے
کی کوشش کی۔ اس سے انگریز اجارہ داریوں اور ہندوستانی قومی سرمائے کے درمیان رقابت
بڑھ گئی۔ جیسے جیسے استعماری حکومت کے خلاف غصہ و نفرت میں اضافہ ہوا ویسے ویسے
انڈین نیشنل کانگریس کا وقار بھی بڑھا۔ عوامی دباؤ کے تحت نیشنل کانگریس نے اپنے اجلاس میں جو
دسمبر ۱۹۲۹ء میں لاہور میں ہوا، بائیں بازو کے لیڈر جواہر لال نہرو کو اپنا صدر چنا اور اعلان کیا کہ
اس کا بنیادی مقصد ہندوستان کی مکمل آزادی ہے۔ ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی کی تحریک
شروع کر دی گئی۔

۱۹۳۰ء کے بعد کے چند برسوں کی انقلابی تحریک انگریزوں کو ہندوستان سے نکال
باہر کرنے میں تو کامیاب نہیں ہوئی لیکن اب وہ زیادہ منظم تھی اور عام لوگ اس میں زیادہ سرگرم

عمل تھے۔ سیاسی و سماجی زندگی میں مزدوروں کا رول بڑھا۔ اس بات کا ثبوت مزدور تحریک کے لیڈروں کے مقدمے سے ملا۔ یہ مقدمہ میرٹھ میں ۱۹۳۳ء تک چلتا رہا۔ ملزمین نے اسے انگریز حکام کی مذمت کرنے اور مارکسی لیننی نظریے کا پرچار کرنے کے لئے استعمال کیا اور انگریز حکام انہیں سزا کی مدت پوری ہونے سے پہلے ہی رہا کرنے پر مجبور ہوئے۔

انقلابی تحریک میں ٹھہراؤ بڑے مختصر وقفے کے لئے آیا اور ۱۹۳۵ء میں نئے ہندوستانی آئین کے خلاف احتجاج کی پرزور تحریک شروع ہوئی۔

اس ہاتھ پاؤں باندھ دینے والے آئین کی مخالفت میں کانگریس، کمیونسٹ پارٹی اور مزدوروں کسانوں اور نوجوانوں کی تنظیمیں پیش پیش تھیں۔ اس سے ایک متحدہ سامراج دشمن محاذ قائم کرنے کے لئے زمین ہموار ہوئی۔ ۱۹۳۷ء نے سامراج دشمن تحریک کے نئے دور کا آغاز کیا۔ اس سال چھ لاکھ مزدوروں نے ہڑتالوں میں حصہ لیا۔ بمبئی اور کانپور کے مزدوروں نے معاشی مانگوں کے ساتھ ساتھ کمیونسٹ پارٹی کے قانونی بنائے جانے کا مطالبہ بھی کیا۔ ہندوستان کے کمیونسٹوں کی کوششوں کی بدولت ۱۹۳۸ء میں ٹریڈ یونین تحریک میں پھوٹ ختم ہو گئی اور ایک واحد ٹریڈ یونین مرکز قائم ہوا۔ اب سیاسی امور میں پرولتاریہ اور کسان روز بروز اہم حصہ لینے لگے تھے ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی ایک اہم سیاسی عنصر ہوتی جا رہی تھی جو کمیونسٹ انٹرنیشنل کی ساتویں کانگریس کی قراردادوں کے مطابق ایک متحدہ سامراج دشمن محاذ کے لئے جد و جہد کر رہی تھی۔

انڈونیشیا

انڈونیشیا کی زیادہ تر آبادی کے لئے پہلی جنگ عظیم کے اثرات اور اس کی دیرینہ منڈیوں کے ہاتھ سے نکل جانے کا مطلب معاشی تباہی تھا۔ باغات اور کھیتوں کی پیداوار کے ڈھیر لگ گئے جن کا کوئی خریدار نہ تھا۔ ڈچ حاکموں کے غلبے کے خلاف اور ان کے مقامی گماشتوں کے خلاف جد و جہد کے معروضی تقاضے تیزی سے بڑھتے گئے۔ کسانوں کے اقدامات آئے دن ہونے لگے اگرچہ وہ غیر منظم ہوتے تھے۔ مذہبی و یوٹوپیائی خیالات کے زیر اثر کسان تحریک کی سرگرمی

بڑھنے لگی۔ "سریکت اسلام"، نامی تنظیم جسے پیٹی اور متوسط بورژوازی کے ارکان نے ۱۹۱۲ء میں قائم کیا تھا پہلی جنگ عظیم کے دوران صحیح معنوں میں عوامی تنظیم بن چکی تھی۔ جس کی قیادت بڑی حد تک ترقی پسند دانشوروں کے ہاتھ میں آتی جارہی تھی۔

ہڑتال کی تحریک پیمانے کے اعتبار سے بڑھی اور ہڑتالوں میں مزدوروں کو اکثر کامیابی ہوئی۔ چونکہ ملک میں بڑے قومی صنعتی کارخانے تھے ہی نہیں اس لئے پرولتاریہ نے جو طبقاتی لڑائی لڑی اس کے دھارے بھی سامراج دشمن جدوجہد کے دھارے میں مل گئے۔ مئی ۱۹۲۰ء میں سوشل ڈیموکریٹک یونین نے انڈونیشیائی کمیونسٹ پارٹی کی شکل اختیار کرلی جسے اسی سال کمیونسٹ انٹرنیشنل میں شامل کرلیا گیا۔ کمیونسٹوں نے مزدوروں کی انجمنوں میں اپنا اثر بڑھالیا۔ "سریکت اسلام"، کی متعدد شاخوں کے سربراہ کمیونسٹ تھے۔ لیکن بائیں بازو کے ڈچ سوشلسٹوں سے جو خامیاں ورثے میں ملی تھیں انہوں نے نوعمر کمیونسٹ پارٹی کو اپنی کامیابیاں راسخ نہ کرنے دیں اور ان کی وجہ سے "سریکت اسلام"، کو ایک وسیع قومی محاذ کی حیثیت سے برقرار نہ رکھا گیا۔

کمیونسٹ پارٹی نے ایک فوری سوشلسٹ انقلاب کے لئے آواز دی "سریکت اسلام"، سے جو ایک پیٹی بورژوا تنظیم تھی، سوشلسٹ پروگرام منظور کروانے کی کوشش میں کمیونسٹوں نے قوم پرستی کی مخالفت کی کہ یہ سامراج کے خلاف جدوجہد میں نقصان دہ ہے انہوں نے مذہب کی بھی مخالفت کی۔ "سریکت اسلام"، میں جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا اور مرکزی ٹریڈ یونین انجمن میں بھی پھیل گیا جہاں پھوٹ پڑ گئی۔ ۱۹۲۳ء میں کمیونسٹوں کو "سریکت اسلام"، سے الگ ہونا پڑا لیکن ان کے ساتھ کئی بڑی شاخیں آگئیں جنہوں نے "سرخ سریکت اسلام"، کا نام اختیار کرلیا۔

شروع میں تجربہ کار ڈچ حکام نے کمیونسٹ پارٹی اور اس سے وابستہ طالب علموں اور خواتین کی انجمنوں کو قانونی طور پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اندرونی نااتفاقی

سے تحریک آزادی کمزور ہو گی۔ ان حکام نے سختی اور جبر مت خاص طور سے سرگرم کمیونسٹوں کے خلاف روا رکھا۔ لیکن جب انہوں نے محنت کشوں میں کمیونسٹوں کے بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ کو کو دیکھا تو انہوں نے عام جبر شروع کر دیا۔ ۱۹۲۳ء کی ریلوے ہڑتال کو جو اُس دور کی اہم ترین ہڑتال تھی، بہانہ بنا کر سخت قوانین کا ایک پورا سلسلہ نافذ کر دیا گیا جن کا رُخ مزدور تحریک کے خلاف تھا۔ کیمونسٹ پارٹی کی طرف سے روز بروز زیادہ بائیں بازو کی غلطیوں نے ڈچ حکام کے کام کو آسان بنا دیا۔ اس کے لیڈروں نے سوویت طرز کی حکومت کا نعرہ تو دیا لیکن وہ سمجھتے تھے کہ کسان انقلاب میں شامل ہونے کے لائق نہیں ہیں۔ اس لئے کہ وہ اپنی فطرت کے لحاظ سے پیٹی بورژوا ہے۔ جس سے اُنہیں ایک ممکنہ اتحادی سے ہاتھ دھونے پڑے۔

بالآخر ۱۹۲۷ء میں کیمونسٹ پارٹی اور اس سے وابستہ تنظیمیں کچل دی گئیں اور انقلابی ٹریڈ یونینیں توڑ دی گئیں۔ پارٹی کو دوبارہ کہیں ۱۹۳۵ء میں جا کر دوبارہ منظم کیا جا سکا۔

جنوبی افریقہ

تاریخ کے جدید دور میں استعماری حکمرانی اور استحصال براعظم افریقہ کے سب سے دور افتادہ علاقوں تک پہنچ چکے تھے اور افریقی قوموں کی زندگی اور رسم و رواج پر اُن کا سخت کنٹرول قائم ہو چکا تھا۔ افریقی معیشت میں برآمد کئے جانے والی فصلوں کی پیداوار اور خام دھاتوں اور معدنیات کی کانکنی کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی جا رہی تھی۔ جنس تجارت اور زر کے رشتے کا عمل بڑھتا جا رہا تھا اور دیرینہ طرز زندگی ختم ہو رہا تھا۔

اس عمل کے نتیجے میں نئی سماجی قوتیں وجود پذیر ہو رہی تھیں۔ کام کی تلاش میں روز بروز زیادہ کسان زمین چھوڑ رہے تھے۔ لیکن اصل پرولتاری کارکن صرف جنوب میں یعنی جنوبی افریقی یونین میں نمودار ہوا۔ دوسرے افریقی ممالک میں اُجرت پر کام کرنے والے مزدور سب فصلی ہوتے تھے۔ جب وہ اپنے گھر واپس جاتے تو وہ اپنے ساتھ پرولتاری شعور کے عناصر بھی لے جاتے اور اس طرح اپنے ہم وطنوں کے سوچنے سمجھنے کے پرانے طریقوں میں تبدیلی کا

موجب بنتے تھے۔

معاشی اعتبار سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ریاست جنوبی افریقی یونین تھی۔ یہ ریاست سرمایہ دار دنیا کی سونے اور پلاٹینم کی کل پیداوار کا ۵۰ فیصد حصہ اور ہیروں کی پیداوار کا ۹۰ فیصد حصہ پیدا کرتی تھی۔ جنوبی افریقی یونین میں دوسرے افریقی ممالک کے مقابلے میں مزدور تحریک پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اس صدی کے شروع میں یورپی اصل کے مزدوروں نے یہاں کئی سوشل ڈیموکریٹک تنظیمیں بنائی تھیں اور ۱۹۰۹ء میں جنوبی افریقی لیبر پارٹی قائم ہو چکی تھی۔ اسی پارٹی سے ۱۹۱۵ء میں انٹرنیشنل سوشلسٹ لیگ قائم ہوئی جس نے عالمی پرولتاریہ کے اتحاد اور جنوبی افریقہ میں رنگ کا لحاظ کئے بغیر مزدور طبقے کے اتحاد کی اپیل کی۔ یونین میں نسل پرستی کا اتنا زور تھا کہ یہ اقدام بہت ہی جرات مندانہ تھا۔

۱۹۲۰ء میں یہ تنظیم کمنٹرن کی ممبر ہو گئی اور اس کے بعد کے برسوں میں کئی دوسری سوشلسٹ تنظیموں کے ساتھ مل کر اس نے خود کو جنوبی افریقہ کی کمیونسٹ پارٹی ہونے کا اعلان کر دیا۔ یہ براعظم افریقہ میں نمودار ہونے والی پہلی کمیونسٹ پارٹی تھی۔ اسے سفید فام مزدوروں نے قائم کیا۔ افریقہ کی تاریخ میں یہ پہلی تنظیم تھی جس نے رنگ کا لحاظ کئے بغیر ممبر بنائے۔ ۱۹۲۰ء میں پارٹی کی ممبری میں افریقیوں کی اکثریت ہو چکی تھی۔ جنوبی افریقی یونین میں مزدوروں کی تحریک اور قومی آزادی کی تحریک افریقہ میں سب سے زیادہ بلند مقام پر پہنچی اور اس نے دوسرے افریقی ملکوں کی قوموں کے قومی اور سیاسی شعور کے ارتقاء پر بڑا اثر ڈالا۔ جنوبی افریقی یونین کے حکمران حلقے تو رجعت پرستی کی پشت پناہ تھے اور براعظم کے لئے بدترین قسم کی نسل پرستی کی علامت بن گئے لیکن وہیں کی مزدور تحریک اور قومی آزادی کی جدوجہد نے انقلابی طرز فکر کو فروغ دیا۔

لاطینی امریکہ

پہلی جنگ عظیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاطینی امریکہ میں جرمنی اور جاپان کی حیثیت بہت ہی گھٹ

گئی اور برطانیہ اور، فرانس کی حیثیت بھی کمزور ہو گئی۔ معروضی طور پر لاطینی امریکی ملکوں کے معاشی ارتقا کے لئے صورتحال ساز گار تھی۔ لاطینی امریکی ملکوں میں سرمایہ دارانہ ارتقار کی روز افزوں شرح نے قومی بورژوازی کی سیاسی غلبہ حاصل کرنے کی کوشش میں اس کی معاشی حیثیت کو مضبوط تر کر دیا۔ لیکن اسے زمینداروں اور بڑی بورژوازی کے بلاک کی پرعزم مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جس کے مفادات سامراجی حلقوں سے جڑے ہوئے تھے۔

بیرونی سرمائے کا مفاد اسی میں تھا کہ لاطینی امریکہ کے ممالک ہمیشہ ہمیشہ پسماندہ ہیں اور اس مقصد سے اس نے ان ممالک کے صنعتی ارتقار کو روکنے اور ان کے ما قبل سرمایہ داری رشتوں اور بڑے بڑے دیہی تعلقوں کے نظام کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی۔ بیرونی سرمایہ خود بھی بڑے بڑے تعلقوں کا مالک تھا۔

۲۱ - ۱۹۲۰ء کے معاشی بحران نے صورتحال کو مزید خراب کر دیا۔ ارجنٹائن کے پیکنگ کے کارخانے میکسیکو کے تیل کے چشمے اور چلی کی نائٹریٹ اور تانبے کی کانیں بند ہونے لگیں اور برازیل کی کافی کے لئے کوئی منڈی نہ رہی۔ ان حالات کی وجہ سے بنیادی ضروریات کی چیزوں کی قیمت تیزی سے بڑھ گئی اور معیار زندگی مزید پست ہوتا چلا گیا۔ عام لوگوں کے غم و غصے کی انتہا نہ رہی اور انقلابی تحریک زور پکڑنے لگی۔ ارجنٹائن میں آبادی نے روس کے اکتوبر انقلاب کا خیر مقدم بڑی گرمجوشی سے کیا۔ نومبر ۱۹۱۸ء میں مزدوروں نے برطانوی دھات ساز کارخانے میں ہڑتال کر دی اور ۸ گھنٹے کے کام کے دن اور کام کے بہتر حالات کا مطالبہ کیا۔ جب ہڑتال توڑنے والوں کی بھرتی شروع ہونے پر احتجاجی مظاہرہ ہوا۔ تو پولیس نے اس پر گولی چلا دی جس میں کئی مزدور مارے گئے۔ جلوس جنازہ میں کوئی دو لاکھ مزدور شریک ہوئے اس جلوس کو بھی مشین گنوں کا نشانہ بنا دیا گیا۔ اس وحشیانہ پن پر غصے میں آکر مزدوروں نے اسلحہ خانوں پر حملہ کر کے اسلحہ حاصل کیا گیا اور پولیس اور فوجوں سے دو بدو لڑائی لڑی۔ اگرچہ مزدوروں کو اس تحریک میں شکست ہوئی لیکن مزدوروں کا اتحاد از خود بڑا کارنامہ تھا۔

روس کے اکتوبر انقلاب کے اعلان کردہ مقاصد کو میکسیکو میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ جب میکسیکو کے عوام کو اُن سوویت فرمانوں کی خبر ملی جن کے ذریعے زمین کسانوں کو اور صنعتی کارخانے مزدوروں کو دیدیئے گئے تھے تو انہوں نے بھی روسی مثال پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ سونارہ کے صوبے میں کانکنوں نے کانوں کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ اور انہیں چلانے کی کوشش کی ۲۱۔۱۹۲۰ء کے دوران یہاں سوویتیں نمودار ہونے لگی تھیں اور یوکاتان میں مزدوروں نے مطالبہ کیا کہ میکسیکو کے سوویت جمہوریہ ہونے کا اعلان کردیا جائے۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ میکسیکو میں اس کے لئے حالات سازگار نہیں تھے۔

برازیل میں پرولتاریہ نے ریو دے جنیرو میں سخت طبقاتی لڑائیاں لڑیں۔ یہاں نومبر ۱۹۱۸ء میں کپڑا مل مزدوروں نے ایک عام ہڑتال کی جس کی حمایت دھات سازی، عمارتی اور چھپائی کی صنعت کے مزدوروں نے کی۔ جب ہڑتال زوروں پر تھی تو نراجیت پسندوں نے بغاوت کردی لیکن بغاوت اچھی طرح منظم نہیں تھی اور اس کا انجام شکست پر ہوا۔

چلی میں معاشی بحران نے ہزارہا مزدوروں کو بیروزگار کردیا۔ چلی کی مزدور فیڈریشن کی بدولت مزدوروں کے بنیادی حقوق کی اسمبلی قائم ہوگئی تھی جس نے بہت سے عام مظاہرے اور جلوس منظم کیے۔ جنوری ۱۹۱۹ء میں پونتو ئمالیز کے مزدوروں نے شہر پر قبضہ کرلیا لیکن حکومت نے ان کے خلاف فوج بھیج دی۔ پیرو میں بھی مزدوروں کی تحریک نے زور پکڑنا شروع کردیا۔

اسی زمانے میں ملک گیر ٹریڈ یونینیں اور کمیونسٹ تنظیمیں نمودار ہونے لگیں جیسے جیسے سماجی تضادات تیز ہوتے ویسے ویسے مزدور طبقہ سیاسی جدوجہد میں روز بروز اہم کردار ادا کرنے لگا۔ لیکن لاطینی امریکی پرولتاریہ ابھی تک پیٹی بورژوا نظریے کا شکار تھا۔ اکتوبر انقلاب نراجیت پسندوں میں پھوٹ کا باعث بنا۔ ان کا ایک حصہ تو یکدم بغاوت کے حق میں پہلے سے بھی زیادہ ہوگیا لیکن دوسرے حصے نے مطالبہ کیا کہ اس طرح کی پالیسیوں کو ترک کرکے مارکزم

لینن ازم کو اپنایا جائے۔ سوشلسٹ تحریک بھی بحران میں مبتلا ہو گئی۔ اس کی ترمیم پسند لیڈرشپ نے روسی پرولتاری انقلاب کی مخالفت کی جبکہ ان کے ممبروں کی بڑی تعداد نے جوش و خروش سے اس واقعے کا خیر مقدم کیا۔ جنوری ۱۹۱۸ء میں ارجنٹائن کی کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آیا۔

روس کے اکتوبر انقلاب کی فتح، کمیونسٹ انٹرنیشنل کے قیام نیز ارجنٹائنا اور میکسیکو کی کمیونسٹ پارٹیوں کے قیام نے دوسرے لاطینی امریکی ملکوں میں بائیں بازو کی طرف مزدور طبقے کے میلان کو تیز تر کیا اور کمیونزم کے خیالات کی مقبولیت بڑھائی۔ لاطینی امریکہ کے نسبتاً ترقی یافتہ ممالک میں جو کمیونسٹ تنظیمیں وجود میں آئی تھیں۔ اُن کے ممبروں کی تعداد کم تھی اور وہ نظریاتی اور تنظیمی لحاظ سے ابھی کمزور تھیں۔ لیکن ان کے تشکیل پا جانے کی حقیقت خود بڑی اہم تھی۔ ان کے قیام سے مقامی حکمران عناصر اور بیرونی سامراجیت کے خلاف جدوجہد میں مزدور طبقہ ایک فعال قوت بن گیا۔

بیرونی سرمائے کے غلبے اور خاص طور سے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی بڑھتی ہوئی توسیع نے ان ملکوں کے قومی ارتقا میں رکاوٹ ڈالی۔ ان ملکوں کی قوموں کو خود اپنے حکمران حلقوں اور بیرونی اجارہ داروں کے دوہرے وحشیانہ جبر و استبداد کا شکار رہنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ لاطینی امریکی ملکوں میں طبقاتی جنگ سامراج دشمن جدوجہد کے ساتھ انتہائی قریبی طور پر وابستہ تھی۔ چنانچہ گوئٹے مالا میں یونائیٹڈ فروٹ کمپنی کے باغات کے مزدوروں نے زیادہ تنخواہ اور کام کے بہتر حالات کا مطالبہ کر کے ہڑتال کر دی اور کولمبیا میں برطانوی اور امریکی ملکیت کے تیل کے کنوؤں کے مزدوروں نے عوامی اقدامات منظم کیے۔ ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۹ء کے دوران یہ تحریک برازیل اور نکاراگوا میں خاص طور سے تیز تھی۔ نکاراگوا میں اس کی قیادت مشہور انقلابی رہنما سانڈینو کر رہے تھے۔ لاطینی امریکہ کے ملکوں میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کی توسیع اور نکاراگوا میں اس کی مداخلت سے لاطینی امریکہ کے مزدور طبقے کو، جو قومی جمہوری قوتوں کا ہراول تھا، ایک متحدہ مربوط

اقدام کی اہمیت کا احساس ہوا۔ اس سلسلے میں لاطینی امریکہ کی کمیونسٹ پارٹیوں کی کانفرنس بڑی اہمیت رکھتی ہے جو بیونس آئرس میں پہلی مرتبہ جون ۱۹۲۹ء میں ہوئی۔ اس میں سامراج دشمن جدوجہد میں کمیونسٹ پارٹیوں کے رول اور لاطینی امریکہ انقلاب کی نوعیت جیسے مسائل کو اہمیت دی گئی۔ عام رائے یہ تھی کہ پرولتاریہ کی سرکردگی میں ایک جاگیرداری دشمن، سامراج دشمن، جمہوری انقلاب کے ذریعے ہی زمیندارانہ تعلقوں کے نظام اور سامراج کے غلبے کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ کانفرنس متوسط پرتوں، قومی بورژوازی کے سلسلے میں پرولتاریہ اور اس کے ہراول یعنی کمیونسٹ پارٹیوں کے لئے کوئی واضح تدبیری پروگرام تیار کرنے میں ناکام رہی۔

اس کانفرنس کے فیصلے مزدور تحریک کو نظریاتی اور تنظیمی اعتبار سے مضبوط بنانے میں مفید ثابت ہوئے۔ لیکن مزدور تحریک میں اصلاح پسندی کے اثرات اور مہم جوئیت پسندی کی باقیات کو ختم کرنے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔ تنگ نظری اور ٹراٹسکی ازم سے جو انقلابی سامراج دشمن قوتوں میں پھوٹ ڈالنے کا رجحان پروان چڑھا رہے تھے، مزدوروں کے مقصد کو بہت نقصان پہنچ رہا تھا

شرقی ممالک میں نظریاتی جدوجہد اور کمینٹرن

قومی اور نو آبادیاتی مسائل پر متحدہ سامراج دشمن محاذ کا مسئلہ کمینٹرن کے عملی اور نظریاتی کام میں بنیادی اہمیت کا حامل تھا۔ متحدہ سامراج دشمن محاذ کا لیننی نظریہ ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔ جس نے کمیونسٹوں کو ایسی تمام قوتوں کے اتحاد کے لئے جدوجہد پر راغب کیا جو سامراج سے ٹکر لینے کی اہلیت رکھتی ہوں۔ مارکسزم لیننزم سے کلی مطابقت رکھتے ہوئے کمیونسٹ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کسی ملک میں مزدور طبقے کے لئے رہنمائی کرنے کے معروضی و موضوعی حالات ابھی موجود نہیں ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انقلابی قومی جمہوریت پسند قیادت کسی حد تک سماجی ترقی کے لئے سرمایہ دار مخالف اقدامات اُٹھاتی ہے تو یہ قومی آزادی کے انقلابات اور سائنسی سوشلزم کی اہم کامیابی ہے۔

کچھ لوگوں کے مطابق مشرق کی قومی بورژوازی اپنی فطرت میں سامراج کی اتحادی تھی

اور قومی آزادی کی جدوجہد میں بڑی رکاوٹ تھی ۔ مشرق کے "بائیں بازو" کے انقلابیوں کا خیال تھا کہ جیسے لبرل بورژوازی روس میں ایک رجعتی قوت میں تبدیل ہوئی ہے اور جمہوری آزادی صرف سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے ہی ممکن ہوئی ، اسی طرح مشرقی ملکوں میں قومی بورژوازی تحریک آزادی میں شامل نہیں ہو سکتی ۔ اس لئے مشرق میں آنے والا انقلاب محض سامراج دشمن ہی نہیں بلکہ قومی بورژوازی کے خلاف بھی ہونا چاہئے ۔ دوسرے لفظوں میں اسے ابتدا ہی سے سوشلسٹ کردار اپنا لینا چاہئے ۔

لینن نے ایسے تصورات کو سختی سے بے نقاب کیا اور بالشویک پارٹی کی حکمت عملی کو میکانکی طور پر دہرانے کی شدید مخالفت کی ۔ لینن نے ایسے نظریات کو غیر سائنسی اور تنگ نظر گروہ بندی کے رجحانات قرار دیا ۔ ظاہر ہے لینن یہ سمجھتا تھا کہ قومی بورژوازی کے ساتھ سامراج دشمن اتحاد مستقل یا دائمی نوعیت کا نہیں ہے ۔ سب سے پہلے مزدور طبقے کی تنظیموں کو اس اتحاد کی ضرورت اس لیے بھی تھی تاکہ مظلوم کسانوں کے وسیع تر حصّوں تک رسائی ہو سکے ۔ جو مشرقی ممالک میں مزدور طبقے کا اہم ترین حلیف تھا ۔

اس نظریے کو حتمی شکل دینے کا معاملہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے مثلاً کچھ ممالک میں قومی بورژوازی نے ایسے محاذوں سے ناطہ توڑ لیا ۔ ان ممالک میں جو سوشلسٹ تبدیلی کی راہ پر گامزن ہوئے ، بورژوازی کے لئے یہ بالکل فطری تھا کہ وہ سماجی تبدیلی کیلئے جدوجہد کرنے والی قوتوں کے ساتھ نہ چل پائیں ۔ ظاہر ہے ہمیشہ یہ طے کرنا آسان نہیں رہا کہ متحدہ محاذ میں کون کون سی قوتیں شامل ہوں اور اس سلسلے میں بعض غلط فیصلے بھی کئے گئے ۔

کمینٹرن کی دوسری کانگریس میں اس نظریے کو رد کر دیا گیا کہ ایسے ممالک جہاں ماقبل سرمایہ دارانہ نظام پیداوار حاوی ہو ، براہ راست پرولتاری انقلاب آنے کا امکان ہے ۔ یہ ملک ترقی کی غیر سرمایہ دارانہ راہ اختیار کر سکتے ہیں بشرطیکہ انہیں عالمی مزدور تحریک اور

سوشلسٹ ممالک کی مدد حاصل ہو۔ لیکن معاشی طور پر پسماندہ ممالک کے لئے ایسی پالیسی اختیار کرنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ تمام ممالک اسی راہ پر ترقی کریں گے۔ سب سے پہلے تو کچھ پسماندہ ممالک وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سرمایہ دار بن سکتے ہیں۔ دوئم کچھ ممالک میں (چین کوریا اور ویتنام) کمیونسٹ پارٹیوں کی سربراہی میں سوشلسٹ انقلابات آسکتے ہیں اور اس طرح ان ممالک میں غیر سرمایہ دارانہ راستہ اپنانے کی ضرورت ہی ختم ہوجاتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ انقلابی قوتیں خود کسی ایسے امکان سے فائدہ اٹھانے کی پوزیشن میں نہ ہوں۔

"بائیں بازو" کے انقلابی سمجھتے تھے کہ کمیونسٹوں کا صرف ایک ہی فریضہ ہے کہ وہ عوامی جدوجہد کی راہنمائی کریں اور انقلاب کے جمہوری مرحلے کو پھلانگتے ہوئے قومی جدوجہد آزادی کو پرولتاری انقلابات میں بدل دیں۔ یہ انتہا پسند اس حقیقت سے قطعی طور پر نابلد نہ تھے کہ مشرقی ممالک میں پرولتاریہ عددی طور پر کم اور بہت کمزور ہے یا سرے سے وجود ہی نہیں رکھتا لیکن عملی طور پر وہ مزدور طبقے اور اس کی تحریک کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے تھے۔ وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں تھے کہ مزدوروں کی بڑی تعداد کسانوں سے تعلق رکھتی ہے جو ان پڑھ، مذہبی جنونی اور رجعت پسند سیاسی نظریات کے زیر اثر تھے۔

"بائیں بازو" کے سرکردہ رہنما ایم این رائے کا خیال تھا کہ بورژوا قوم پرستی سامراج کے ساتھ لڑنے کی اہلیت نہیں رکھتی اور بیشتر ملکوں میں سامراج کی مدد سے مقامی محنت کشوں کا استحصال کررہی ہے۔ اس لئے سامراج دشمن جدوجہد کا پورا بوجھ پرولتاریہ کے کاندھوں پر آپڑا ہے۔ رائے نے کمینٹرن اور قومی آزادی کی تحریکوں کے قوم پرست عناصر کے درمیان رابطے کی مخالفت کی اور کہا کہ بورژوازی اپنے عوام میں کوئی اثر و نفوذ نہیں رکھتی۔ کمیونسٹوں کا اہم ترین فریضہ یہ ہے کہ وہ قیادت کے اس خلاء کو پر کریں اور یہ کہ طبقاتی تضادات قومی تضادات پر حاوی آچکے ہیں۔

مشرق میں بائیں بازو کی انتہا پسندی کے فروغ پانے کی بڑی وجہ ان ممالک میں جو

ابھی ابھی سرمایہ داری کی راہ پکڑ رہے تھے، میں پرولتاریہ کا کمزور ہونا تھا۔ اس زمانے میں کمیونسٹ پارٹیوں کی رکنیت اختیار کرنے والوں کی اکثریت قوم پرست انقلابیوں سے تعلق رکھتی تھی۔ قومی بورژوازی کی غیر مستقل مزاجی سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان طبقات کی قیادت میں تحریک آزادی چلنے کے کوئی امکانات نہیں ہیں۔ یہ انقلابی جو ابھی ابھی مارکسزم کی طرف مائل ہو رہے تھے کی فطری خواہش تھی کہ جتنا جلد ممکن ہو سکے، ہر قسم کے قومی اور طبقاتی استحصال سے نجات حاصل کی جا سکے۔ انہیں ابھی زیادہ عملی تجربہ بھی نہیں تھا۔

لینن

لینن نے ایسے خطرات کی نشاندھی کی تھی کہ کمیونسٹ پارٹیاں بنانے کے عمل کو مصنوعی طور پر تیز نہ کیا جائے جس کا عملی طور پر مطلب یہ ہوگا کہ جد وجہد آزادی کے مختلف غیر کمیونسٹ رجحانات کو کمیونسٹ رنگ دے دیا جائے۔ کمینٹرن کی دوسری کانگریس میں وسیع پیمانے کی غیر پارٹی تنظیمیں بنانے کا کام کمیونسٹوں کا اولین فریضہ قرار دیا۔ ان تنظیموں میں کام کرتے ہوئے کمیونسٹوں کو اپنی تنظیم بہتر بنانا اور عوام میں اپنے اثر میں اضافہ کرنا تھا۔ ۱۹۲۰ء کی دھائی میں محنت کشوں کی وسیع عوامی تنظیمیں بنانا مشرقی ممالک کی اہم ضرورت تھی۔ اس کام کا مقصد کسی متبادل راستے کو جنم دینا نہیں تھا بلکہ کچھ علاقوں میں کمیونسٹ پارٹیاں بنانے کی لازمی شرط تھا۔

لینن نے ایم این رائے کے غیر حقیقت پسندانہ موقف پر شدید تنقید کی اور کہا کہ ہندوستان میں سماجی انقلاب کی توقع کرنا حقیقت سے آنکھیں چرانا ہے حتیٰ کہ یہاں پر ابھی تک ایک کمیونسٹ پارٹی بھی موجود نہیں رکھتی۔ لینن کے مطابق بائیں بازو کی کجرویوں کی وجہ سے مشرق کی نوخیز اور کمزور کمیونسٹ تحریک کو عوام سے دور رکھنے میں مدد مل سکتی ہے اور یہ تحریک بائیں بازو کی گروہ بندی کا شکار ہو سکتی ہے اور اس طرح سامراج سے فیصلہ کن لڑائی سے پہلے ہی شکست خوردہ ہو سکتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی لینن اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ ہر قسم کے حالات میں ہر قیمت پر پرولتاری تحریک کا علیحدہ تشخص برقرار رکھنے کی ضرورت ہے بے شک وہ کتنی ہی نوزائیدہ

شکل میں کیوں نہ ہوں۔ لینن سمجھتا تھا کہ ان نو آبادیاتی ممالک میں مخصوص صورتحال میں کمیونسٹ اس تحریک کی قیادت بھی کر سکتے ہیں۔ متحدہ محاذ بنانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مزدور طبقہ اس تحریک کی قیادت حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے اور اس کا دم چھلہ بن کر رہ جائے لیکن وہ لوگ جو یہ سمجھتے تھے کہ عوام میں مسلسل کام کرنے کے بغیر ہی کمیونسٹ یہ قیادت حاصل کر سکتے ہیں، غلطی پر ہیں اور پرولتاری تحریک کو مضبوط بنانے کے ارادوں کے پیچھے اسے بربادی کی طرف لے جا رہے ہیں۔

چینی کمیونسٹ ابتدا میں سمجھتے تھے کہ ان کا فوری فریضہ سوشلسٹ انقلاب برپا کرنا ہے جبکہ ابھی وہ مزدور طبقہ میں مضبوط جڑیں نہیں رکھتے تھے اور قومی تحریک آزادی میں کوئی اثر و نفوذ نہیں رکھتے تھے۔ ۱۹۲۳ء میں پیکنگ میں ریلوے کی ہڑتال کی ناکامی نے چینی کمیونسٹوں کو اتحادیوں کی ضرورت کا احساس دلایا۔ کمینٹرن نے چین میں کومنتانگ اور انڈونیشیا میں سریکت اسلام کو عام بورژوا پارٹیاں تسلیم نہیں کیا اور کمیونسٹوں کی ان میں شمولیت کی حمایت کی۔ یہ بات کہ بعد میں یہ کثیر الطبقاتی پارٹیاں بورژوا عناصر کے قبضے میں چلی گئیں، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سامراج دشمن جدوجہد میں شروع ہی سے ان کا کوئی کردار نہ تھا واقعات اس بات کے شاہد ہیں کہ ایسی تنظیموں میں کام کر کے کمیونسٹوں نے اپنی آزادی اور خودمختاری کو برقرار رکھا اور اپنی بنیادیں مضبوط بناتے گئے۔ کومنتانگ میں کام کے ذریعے کمیونسٹوں نے اسے ایک ایسی قومی قوت میں تبدیل کر دیا جس سے عوام میں زبردست ابھار آیا۔ اور اس نے چینی انقلاب میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اس کثیر الطبقاتی پارٹی میں انقلابیوں اور بورژوا، جاگیردار طبقوں میں اس کی قیادت کے لئے کشمکش جاری رہی۔

کمینٹرن کی کانگریس میں ان خطرات کی جانب بھی توجہ دلائی گئی کہ پیٹی بورژوازی کے ساتھ اتحاد کے دوران کمیونسٹ بتدریج اپنا پرولتاری کردار کھو سکتے ہیں۔ باقی آئندہ

ایشیا و افریقہ کے ممالک میں قومی جمہوریت کی حکمتِ عملی

ڈاکٹر شاہد حسن
ڈاکٹر صادق محمود

موجودہ دَور میں نو آزاد ممالک میں جدوجہد کی خصوصیات

قومی آزادی کی جدوجہد، سیاسی آزادی کے حصول کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ایک نئے اور مزید پیچیدہ دور میں داخل ہو جاتی ہے جس کا مقصد سماجی ترقی اور معاشی، نظریاتی، سیاسی اور ثقافتی میدانوں میں نوآبادیاتی ورثے کے خاتمے کے لیے جدوجہد کرنا ہوتا ہے۔

ا

ساتویں اور آٹھویں عشروں کے آغاز میں ایشیا و افریقہ کی قومی آزادی کی تحریک کا مقصد سامراجی دباؤ کے خلاف مزاحمت اور ان بڑا عظموں کے ممالک کی معاشی و سماجی ترقی کے لیے جدوجہد رہا ہے۔ ان میں بہت سے ملکوں میں قومی آزادی کی تحریک عملاً جاگیردار اور سرمایہ دار بالخصوص اجارہ دار سرمایہ دار طبقے کے خلاف جدوجہد میں تبدیل ہو گئی۔ وہ جمہوری قوتیں، جو آج سامراجی استحصال کے خلاف نبرد آزما ہیں، سرمایہ دارانہ پیداواری تعلقات کے خلاف جدوجہد سے صرفِ نظر نہیں کر سکتیں کیونکہ آج یہ تعلقات بھی سماجی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔ اس کے علاوہ عالمی سطح پر قوت کا توازن جمہوریت اور سوشلزم کے حق میں استوار ہو جانے کے نتیجے میں ان ملکوں کی معاشی پسماندگی اور عالمی سرمایہ دارانہ نظام پر ان کا انحصار، محنت کش عوام کے کندھوں پر ایک بڑا بوجھ ہے۔ ایشیا اور افریقہ کے ممالک اپنی صنعتی اور زرعی پیداوار میں اضافے کے باوجود سامراجی استحصال

کا شکار ہیں۔ ان ملکوں کی معاشی صورتِ حال اور اس کے ساتھ ہی وہاں کے محنت کش عوام کی حالت دگرگوں ہے۔ سرمایہ دار دنیا کا ۶۵ فیصد حصہ ترقی پذیر ملکوں میں آباد ہے لیکن ان کے حصے میں مجموعی پیداوار کا ۱۰ فیصد، بیرونی تجارت کا ۲۰ فیصد، غذائی اجناس کا ۴۰ فیصد اور سونے کے ذخائر کا ۲۱ فیصد حصہ آتا ہے۔ ان ممالک میں فی کس اوسط آمدنی ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں کے مقابلے میں ۱۰ فیصد ہے۔

ایشیا و افریقہ کے ملکوں کو معاشی ترقی کے لئے سرمایہ فراہم کرنے میں سخت مشکلات درپیش ہیں جنہیں سامراجی قوتیں اپنے نوآبادیاتی مقاصد کے حصول کے لئے وسیع پیمانے پر استعمال کرتی ہیں۔ اقتصادی امداد کا اصل مقصد ان ملکوں کی معاشی غلامی اور سیاسی فرمانبرداری کو مزید مستحکم کرنا ہوتا ہے۔ بیرونی قرضوں اور ان کی شرح میں اضافہ نہ صرف ان ملکوں کی مالیاتی حالت بلکہ ان کے مستقبل کے لئے بھی ایک خطرہ ہے۔ معاشی لوٹ کھسوٹ کے مختلف حربوں کے ذریعے سامراج منافع کی شکل میں ترقی پذیر ملکوں کی قومی آمدنی کا تقریباً ۲۰ فیصد حصہ ہڑپ کر جاتا ہے۔

ایشیا و افریقہ کے ملکوں کی پیداوار میں نمایاں اضافے کے باوجود عوام کی مالی حالت میں کوئی واضح بہتری نہیں ہوئی ہے کیونکہ قومی دولت کے بڑے حصے پر استحصالی طبقات کا تصرف ہے۔ مزدور طبقے کو شدید جد و جہد کے بعد محنت کے تحفظ کے لئے برائے نام ضمانتیں حاصل ہوتی ہیں اور ان کی حیثیت بھی محض کاغذی قوانین سے زیادہ نہیں ہوتی ضروریاتِ زندگی اور غذائی اشیاء کی قیمتوں میں ہر جگہ مسلسل اضافہ ہو رہا ہے جس سے مزدوروں کی حقیقی تنخواہ مسلسل کم ہو رہی ہے۔ بڑھتی ہوئی قومی دولت میں مزدوروں کا حصہ کم ہوتا جا رہا ہے جب کہ استحصالی طبقات کا حصہ دن بدن بڑھ رہا ہے۔

کروڑوں کسانوں اور زرعی مزدوروں کی حالت صنعتی مزدوروں سے بھی بدتر ہے اقتدار پر قابض بورژوازی کی طرف سے کی جانے والی زرعی اصلاحات نے زرعی نظام کی

کوئی بنیادی تعمیرِ نو نہیں کی ہے اور نہ ہی کسانوں کے مفادات کو مدِنظر رکھا ہے ۔ نیم جاگیردار انحصالی اب بھی گاؤں میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ زیادہ تر ملکوں میں زرعی قوانین سے کھاتے پیتے، خوش حال کسانوں کو ہی فوائد حاصل ہوتے ہیں جب کہ محنت کش غربت و مفلسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

شہری درمیانہ طبقہ بھی ان ہی مسائل سے دوچار ہے جن کا مزدوروں کو سامنا ہے۔ مثلاً مہنگائی، بیروزگاری، رہائشی مشکلات وغیرہ۔ شہری و دیہاتی دانشور طبقے خصوصاً نوجوان ضروریاتِ زندگی کی بڑھتی ہوئی قیمتوں اور سائنس و ادب سے استفادے کے مواقع کی عدم موجودگی کی وجہ سے پریشان ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگوں میں بیروزگاری کا سنگین مسئلہ موجود ہے جس کی وجہ صنعتی اور معاشی ترقی کا پست معیار ہے۔

تجربے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ترقی پذیر ممالک سرمایہ دارانہ نظام کے حلقے میں رہتے ہوئے کبھی بھی اپنے فوری سماجی اور معاشی مسائل کو وسیع تر قومی مفادات کے مطابق حل نہیں کر سکتے۔ ترقی کا سرمایہ دارانہ راستہ عوام کی غربت اور دکھوں میں اضافے کا راستہ ہے۔ زندگی نے محنت کشوں کو قائل کر دیا ہے کہ سماجی ترقی کے لئے سامراج پر انحصار کا خاتمہ اور سماجی و معاشی میدانوں میں غیر سرمایہ دارانہ اصلاحات کا نفاذ ناگزیر ہے۔

ایشیا و افریقہ کی قومی جمہوری قوتوں کے نقطۂ نظر سے عوام کے سامنے مندرجہ ذیل مقاصد ہیں: ۱ سامراج کی معاشی جڑوں کا مکمل خاتمہ ۲ معیشت کی پس ماندہ اور خام زرعی نوعیت کا خاتمہ ۳ پیداواری قوتوں کی زبردست ترقی، سیاسی، معاشی اور ثقافتی زندگی میں راہنمائی کرنے کے اہل قومی ماہرین کی تیاری۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ غیر ملکی اور مقامی اجارہ داروں کے تسلط کا خاتمہ کیا جائے اور سرکاری شعبہ میں ایسے رہنما کردار کو اجاگر کیا جائے جو ان اجارہ داروں کا مقابلہ کر سکے۔ زرعی سوال کو کسانوں کے وسیع حلقوں کے مفاد میں حل کیا جائے، آزاد اور جدید

صنعت کو منظم کیا جائے اور اسے ترقی دی جائے، عوام کا معیارِ زندگی بلند کیا جائے۔ قومی معیشت کی ترقی کے لئے ناگزیر اندرونی منڈی کو وسیع کیا جائے۔ سماجی زندگی کو جمہوری رنگ دیا جائے اور معاشی و سماجی مسائل کے حل میں عوام کے وسیع حلقوں کی سرگرم شرکت کو تقویت دی جائے۔

یہ سب مسائل اپنے کردار کے لحاظ سے جمہوری مسائل ہیں۔ ان کا حصول سامراج جاگیرداری اور مقامی رجعت پسند قوتوں کے خلاف مسلسل جدوجہد کا تقاضہ کرتا ہے۔ آبادی کے بیشتر حلقے، مزدور، کسان، دانشور، بورژوازی کے درمیانے اور چھوٹے محب وطن حصے اور حتیٰ کہ ریاستی اداروں کے جمہوری عناصر بھی ان مسائل کے حل میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ مزدور طبقے کی ہراول جماعتوں کی بنیادی دستاویزات میں ترقی کے اس دور کو قومی جمہوری انقلاب کا نام دیا جاتا ہے۔

قومی جمہوری انقلاب ایک ایسے دور میں برپا ہو رہے ہیں جب دنیا سرمایہ دارانہ نظام سے سوشلزم کی طرف جا رہی ہے۔ دو عالمی نظاموں کے درمیان جدوجہد جاری ہے، سوشلزم ایک طاقت بن چکا ہے اور انسانیت کے تاریخی ارتقاء کا رُخ متعین کر چکا ہے، سرمایہ دارانہ نظام پسپائی کی جانب مائل ہے۔ ایشیا افریقہ کے ممالک کو آج جو مسائل درپیش ہیں ماضی میں سوشلسٹ ممالک کامیابی کے ساتھ ان کو حل کر چکے ہیں۔ افریقہ و ایشیا کے ملکوں کو سوشلسٹ کیمپ کی مدد حاصل ہے۔ پھر سرمایہ دارانہ نظام کے عام زوال اور ان ملکوں کے عوام کا سامراجی استحصال کا ذاتی تکلیف دہ تجربہ، اور ان میں سوشلسٹ نظریات کی مقبولیت، یہ سب عوامل قومی آزادی کی جدوجہد کی نوعیت کو متعین کرنے میں مؤثر کردار ادا کر رہے ہیں۔

قومی جمہوری مقاصد کے کامیاب حصول نے سرمایہ دارانہ راہ کے علاوہ ایک دوسری راہ کے امکانات بھی پیدا کر دیئے ہیں۔ یہ سوشلزم کی سمت جانے والی راہ ہے، جو عوام

یہ وسیع تر حلقوں کے مفادات سے مطابقت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایشیا و افریقہ کے بیشتر ملکوں میں قومی آزادی کی جدوجہد کا غالب رجحان غیر سرمایہ دارانہ راہ کی طرف ہے اس سلسلے میں انگولا، ایتھوپیا، موزمبیق، نکاراگوا، جمہوریہ یمن، لاؤس، کمپوچیا، افغانستان وغیرہ کی جدید مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

مختلف ملکوں اور خطوں میں جدوجہد آزادی کے امکانات اور حالات مختلف ہیں۔ جو جدوجہد کے راستے اس کے طریقے اور شکل کو متعین کرتے ہیں سرمایہ دارانہ نہج پر ترقی کرنے والے ملکوں میں بھی جدوجہد آزادی کی نوعیت یکساں نہیں ہے۔ اولاً اس کا انحصار اس پر ہے کہ اقتدار پر بورژوازی کے کس حصے کا قبضہ ہے۔ ملک میں طبقاتی اور سیاسی قوتوں کا توازن کیا ہے۔ ان ملکوں میں جہاں اقتدار ایک ایسی بڑی بورژوازی کے ہاتھوں میں ہے جس کے جاگیردار طبقے، غیر ملکی قوتوں اور اجارہ داروں کے ساتھ گہرے تعلقات ہیں وہاں پر سماجی و معاشی مسائل صرف اس حد تک حل کیے جاسکتے ہیں جہاں تک یہ بورژوازی کے لئے سود مند ہوں، ان ممالک میں ترقی کی خالصتاً سرمایہ دارانہ راہ کو اختیار کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے ممالک میں تھائی لینڈ، فلپائن اور مراکش وغیرہ شامل ہیں۔

وہ ممالک جہاں جمہوری قوتیں بہتر طور پر منظم ہیں، بورژوازی کے محب وطن عناصر ان طاقتوں کے ساتھ ملنے پر مجبور ہیں جو جاگیردار قوتوں کے خلاف اور قومی ترقی کے لئے ایک سماجی و معاشی پروگرام کے ساتھ جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں ہندوستان کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔

ایسے ملکوں کی تعداد اب بڑھتی جارہی ہے جہاں پر قیادت انقلابی جمہوری قوتوں کے پاس ہے مثلاً افغانستان۔ انگولا۔ ایتھوپیا۔ جنوبی یمن، نکاراگوا، کمپوچیا الجزائر۔ شام۔ لیبیا۔ تنزانیہ۔ برما اور بعض دوسرے ممالک بھی اس صف میں شامل

ہیں۔ ان ملکوں میں ایسی سماجی تبدیلیاں ہو رہی ہیں جو عوام کے مفاد میں ہیں، اور قومی آزادی کو مستحکم کر رہی ہیں۔ ترقی کے غیر سرمایہ دارانہ راستے یا دوسرے لفظوں میں سوشلسٹ ارتقاء کے راستے پر گامزن ممالک قومی جدوجہد آزادی کے فروغ کے لئے ایک مثال اور محرک کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ایشیا و افریقہ کے سب ملکوں میں انقلابی عمل کی نوعیت یکساں نہیں ہے۔ ترقی پسند سماجی تبدیلیاں اپنی گہرائی اور وسعت کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ ان کا تعلق اقتدار کے کردار سے ہے یعنی یہ کہ قیادت کس طبقے کے ہاتھ میں ہے، سیاسی اقتدار کس نوعیت کا ہے۔ مختلف اصلاحات کن طبقات کے مفادات کے پیش نظر کی جا رہی ہیں۔

اس طرح قومی آزادی کی تحریک میں نئی ترقی پسند کیفیتی تبدیلیاں آ رہی ہیں جنہوں نے موجودہ قومی جمہوری تبدیلیوں کو بھی ایک نئی سماجی وسعت دی ہے۔

۲

لینن نے نوآبادیاتی نظام اور غلام ممالک کی مخصوص حالت کا تجزیہ کرتے ہوئے اور ان کی معاشی پسماندگی، غیر ترقی یافتہ سماجی تعلقات اور دیہاتی آبادی کی اکثریت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نظریے کو فروغ دیا کہ معاشی لحاظ سے پسماندہ مختلف ممالک کا سرمایہ داری کے مرحلے کو طے کئے بغیر سوشلزم کی طرف آنے کا عملی امکان موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی لینن نے اس عمل کی کامیابی کے لئے دو شرائط بھی بتائیں۔

۱۔ محنت کش عوام کے سیاسی شعور، ان کی خود مختار سیاسی سرگرمیوں اور تنظیم کی مضبوطی۔

۲۔ فتح یاب پرولتاریہ کی موجودگی یعنی عالمی سوشلسٹ نظام کی موجودگی، جو عالمی ترقی کے عمل پر فیصلہ کن اثر کا حامل ہو۔ بعد میں لینن نے ترقی کے غیر سرمایہ دارانہ نظریہ کو ٹھوس شکل دی اور اس کو مزید آگے بڑھایا۔ نیز اس کو اقتصادی لحاظ سے پسماندہ

ممالک کے سوشلزم کی طرف آنے کے لئے ایک قابلِ عمل طریقے کے طور پر پیش کیا۔ اس ضمن میں لینن نے جن امور پر توجہ دلائی ان میں اس عمل کا سماجی، معاشی اور سیاسی حجم، ترقی کی شکلیں، اقتدار کا طبقاتی کردار اور اس کے پرولتاری آمریت میں تبدیل ہونے کے امکانات، مارکسسٹ پارٹیوں کی اہمیت، کسانوں کے کوآپریٹو فارم وغیرہ شامل ہیں۔ موجودہ حالات میں بہت سے نو آزاد ممالک کی سماجی و سیاسی ترقی کا غیر معمولی پن اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سماجی ترقی سے وابستہ مفادات کی سیاسی سطح پر ترجمانی کا کام پیٹی بورژوا جمہوریت کے نمائندے کرتے ہیں۔ جن ملکوں میں انقلابی جمہوری حکومتیں مضبوط ہو چکی ہیں، ان کا مقصد سیاسی آزادی اور عالمی سامراج پر بڑھتے ہوئے معاشی انحصار کے تضادات کو ختم کرنا ہے۔ اس کے لئے آزاد معیشت کا قیام ناگزیر ہے۔ یعنی مسلسل اور مستقل مزاجی کے ساتھ بنیادی سماجی و معاشی اصلاحات کا نفاذ ضروری ہے۔ ترقی کی سرمایہ دارانہ راہ سے شعوری انکار، ان ممالک کے لئے سوشلزم کی شکل میں ترقی کے ناگزیر امکان کو روشن کر دیتا ہے۔

ترقی کا غیر سرمایہ دارانہ راستہ ایک نیا تاریخی مظہر ہے۔ اس راہ پر ترقی کرنے والے ممالک میں ہمیشہ پرولتاریہ ہی قیادت نہیں کر رہا ہوتا کیونکہ پرولتاریہ کمزور ہو سکتا ہے اور بعض صورتوں میں اپنا غلبہ قائم کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا لیکن اس کو سوشلسٹ ممالک کی مدد اور عالمی مزدور اور کمیونسٹ تحریک کی حمایت حاصل ہوتی ہے۔

غیر سرمایہ دارانہ ترقی پر گامزن ہونے والے ممالک میں اقتدار کے انقلابی ہونے کی سب سے اہم شرط ترقی پسند داخلی و خارجہ پالیسیوں   ہیں واضح سامراج دشمن رجحان کی موجودگی ہے۔ جاگیردارانہ اور بڑی سرمایہ دارانہ ملکیت کے خاتمے اور کسانوں میں زمین کی تقسیم کے لئے زرعی اصلاحات کرنا، صنعت میں سرکاری شعبے کو جمہوری رنگ دینا اور اُسے معیشت کے بنیادی شعبے میں تبدیل کرنا، سرکاری شعبے کو ترقی دینا اور انفرادی

سرمایہ کاری کو محدود کرنے کے لئے معاشی منصوبہ بندی کو وسیع پیمانے پر استعمال کرنا، عوام کے مادی اور معاشی معیار کو بلند کرنا، سماجی وسیاسی زندگی کو جمہوری رنگ دینا اور محنت کشوں کے وسیع حلقوں کے لئے ریاستی کاموں میں شرکت کے مواقع فراہم کرنا، یعنی محنت کشوں کے مفاد میں مسلسل جمہوری اصلاحات نافذ کرنا۔ یہ سب ترقی پسند اندرونی سیاست کے اہم پہلو ہیں۔

غیر سرمایہ دارانہ ترقی میں معیشت میں ریاستی اور نجی شعبے ساتھ ساتھ قائم رہتے ہیں لیکن اہم ترین سیاسی ومعاشی فیصلے انقلابی جمہوری قیادت کے ہاتھوں میں رہتے ہیں لہٰذا قومی بورژوازی کو ملک کی سیاست اور ترقی پر اثر انداز ہونے کے مواقع حاصل رہتے ہیں اس لئے غیر سرمایہ دارانہ راستے پر ترقی کے دوران شدید طبقاتی لڑائی جاری رہتی ہے اور اس وقت تک جب تک کہ مزدور طبقہ دوسری انقلابی طاقتوں کے ساتھ مل کر غلبہ حاصل نہیں کرے گا، ملک میں غیر سرمایہ دارانہ راستے یا سوشلسٹ رجحان سے ہٹنے کے خطرات موجود رہتے ہیں۔

تمام ترقی پذیر ممالک میں قومی جمہوریت یکساں نہیں ہے اور نہ ہی اس کا عمل یکساں ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت مختلف ملکوں میں ترقی کی تاریخ، سیاسی خصوصیات اور قومی جمہوریت کے سیاسی قوت بن جانے سے ہوتی ہے۔ ان ممالک کی قومی جمہوری حکومتوں میں ایک مشترک چیز ترقی کے سرمایہ دارانہ راستے سے انکار کرنا ہے۔ برسر اقتدار پارٹیوں کے دستاویزات میں ایسے اہم نکات موجود ہیں جیسے انسان کے ہاتھ انسان کے استحصال کا خاتمہ، ذرائع پیداوار کا عوام کے ہاتھوں میں آنا، محنت کے لحاظ سے آمدنی کی تقسیم، شہر اور گاؤں میں چھوٹے محنت کاروں کے کوآپریٹو بنانا وغیرہ۔ ان دستاویزات کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں مارکسزم، لینن ازم اور سوشلسٹ ممالک کے تجربات سے ایسے نظریات حاصل کرنے کی خواہش پائی جاتی ہے، جیسے صنعت کاری بنیاد سب معاشی ترقی، ریاستی

منصوبہ بندی کی بنیاد پر صنعتی ترقی وغیرہ۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انقلابی جمہوری حکومتیں سرمایہ دارانہ ترقی کے دیوالیہ پن، سیاسی و معاشی ضوابط اور نئے مسائل کے حل کے بہت سے پرانے طریقوں کو مسترد کر رہی ہیں۔

اس کے ساتھ ہی قومی جمہوری حکومتوں، پارٹیوں اور اُن کے مفکروں کے پروگراموں میں بعض اوقات اہم نظریاتی اور سیاسی نقائص بھی ہوتے ہیں سائنسی سوشلزم کے عناصر کے ساتھ ساتھ پیٹی بورژوا سوچ ان کے نظریات پر غالب رہتی ہے مختلف نظریات کے ملاپ، قومی جمہوری مفکروں کے اپنے ملکوں کے حال اور مستقبل کے بارے میں نظریات میں اختلاف کی اپنی وجوہات ہیں۔ ان کی وضاحت سب سے پہلے اس بات سے ہوتی ہے کہ اُن کے خیالات پیچیدہ حالات کا عکس ہوتے ہیں۔ اُن پر متضاد سماجی نظریات اور ملک کی تاریخی روایات کا اثر ہوتا ہے۔ معاشی اور ثقافتی پس ماندگی، معیشت کی کثیر المقدار تشکیل کی وجہ سے آبادی کا رنگ برنگا سماجی ڈھانچہ، قبل از سرمایہ داری نظام، بلکہ قبائلی تعلقات کا غلبہ، مزدور طبقے کی کمزوری یا غیر موجودگی، مختلف رجعتی نظریات کا اثر، یہ سارے حقائق مختلف طریقوں سے ان ممالک کی مختلف سیاسی، سماجی قوتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ قومی جمہوری ملکوں کی حکومتوں اور پارٹیوں کے پروگرام میں بعض اوقات تضاد اُن کے عمل میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ان ملکوں کی ترقی کے تجربے سے تاریخی ترقی کے نئے دور کے کچھ ضوابط اور خصوصیات سامنے آتی ہیں۔

غیر ملکی اجارہ داریوں کی پوزیشن ختم کرنے کی پالیسی اختیار کی جا رہی ہے لیکن بعض ممالک میں سامراجی اجارہ داریوں کو محدود کرنے کے ساتھ ہی مخصوص شکلوں اور پیمانوں پر غیر ملکی سرمایہ سے تعاون بھی کیا جاتا ہے۔ غیر ملکی سرمایہ کو محدود کرتے کے ساتھ ہی بعض اوقات انفرادی سرمایہ کو ریاست کے کنٹرول میں لینے کے لئے مقامی بڑی اور درمیانی بورژوازی کے خلاف بھی سخت پالیسی اختیار کی جاتی ہے لیکن سوشلسٹ رجحان کے سب ملکوں میں سرمایہ دار

دشمن اقدامات میں ابھی کافی پختگی اور تسلسل نہیں پایا جاتا ہے۔ معاشی پسماندگی کے خاتمے کے لئے سرکاری شعبے میں معاشی ترقی کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔ ریاست کے زیر انتظام صنعت کاری مزدور طبقے کی تعداد میں اضافہ کرتی ہے۔ اگرچہ ریاستی طبقے کا مقام اور وسعت قومی صنعتی بورژوازی کی افزائش میں خلل ڈالتے ہیں لیکن بعض حالات میں ریاستی شعبہ حکومت سے قریبی بورژوا حلقوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے، جو قومی جمہوریت میں سے نئے نوکر شاہی بورژوا طبقے کو پیدا کرتا ہے۔

کئی ممالک میں زرعی اصلاحات نے جاگیردارانہ اور ساہوکارانہ استحصال کی جڑیں ہلا دی ہیں بلکہ جاگیردار طبقے ہی کو ختم کر دیا ہے۔ سینکڑوں ہزاروں کسانوں کو زمین ملی ہے جس سے بے زمین اور تھوڑے زمین والے کسانوں کی تعداد میں کمی ہوئی ہے مگر اکثر زرعی اصلاحات کسانوں کے وسیع حلقوں کی شرکت کے بغیر ہی لاگو کی گئی ہیں جس سے خوشحال اور مالدار کسانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور ان کا اثر و رسوخ بڑھا ہے۔

تعلیم اور ثقافت کی ترقی اور قومی ماہرین کی تیاری کے اخراجات کا کردار عوامی ہوتا ہے جس سے معروضی طور پر سماجی زندگی میں جمہوریت کا اثر بڑھتا ہے اور یہ بہت ترقی پسندانہ حیثیت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ تعلیم اور ثقافت کی نظریاتی حساسیت میں بھی تبدیلیاں آتی ہیں۔ مغرب کی اندھی غلامی کے نوآبادیاتی نظریات کی جگہ قوم پرستانہ اور انقلابی جمہوری فلسفہ، قومی آزادی اور سامراج دشمنی کے نظریات اور سوشلزم کے نعرے لے لیتے ہیں۔ سماجی و مزدور قوانین کے نفاذ سے محنت کش عوام کی حالت بہتر ہوتی ہے۔

یہ ساری سماجی و معاشی اصلاحات آہستہ آہستہ سماجی تعلقات میں تبدیلی کی طرف لے جاتی ہیں۔ استحصالی طبقات کی پوزیشن کمزور تر کرتی جاتی ہیں اور ان کے سیاسی اثر کو محدود کر دیتی ہیں۔ معروضی طور پر ان اصلاحات کا مطلب ان ملکوں کی سیاسی و سماجی زندگی میں محنت کشوں کے کردار کو بڑھاتا ہے۔ سوشلسٹ ملکوں کا تجربہ شاہد ہے کہ سماجی ترقی اور جمہوریت کے راستے پر مسلسل ترقی کا ناگزیر تعلق نئے معاشرے کی تعمیر میں محنت کشوں کی سرگرم

شرکت سے ہے۔ اس لئے سماجی زندگی کو جمہوری رنگ دینے، عوام کے سیاسی شعور اور سیاسی پہل کاری کو بیدار کرنے کے مسائل ترقی کے غیر سرمایہ دارانہ راستے پر چلنے والے ملکوں کے لئے آج بھی اہم ترین ہیں کیونکہ یہ مسائل ابھی پوری طرح سے حل نہیں ہو سکے ہیں۔

سوشلسٹ رجحان کے حامل ملکوں کی سیاست کی عمومی اور بنیادی حکمتِ عملی سامراج دشمن جاگیردار دشمن اور بعض ممالک میں سرمایہ دار دشمن میلان رکھتی ہے اور عوام کے وسیع حلقوں کے مفادات کی ترجمانی کرتی ہے۔ تجربہ اس بات کا شاہد ہے کہ قومی جمہوری حکومتوں کے غیر سرمایہ دارانہ ترقی اور سوشلسٹ رجحان کے پروگراموں کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے کی ضمانت اس میں ہے کہ اولاً محنت کش عوام اور سب سے پہلے مزدور طبقے پر اُن کا سہارا ہو، مسلسل انقلابی سماجی، معاشی اصلاحات کے لئے جدوجہد میں تمام ترقی پسند قوتیں متحد ہوں۔ دوئم سوشلسٹ کیمپ سے اِن ممالک کے وسیع اور مضبوط تعلقات ہوں۔

آج ترقی کا غیر سرمایہ دارانہ راستہ ان بنیادی پہلوؤں پر مشتمل ہے۔

- معاشی طور پر پسماندہ ملکوں کے لئے سرمایہ دارانہ مرحلے کو طے کئے بغیر سوشلزم کی طرف آنے کا امکان۔
- پرولتاریہ اور غیر پرولتاریہ محنت کش طبقات کے سہارے سوشلزم کی طرف سفر کرنے کے مواقع۔
- قومی جمہوری طاقتوں کی طرف سے مسلسل اور دلیرانہ سامراج دشمن اقدامات۔
- محنت کش عوام اور سب سے پہلے مضبوط ہوتے ہوئے مزدور طبقے کو سماجی زندگی میں اولین مقام پر لانا۔
- سوشلسٹ ممالک اور غیر جانبدار ممالک سے ہمہ گیر اور قریبی تعاون۔
- معاشی، سیاسی، سفارتی، نظریاتی اور تمام دوسرے میدانوں میں سامراج کے خلاف مسلسل جدوجہد کی پالیسی۔

اس طرح ترقی کا غیر سرمایہ دارانہ راستہ معاشی طور پر پسماندہ اور کثیر الاقسام معیشت کے حامل ممالک کی ترقی میں ایک مخصوص تاریخی عبوری دور ہے۔ جس کے دوران قومی جمہوری انقلاب کے مسائل کو حل کیا جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں سوشلزم کی طرف جانے کی سیاسی، معاشی اور ثقافتی بنیادیں قائم ہوتی ہیں۔

۳

قومی آزادی کی جد وجہد کے موجودہ دور کی اہم خصوصیات میں سے ایک مختلف نظریاتی تصورات اور نام نہاد قومی سوشلزم اور اسلامی سوشلزم کی مختلف شکلوں کی بھرمار ہے۔ یہ بڑی حد تک سائنسی سوشلزم اور عالمی سوشلسٹ کیمپ کی معاشی کامیابیوں کے اثرات کا نتیجہ ہے جو ترقی پذیر ممالک کے معروضی اور داخلی عوامل پر مرتب ہوتے ہیں۔ یہ تصورات ان ملکوں کے مخصوص حلقوں کی طرف سے سماجی ترقی کے راستے ڈھونڈنے کی کوششوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ سب جگہ سوشلسٹ تصورات سرکاری نظریہ کی حیثیت رکھتے ہیں مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ سائنسی سوشلزم کی بنیادوں کو لازمی طور پر سمجھا جا رہا ہے اور اُن پر عملدرآمد کیا جا رہا ہے۔ مثلاً نئے سماجی معاشرے کے بنیادی معاشی اصول کی حیثیت سے کبھی کبھار ملی جلی معیشت یعنی ریاستی، کوآپریٹو اور انفرادی شعبوں کے اصولوں کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ اس نظریے کے حامی اکثر ذاتی ملکیت کے خاتمے کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ ان میں سے بہت سارے سماجی عدم مساوات کی وجہ سماجی دولت کی غیر منصفانہ تقسیم میں دیکھتے ہیں، نہ کہ پیداواری تعلقات کے نظام، مخصوص سماجی گروہوں کی ٹھوس حیثیت میں۔ اس لئے معاشرے کے طبقاتی ڈھانچے کا تجزیہ کرتے ہوئے حاصل شدہ رقوم اور آمدنی کو سامنے رکھتے ہوئے اور اُن کے نزدیک سوشلزم کی طرف جانے کا راستہ یا پھر قومی جمہوری آزادی کے حصول کا راستہ تقسیم کے طریقے میں تبدیلی ہے۔

سامراج دشمن جد وجہد کا تجربہ اور سوشلسٹ کیمپ سے بڑھتا ہوا تعاون، ایشیا و

افریقہ کے ممالک میں حقیقی سائنسی سوشلزم کے نظریات کے پھیلنے میں مدد دے رہے ہیں قومی آزادی اور طبقاتی جدوجہد کا عمل قومی جمہوریت پسندوں کے نظریات کے اس سمت میں مزید ارتقا کے لئے محرک بن سکتا ہے۔ سوشلسٹ تصوّرات کے ارتقا کے رُخ کا تعین، اس گروہ کی سماجی و سیاسی پوزیشن، سیاسی قوتوں کے توازن اور دوسرے معروضی و داخلی حقائق سے ہوتا ہے۔

موجودہ پیٹی بورژوا سوشلسٹ نظریات کو انقلابی قوم پرستی، کسان و پنچائتی نظریات اور رجعت پرست نوکر شاہانہ نظریات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ نوکر شاہانہ پیٹی بورژوا سوشلزم عموماً شہری یا فوجی نوکر شاہی کی آمریت کے قیام کی طرف لے جاتا ہے۔ بورژوا قوم پرستانہ سوشلسٹ تصورات بھی ایک سے نہیں ہیں۔ ان میں ہندوستان میں مقبول "جمہوری سوشلزم" بنگالی سوشلزم پاکستان میں بھاشانی اور بھٹو کا اسلامی سوشلزم اور کینیا کا سوشلزم نمایاں ہیں۔ بعض ممالک میں "قبائلی سوشلزم" کے تصوّرات بھی پائے جاتے ہیں۔

قومی بورژوازی کے مفکرین یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اُن کے ملکوں اور علاقوں کے لئے وہ سماجی و سیاسی نظام موزوں نہیں ہے جو سوشلسٹ ملکوں میں قائم ہے اور ترقی کر رہا ہے۔ وہ سوشلزم اور سرمایہ داری کے درمیان "باہمی تعاون" کے ذریعے قربت پیدا کرنے کے لئے سرمایہ دار اور مزدور، کسان اور جاگیردار کے درمیان مخلص تعلقات کی بنیاد پر سوشلزم اور سرمایہ داری کے مقبول ملاپ کے نعرے لگاتے ہیں۔ "قومی سوشلزم" کے بورژوا مفکّر عوام کو اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مارکسزم لینن ازم کے دریافت کردہ سماجی ترقی کے قوانین ایشیا و افریقہ کے ممالک پر لاگو نہیں ہوتے ہیں۔ وہ قومی سوشلزم کو سائنسی سوشلزم کے تبادل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ "قومی سوشلزم" کے بورژوا نظریات کی خصوصیت یہ ہے کہ اُن میں طبقاتی لڑائی سے انکار کیا جاتا ہے۔ طبقاتی تضادات کو مصالحت سے حل کرنے کے درس دیئے جاتے ہیں۔ استحصالیوں اور مظلوموں

کے درمیان ہم آہنگی اور تعاون پیدا کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ انسانی استحصال کے خاتمے کے لئے لفظی نعرے لگاتے ہوئے "قومی سوشلزم" کے یہ بورژوا مفکر خاص طور پر پرولتاری اقتدار کے اصول کی مخالفت کرتے ہیں اور بورژوا ریاست کے طبقاتی کردار کو چھپاتے ہوئے اُسے ایک غیر طبقاتی ادارے کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ انقلاب کے نعم البدل کے طور پر بورژوا قومی اصلاحات کو پیش کیا جاتا ہے۔ "قومی سوشلزم" کا اصل کردار اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قومی بورژوازی عوام کو ملکی ترقی کے اہم ترین مسائل کے حل میں شرکت سے الگ رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ کئی ممالک میں "قومی سوشلزم" کے نظریات کے پرچار کے لئے مذہب کو اہم کردار دیا جاتا ہے، بورژوا "قومی سوشلزم" کی تہذیبی و اخلاقی بنیاد اکثر حکمران طبقات کی طرف سے مذہبی یقین کو سائنسی سوشلزم کے خلاف لڑائی میں ایک نظریاتی، سیاسی حربے کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی عکاسی کرتی ہے۔ "قومی سوشلزم" کے نظریات کی مدد سے بورژوازی سائنسی سوشلزم کے نظریات کے پھیلاؤ، محنت کشوں کے طبقاتی شعور میں اضافے کو روکنے، انہیں طبقاتی جدوجہد کے راستے سے ہٹانے، کمیونسٹ پارٹیوں اور دوسری ترقی پسند قوتوں کو عوام سے کاٹنے اور مزدور طبقے کو اصلاح پسندی کے راستے پر دھکیلنے کی کوشش کرتا ہے۔

ایشیا و افریقہ کے ممالک میں پھیلے ہوئے مارکسی لیننی نظریات پر یقین کرنے والے افراد اس بات کو مدِنظر رکھتے ہیں کہ یہ نظریات معروضی طور پر کس کے مفادات کی عکاسی کرتے ہیں اور کس کے طبقاتی مفادات کی خدمت کرتے ہیں۔ سماج کے باشعور اشخاص ان نظریات کا طبقاتی تجزیہ و تخمینہ لگاتے وقت اقتدار پر قابض گروہوں کی عملی سرگرمیوں، اُن کی نافذ کردہ سماجی و معاشی اصلاحات کی حقیقت اور مقاصد کو مدِنظر رکھتے ہیں۔ مارکسی ان نظریات میں موجودہ صحت مند، جمہوری اصولوں کی حمایت کرتے ہیں اور انہیں مزید ترقی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کروڑوں لوگوں کو سیاسی زندگی کی

طرف آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے اور یہ ابھی تیزی سے سائنسی سوشلزم کے نظریات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے ہیں۔

طبقاتی قوتوں کی ترتیب۔ قومی جمہوری محاذ کے شرکاء

ایشیا و افریقہ کے ملکوں میں تاریخی ترقی کے موجودہ دور کے کردار کے پیش نظر ان ممالک میں مزدور طبقے کی پارٹیوں کی حکمت عملی قومی جمہوری انقلابات کو انجام تک پہنچانا ہے۔ تاکہ اس کے اگلے مرحلے، یعنی سوشلسٹ انقلاب کی طرف جانے کی داخلی اور معروضی بنیادیں قائم کی جا سکیں۔ چونکہ قومی جمہوری انقلابوں کے مقاصد کے حصول میں آبادی کی اکثریت معروضی طور پر دلچسپی رکھتی ہے، اس لئے مارکسی لیننی پارٹیاں اپنے کام میں مرکزی اہمیت ترقی پسند قوتوں کے متحدہ سامراج دشمن قومی جمہوری محاذ کی قیام کو دیتی ہیں۔ متحدہ محاذ کی حکمت عملی کا براہ راست مقصد ترقی پسند قوتوں کا محنت کشوں کے وسیع حلقوں میں کام کرنا اور انہیں اپنی طرف لانا ہے۔

ایشیا و افریقہ کے مختلف ملکوں میں سامراج دشمن متحدہ محاذ کے سماجی و سیاسی ڈھانچے کا انحصار قومی جمہوری انقلاب کی ترقی کے مخصوص حالات کے آبادی کے طبقاتی ڈھانچے، سماجی تضادات کے کردار اور شدت، مزدور طبقے اور دوسری قومی قوتوں کی تنظیم اور شعور پر ہے۔ جدوجہد آزادی کے دوران طبقات اور ان کے مابین تعلقات کی ترقی سے محاذ کے شرکاء کی تعداد میں تبدیلی آسکتی ہے۔ مختلف سماجی و سیاسی گروہ مخصوص ادوار میں مختلف وجوہات کی بنا پر متحدہ محاذ سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف، تحریک میں نئی قوتیں شامل ہوتی رہتی ہیں۔ وہ متحدہ محاذ کو وسیع کرتی ہیں اور اس کی بنیادوں کو مضبوط کرتی ہیں۔ مختلف ملکوں میں جدوجہد کے مختلف ادوار میں متحدہ محاذ کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں لیکن قومی جمہوری تحریک میں عوام کی وسیع اور سرگرم شرکت کسی بھی ملک میں متحدہ محاذ کے قیام کی ناگزیر شرط ہے، کیونکہ اس لڑائی کے دوران عوام

خود اپنے تجربے سے سامراج کے خلاف اور جمہوریت اور سماجی ترقی کے لئے متحدہ محاذ کی اہمیت کے قائل ہوتے ہیں۔

۱

ایشیا و افریقہ کے ممالک کی پرولتاریہ قومی جمہوری تبدیلیوں اور متحدہ سامراج دشمن قومی جمہوری محاذوں کے قیام میں سب سے مستقل مزاج اور انقلابی طبقے کی حیثیت سے حصہ لیتا ہے۔ دنیا کے اس حصہ میں مزدور طبقے کی تعداد نسبتاً کم ہے مثلاً ایشیا میں تمام اُجرتی محنت کشوں کی تعداد کل پیشہ ور آبادی کی ۳۰ فیصد اور افریقہ میں ۲۰ فیصد سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی مختلف ملکوں میں مزدوروں اور ملازمین کی تعداد میں بہت فرق ہے۔ اگرچہ پچھلے کئی سالوں سے ایشیا و افریقہ میں مزدور طبقہ تیزی سے بڑھنے لگا ہے۔ پچھلے پندرہ بیس برسوں میں اُس کی تعداد میں ستّر سے پچھتّر فیصد تک اضافہ ہوا ہے لیکن مسئلہ صرف مزدور طبقے کی کم تعداد نہیں ہے۔ ایشیا اور خصوصاً افریقہ میں مزدوروں کے وسیع حلقوں کا ثقافتی معیار بہت پست ہے اور پیٹی بورژوا، قبائلی، مذہبی، دیہاتی اور دوسرے تعصبات کی بھرمار ہے۔ یہ عوامل مزدور طبقے کے لئے سامراج دشمن جدوجہد کی راہنما قوت بنتے میں مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ پھر بھی بہت سے ملکوں میں صنعتی اور زرعی پرولتاریہ ایک سماجی حقیقت بن چکا ہے اور جدوجہد آزادی میں اہم مقام رکھتا ہے۔

اس جدوجہد کے پہلے دور میں جب قومی آزادی کے حصول کا مسئلہ در پیش تھا، پرولتاریہ کا طبقاتی مفاد بنیادی طور پر پوری قوم کے مفادات اور جدوجہد سے مطابقت رکھتا تھا۔ سارے عوام کی طرح مزدور طبقے کا بنیادی دشمن غیر ملکی سامراج تھا مگر اب بہت سے ملکوں میں صورتحال بدل چکی ہے کیونکہ بورژوازی اقتدار پر قبضے کے بعد زیادہ توجہ اپنے طبقاتی مفادات کے حصول پر دیتی ہے اور پوری قوم کے مفادات کو نقصان پہنچاتی ہے اس لئے وہ خود کو حقیقی قومی قوتوں اور سب سے پہلے مزدور طبقے کے خلاف کھڑا کر

دیتی ہے۔ بڑی بورژوازی کی قومی پوزیشن جتنی زیادہ مضبوط ہوتی جاتی ہے، اُس کے اور مزدور طبقے کے درمیان تضادات اتنے ہی شدید ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان ممالک میں، اپنی مادی حالت کی بہتری کے لئے مزدور طبقے کی جدوجہد بڑی حد تک سامراج کے خلاف جدوجہد ہی ہوتی ہے کیونکہ اب بھی وہی نوآزاد ملکوں کا استحصال کرنے والی سب سے بڑی قوت ہے۔ اُس کے ساتھ ہی پرولتاریہ مقامی بورژوازی کے رجعت پرست رجحانات کے خلاف بھی لڑتا ہے اور اُسے اپنی طبقاتی خود غرضی کو محدود کرتے اور کسی حد تک قوم کی محنت کش اکثریت کے مفادات کو بھی مدنظر رکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس جدوجہد کے دوران پرولتاریہ کی تنظیم کا معیار بلند ہوتا ہے، اُس کی صفیں مزید متحد ہوتی ہیں، اور اس کے طبقاتی شعور میں اضافہ ہوتا ہے۔

نوآزاد ممالک میں طبقاتی جدوجہد کا تجربہ شاہد ہے کہ غیر ملکی سرمایہ کے غلبے، رشوت ستانی، اختیارات کے ناجائز استعمال کے خلاف جمہوریت اور سماجی ترقی کے لئے جدوجہد میں ہڑتالیں ایک طاقتور ہتھیار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ قومی جدوجہد میں مزدور طبقے کی پوزیشن مضبوط کرنے میں ٹریڈ یونین تحریک کا بہت اہم کردار ہے، مگر ان ممالک کی ٹریڈ یونین تحریک میں اتحاد کا فقدان ہے اور بہت سے منتشر ٹریڈ یونین مراکز کام کرتے ہیں۔ مزدور طبقے کے اتحاد کا مسئلہ لبنان، ہندوستان، پاکستان اور ایران جیسے ملکوں میں زیادہ شدت کے ساتھ موجود ہے۔ ان ملکوں میں ٹریڈ یونین تحریک میں انتشار کی وجہ سامراجی ایجنٹوں اور اُن کے پٹھو ٹریڈ یونین مراکز کے لیڈروں کی سازشیں ہیں۔

قومی آزادی کی جدوجہد میں مزدور طبقے کے راہنمایانہ کردار کا انحصار اُس کی تنظیمی، نظریاتی پختگی اور مضبوط مارکسسٹ، لیننسٹ پارٹی کی موجودگی پر ہے۔ قومی آزادی کی تحریکوں کے درمیان کمیونسٹوں کی حیثیت قومی مفادات کے لئے لڑنے والے مستقل مزاج مجاہدوں کی رہی ہے۔ اب وہ سامراج کے سیاسی و معاشی غلبے اور جاگیردارانہ باقیات

کے مکمل خاتمے، جمہوریت اور سماجی ترقی کے لئے مسلسل اور فیصلہ کن جدوجہد کر رہے ہیں۔ سابقہ نوآبادیاتی دنیا میں مزدور طبقے کی ہراول پارٹی کے مقاصد اتنے سادہ نہیں ہیں۔ اس کا تعلق جیسے معروضی صورتحال سے ہے، ویسے ہی داخلی عوامل سے ہے اور سب سے پہلے ان میں مزدور طبقے کی کمی اور کمزوری سے ہے۔

متحدہ قومی جمہوری محاذ کے لئے جدوجہد میں سرگرم حصہ لیتے ہوئے، مزدور طبقہ بہت سے پیچیدہ مسائل کو حل کرتا ہے۔ وہ اپنے طبقاتی مفادات کے لئے مقابلہ کرتا ہے اور اُس کے ساتھ ہی محب وطن قوتوں کے اتحاد کو قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے جو قومی جمہوری انقلاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے، نئے نوآبادیاتی نظام کا مقابلہ کرنے، سماجی ترقی کے راستے پر آگے بڑھنے کے لئے ناگزیر ہے۔ مزدور طبقے کا مفاد اس میں ہے کہ غیراجارہ دارانہ بورژوازی کے محب وطن حصے سامراج دشمن اتحاد میں شامل رہیں مگر نوآبادیاتی اور نئے نوآبادیاتی نظام کے خلاف جدوجہد کے مسائل پر بورژوازی کے ان حصوں کے ساتھ ملنے کے باوجود مزدور طبقہ اپنی طبقاتی خودمختاری کو برقرار رکھتا ہے۔ سماجی اور سیاسی مسائل پر اپنی انفرادی لائن رکھتا ہے اور اُس کے لئے عوام کی اکثریت کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

بین الاقوامی مزدور تحریک کی کامیابیوں اور عالمی سوشلسٹ نظام کی قوت میں اضافے نے کسی بھی ملک میں مزدور طبقے کے وقار کو بلند کرنے کی بنیادیں فراہم کر دی ہیں، چاہے اُس کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔ بہت سے نوآزاد ملکوں میں آہستہ آہستہ مزدور طبقے کے قومی جمہوری انقلاب کے راہنما قوت بننے کے معروضی حالات پیدا ہو رہے ہیں۔ اس کا راستہ مزدور طبقے کے سیاسی اور ٹریڈ یونین اتحاد کو مضبوط کرنے، محنت کش عوام کے اندر اُس کے اثرات پھیلانے میں ہے۔

۲

ایشیا و افریقہ کے ملکوں کی آبادی میں کسانوں کی بھاری اکثریت ہے، مثلاً جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا میں پیشہ ور آبادی کا ۷۰ فیصد حصہ زراعت سے منسلک ہے۔ تاریخی طور پر کسان طاقت ور انقلابی قوت ہے مگر عموماً یہ ایک منتشر قوت ہوتی ہے، اس وجہ سے یہ ڈانواں ڈول رہتی ہے اور اس کے نظریات اور سیاست میں تضادات پائے جاتے ہیں لیکن کوئی دوسری صورت ابھی ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ کسانوں کی بھاری اکثریت ابھی تک نہایت سنگین غربت اور بے کسی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ ابھی تک جاگیردارانہ اور اکثر قبل از جاگیری نشتے بھی باقی ہیں۔

قومی جمہوری انقلاب کے اہم اور بنیادی مقاصد میں سے ایک کسانوں کو جاگیردارانہ اور ساہوکارانہ استحصال، غربت اور جہالت سے نجات دلانا ہے۔ کسانوں کو طبقاتی استحصال اور ظلم سے آزادی دلانے کی بنیادی شرائط عام ناخواندگی کا خاتمہ، کسانوں کے شعور میں اضافہ اور انقلابی جدوجہد کے لئے اُن کی تیاری ہیں۔ محنت کش کسانوں کے پاس بڑے وسیع انقلابی مواقع ہیں مگر قومی جمہوری جدوجہد میں کسان ایک خود مختار قوت کی حیثیت سے سامنے نہیں آتے۔ اس کی اہم رکاوٹوں میں اُن کا اکثر منتشر ہونا، کسانوں کی تنظیموں کی غیر مضبوطی، سیاسی شعور کا پست معیار، عام ناخواندگی، ذاتی ملکیت کا رجحان وغیرہ شامل ہیں۔ کئی ترقی پذیر ملکوں میں جہاں مزدور طبقہ کمزور ہے اور کسان جدوجہد آزادی کی قیادت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، وہاں پر گاؤں میں مختلف قومی بورژوا اور پیٹی بورژوا عناصر اپنا مضبوط سیاسی اثر قائم رکھے ہوئے ہیں۔

لیکن آج کے حالات میں ان ممالک میں بھی آہستہ آہستہ مزدور طبقے کے لئے قائدانہ حیثیت حاصل کرنے کے حقیقی مواقع پیدا ہو رہے ہیں۔ اس کے لئے بنیادی شرط مزدور طبقے اور اُس کی پارٹی کی کسانوں کے مسائل پر صحیح مارکسسٹ لیننسٹ سیاست ہے۔ مزدور

طبقے اور کسانوں کے درمیان اتحاد قائم کرنے کی جدوجہد سب سے پہلے زرعی سوال کے منتقبا اور بنیادی حل کیلئے جدوجہد ہے۔ جدوجہد کے اس دور میں اس بات کو مدنظر رکھا جاتا ہے کہ بنیادی زرعی اصلاحات نوآزاد ممالک کے تمام محنت کشوں، پرولتاریہ، کسانوں، درمیانی شہری طبقے، حتیٰ کہ بورژوازی کے ترقی پسند حصّوں کے مفادات کو پورا کرتی ہے۔ مزدور طبقہ اور کسان ان اصلاحات کے نفاذ میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں کیونکہ یہ آبادی کی اکثریت کے معیارِ زندگی کو بلند کرتی ہے، روزگار کے زیادہ مواقع فراہم کرتی ہیں اور پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔ مزدور طبقہ استحصال سے اُس وقت تک آزاد نہیں ہوسکے گا، جب تک وہ کسانوں کے ساتھ مل کر جاگیردارانہ باقیات کو ختم نہیں کر دیتا۔ بنیادی زرعی اصلاحات سے درمیانے طبقے کو بھی فائدہ پہنچتا ہے کیونکہ اُن کی خوشحالی کا تعلق بھی کسانوں کے معیار زندگی کے بلند ہونے، یعنی اُن کی قوت کے مزید بڑھنے سے ہے۔

زرعی اصلاحات کے بارے میں بورژوازی کا رویّہ زیادہ پیچیدہ ہے۔ ایشیا و افریقہ کے کئی ملکوں میں اس کی نافذ کردہ اصلاحات بنیادی طور پر بورژوا اصلاحات ہیں اور گاؤں کو سرمایہ دارانہ راستے کی طرف لے جاتی ہیں۔ کسی حد تک کسانوں کے کچھ حصّوں کی حالت بہتر بنانے کے باوجود یہ اصلاحات "اُوپر سے" زرعی سوال کو مکمل طور پر کسانوں کی بنیادی اکثریت کے حق میں حل نہیں کرسکتیں۔ اس لئے موجودہ صورتحال سے کسانوں کی ناراضگی بڑھتی جارہی ہے۔

نیم جاگیردارانہ اور سرمایہ دارا استحصال کے خلاف، جمہوری بنیادوں پر حقیقی زرعی اصلاحات کے لئے کسانوں کی جدوجہد تیز تر ہوتی جارہی ہے۔ مزدور طبقے سے اتحاد قائم کرنے کی اُن کی خواہش بڑھتی جارہی ہے کیونکہ زمین کے لئے کسانوں کی لڑائی میں یہی طبقہ انہیں حتمی اور فیصلہ کن مدد دے سکتا ہے۔

پرولتاریہ اور اس کی پارٹی کسانوں کو بورژوازی کے اثر سے آزاد کروا کے اپنی سمت لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے لئے وہ بنیادی زرعی اصلاحات کا مطالبہ کرتے

ہیں۔ ایسے نعرے اور مطالبے بلند کرتے ہیں جن کا براہِ راست تعلق کسانوں کے مفاد اور ضروریات سے ہوتا ہے۔ اُن ممالک میں جہاں زرعی اصلاحات نافذ کی گئی ہیں یا کی جا رہی ہیں، مثلاً ہندوستان، تیونس وغیرہ۔ وہاں یہ مارکسی لیننی پارٹیاں ان اصلاحات پر مستقلاً عمل درآمد کے لئے جدوجہد کرتی ہیں، اُن کے محدود کردار کو ظاہر کرتی ہیں اور زیادہ ترقی پسند زرعی اصلاحات کے لئے اپنے منصوبوں کا اعلان کرتی ہیں۔

مزدور طبقے کی ہراول دستے کی پارٹیوں کے زیادہ ترقی پسند زرعی اصلاحات کے پروگراموں میں جن مطالبات کو "مدنظر رکھا جاتا ہے، اُن میں جاگیرداروں اور غیر ملکی کمپنیوں کی بھاری زرعی جائیداد کی بلا معاوضہ ضبطی، ضبط شدہ زمین کی بے زمین اور کم زمین والے کسانوں کو بلا معاوضہ منتقلی، جاگیردارانہ استحصال کی تمام شکلوں کا خاتمہ، کسانوں کے تمام سرکاری، بنکوں کے ساہوکارانہ اور جاگیردارانہ قرضوں کا خاتمہ، کسان کمیٹیوں کی زرعی اصلاحات کے نفاذ میں شرکت، کسانوں کے لئے سرکاری، مالی و تکنیکی امداد، حکومت کی طرف سے سڑکوں اور ذرائع آبپاشی کی تعمیر، بنجر زمینوں کو قابلِ کاشت بنانے اور گاؤں میں بجلی پہنچانے کے لئے امداد، گاؤں میں رضا کارانہ بنیادوں پر مختلف کوآپریٹیوز کا قیام، ناخواندگی کا خاتمہ اور دوسری سماجی ثقافتی سرگرمیاں شامل ہیں۔ ان تمام مطالبات کے ساتھ یہ ترقی پسند پارٹیاں اپنے پروگراموں میں اپنے ملکوں کی معروضی صورتحال کے مطابق بعض مخصوص نکات کو بھی مدنظر رکھتی ہیں۔

اُن ملکوں میں جہاں سامراج کا اثر بہت گہرا ہے اور زرعی اصلاحات بالکل ہی نافذ نہیں کی گئیں یا اُن کا کردار بہت محدود تھا، وہاں بائیں بازو کی پارٹیاں عوام کو مکمل سیاسی آزادی کے حصول، جاگیردار سامراج نواز حکمران کے خاتمے کے لئے جدوجہد کی راہ پر لے جاتی ہیں کیونکہ یہ زرعی اصلاحات سمیت تمام سماجی و معاشی اصلاحات کی پیشگی شرط ہے۔

کسان ایک طبقے کی حیثیت سے جاگیرداری اور سامراج کے خلاف جدوجہد میں مکمل دلچسپی رکھتا ہے لیکن سرمایہ دارانہ تعلقات کی ترقی سے گاؤں میں تفریق پیدا ہوئی ہے۔ سامراج دشمن طبقاتی پارٹیاں کسان طبقے کے اندر سماجی فرق کو سمجھتی ہیں اور اُسے مدِّنظر رکھتے ہوئے اپنی زرعی پالیسی مرتب کرتی ہیں۔ وہ استحصالی زمینداروں کے خلاف محنت کش کسانوں اور زرعی مزدوروں کے حق میں فیصلہ کن آواز اٹھاتی ہیں۔ اُن کی مالی حالت بہتر بنانے، زرعی مزدوروں کی تنخواہ میں اضافے اور دوسرے مسائل کے حل کے لئے کسانوں کی جدوجہد کی حمایت کرتی ہے۔

کئی ترقی پذیر ملکوں میں زرعی اصلاحات کے دوران کسان کوآپریٹو فارم قائم کئے جاتے ہیں جو زرعی پیداوار کی ترقی، کسانوں کے مفادات کے دفاع، جاگیردار اور اجارہ دار کے خلاف جدوجہد اور باہمی محنت کے تجربات میں ایک اہم اور مثبت کردار ادا کرسکتے ہیں مگر اکثر اوقات ان کوآپریٹوز میں اہم جگہ خوشحال کسان کو حاصل ہوتی ہے جو انہیں اپنے ذاتی مفادات کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ بہت سے ملکوں میں کسانوں کو زبردستی کوآپریٹو فارم میں اکٹھا کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں کوآپریٹو فارم صرف کسانوں سے ٹیکس جمع کرنے کا ادارہ بن کر رہ جاتا ہے۔ مارکسسٹ، لیننسٹ، حکومت کی اس پالیسی پر تنقید کرتے ہیں۔ وہ کسانوں کے رضاکارانہ طور پر منظم ہوتے اور کوآپریٹو فارم کو سرکاری امداد مہیا کرنے کے حق میں آواز اٹھاتے ہیں۔ کوآپریٹو فارم کے اندر امیر زمینداروں کی من مانی اور ناجائز مفادات کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں۔

شمالی افریقہ اور ایشیا کے بہت سے ممالک میں زرعی آبادی کا بڑا حصّہ زرعی مزدوروں پر مشتمل ہے۔ جدوجہد کا تجربہ شاہد ہے کہ وہ قومی جمہوری انقلاب کی کامیابی کے لئے اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔ قومی جمہوری پارٹیاں زرعی مزدوروں کے مخصوص مطالبات کی حمایت کرتی ہیں مثلاً اُجرت میں اضافہ، اوقاتِ کار میں کمی، محنت کے اجتماعی معاہدے

کرنے اور ٹریڈ یونین بنانے کا حق وغیرہ۔ بہت سے ملکوں میں ایسی تنظیمیں موجود ہیں جو صنعتی مزدوروں کی ٹریڈ یونین اُن سے رابطہ قائم رکھتی ہیں، اُن کی مکمل حمایت کرتی ہیں اور مشترکہ اقدامات کرتی ہیں۔

۳

کسانوں اور مزدوروں کے ساتھ قومی جدوجہد آزادی میں مقامی بورژوازی بھی حصہ لیتی ہے۔ اپنے وقتوں میں ایشیا و افریقہ کے بہت سے ممالک میں اُس نے سامراج دشمن جدوجہد کی قیادت بھی کی کیونکہ بورژوازی سامراج دشمن قوتوں کے ایک بڑے حصے خصوصاً شہری اور دیہاتی پیٹی بورژوازی کو اپنے ساتھ لینے کی اہل ہے اس لیے مارکسی لیننی پارٹیاں اپنی حکمت عملی اور لائحہ عمل تیار کرتے وقت اس کی پوزیشن کو خاص اہمیت دیتی ہیں۔ جدوجہد آزادی میں تو آزاد ممالک کی بورژوازی کا کردار بہت سے عوامل سے متعین ہوتا ہے جن میں ملک کی معاشی ترقی کا معیار، آبادی میں طبقاتی تفریق کی شدت، طبقاتی قوتوں کی ترتیب و صف بندی، جدوجہد کی وسعت اور شدت اُس کی مختلف شکلیں (پُرامن یا پُرتشدد) خود بورژوازی کی ترقی کا معیار، اُس کا سیاسی تجربہ اور غیر ملکی اجارہ دار سرمایہ سے، اُس کا تعلق شامل ہیں۔

ایشیا و افریقہ کے اکثر ملکوں میں بورژوازی کی طبقاتی حیثیت یکساں نہیں ہے۔ کہیں اجارہ دار بورژوازی ہے اور کہیں غیر اجارہ دار کہیں بڑی بورژوازی اور کہیں درمیانی، کہیں سامراج سے اُس کا تعلق گہرا ہے اور کہیں کمزور، کہیں اُس کے مفادات جاگیردار طبقات سے منسلک ہیں اور کہیں اس کا تعلق جاگیرداری سے نہیں ہے۔ ان ممالک میں بورژوازی کا سیاسی وزن اور معاشی پوزیشن بھی مختلف ہیں۔ معیشت میں غیر ملکی اجارہ دار سرمایہ کے دباؤ، صنعتی ترقی کی سست رفتار، اندرونی سرمائے کی کمی، اندرونی منڈی کی تنگی اور بہت سے دوسرے عوامل نے مقامی صنعتی بورژوازی

کی ترقی میں رکاوٹیں پیدا کی ہیں۔ ایک طویل عرصے تک بہت سے نوآبادیاتی ملکوں میں صرف دیہاتی اور تجارتی بورژوازی نے ہی ترقی کی ہے۔

ایشیا و افریقہ کے ممالک میں بورژوازی کے مختلف حصوں کی معروضی صورتحال سامراج اور جاگیردار دشمن جدوجہد میں اُن کی شرکت کی حد متعین کرتی ہے۔ سب سے ریڈیکل بورژوازی کا وہ حصہ ہے جس کے پاس زیادہ سرمایہ نہیں۔ بڑی بورژوازی کا زیادہ تر جھکاؤ سامراج اور اندرونی رجعتی قوتوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کی طرف ہوتا ہے مقامی بورژوازی کا وہ حصہ جس کے مفادات کو سامراج کے غلبے سے زک پہنچتی ہے، جو اپنے ملک کی آزادانہ سیاسی و معاشی ترقی اور قومی منڈی کے خود مختارانہ استعمال میں دلچسپی رکھتا ہے اور جو انقلاب کی ترقی کے ایک مخصوص دور میں قومی مفادات کی ترجمانی کرنے کی اہلیت رکھتا ہے، قومی بورژوازی کہلاتا ہے۔

بورژوازی کی سامراج اور جاگیردار دشمن حکمت عملی اُس کے اپنے طبقاتی مفاد کے زیر اثر بنتی ہے۔ نوآبادیاتی نظام سے نہ صرف محنت کش عوام بلکہ مقامی بورژوازی کو بھی مصیبتیں اور نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ سامراج نے مقامی بورژوازی کی طرف سے ملک کے اندر خود مختار معیشت قائم کرنے اور بین الاقوامی منڈی میں مساوی حیثیت حاصل کرنے کی تمام کوششوں کو مکمل طور پر دبا دیا ہے۔ مقامی بورژوازی اور سامراج کے درمیان تضادات نے سامراج دشمن جدوجہد میں اس کی شرکت کو ممکن بنایا ہے۔ سامراج دشمن جدوجہد کے مختلف ادوار میں مخصوص صورتحال کے مطابق بورژوازی کی پوزیشن اور کردار بدلتے رہتے ہیں۔ بیشتر ایشیائی اور افریقی ممالک کی جدوجہد آزادی کے پہلے دور میں بڑی بورژوازی سمیت اس کے تمام حصوں نے شرکت کی ہے آزادی کے حصول کے بعد معاشی خود مختاری کی جدوجہد میں بورژوازی صرف اُسی حد تک دلچسپی رکھتی ہے جس حد تک وہ اُس کے طبقاتی مفادات میں جاتی ہے۔ دراصل

بورژوازی نوآبادیاتی نظام سے آزادی کو سرمایہ دارانہ نظام کی ترقی، اپنی معاشی قوت کی مضبوطی اور عوام پر اپنی حکومت قائم کرنے کا ایک مرحلہ سمجھتی ہے سیاسی آزادی کے لئے لڑائی کے دوران بورژوازی مزدوروں کسانوں اور دوسرے محنت کشوں سے مختلف معاشی و سماجی اصلاحات کرنے کے بلند وبانگ وعدے کرتی ہے لیکن محنت کشوں کی مدد سے اقتدار حاصل کرنے کے بعد وہ اکثر اپنے وعدوں کو بھول جاتی ہے اور انقلاب کی مزید ترقی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتی ہے عوامی جدوجہد کے دباؤ کو کم کرنے کی کوشش میں بورژوازی سماجی آزادیوں کے خلاف آواز اٹھاتی ہے وہ معاشرے کی مکمل جمہوری تعمیر سے خوفزدہ ہوتی ہے اور سیاسی آزادی کے حصول کے بعد انہیں طاقتوں کے ساتھ اتحاد کرنے کیلئے تیار رہ جاتی ہے جن کے خلاف ماضی میں خود اس نے جدوجہد کی ہوتی ہے اگرچہ بورژوازی اور سامراج کے درمیان تضادات برقرار رہتے ہیں جس کا مطلب ہے کہ سامراج دشمن جدوجہد میں بورژوازی کی شرکت کے معروضی حالات بھی باقی رہتے ہیں مگر وہ ان تضادات کو سامراج کے خلاف جدوجہد کی بجائے اس کے ساتھ گٹھ جوڑ کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

بورژوازی جدوجہد آزادی میں ایک مخصوص ترقی پسند کردار ادا کرنے کی اہل ہے۔ لیکن یہ طاقت ڈانواڈول اور دوغلی ہے وہ عوامی جدوجہد کے انقلابی پھیلاؤ سے خوفزدہ ہوتی ہے اور اسے اصلاح پسندی کے راستے پر چلانے کی کوشش کرتی ہے بورژوازی کی زیر قیادت جدوجہد آزادی نوآبادیاتی نظام کی بنیادی اور انقلابی توڑ پھوڑ اور خاتمے کی طرف نہیں لے کر جاتی بلکہ بورژواز جمہوریتوں کے قیام تک ہی محدود رہتی ہے اور بڑی حد تک غیر ملکی سرمایہ پر انحصار برقرار رہتا ہے پاکستان، لبنان اور کئی دوسرے ملکوں میں ترقی اسی راستے پر ہو رہی ہے اقتدار پر قبضے کے بعد بورژوازی دو بڑی قوتوں کے زیر اثر آگئی ایک طرف سامراج جو نوآزاد ملکوں کی معیشت میں اپنی پوزیشن دوبارہ حاصل کرنے اور مضبوط کرنے کی کوشش میں تھا اور جاگیردار طبقے جو اپنے اختیارات اور مراعات کو برقرار رکھنا چاہتے تھے

دوسری طرف عوام کے وسیع حلقے، جو اپنی حالت کی بہتری کے لئے جدوجہد کر رہے تھے یہ دونوں قوتیں بورژوازی پر مستقل دباؤ ڈالتی ہیں اور قومی جدوجہد آزادی کے جمہوری مسائل کے حل میں اس کی ڈانواڈول، دوغلی اور متذبذب حیثیت کو گہرا کرتی ہے بورژوازی کے مختلف حصوں کا دوغلہ کردار مختلف سطحوں اور حدود میں سامنے آتا ہے بورژوازی کی سیاست کا دوغلہ پن خاص طور پر غیر ملکی سرمایہ سے اس کے تعلق، صنعتی ترقی، سرکاری شعبے کے کردار میں ظاہر ہوتا ہے اقتدار حاصل کرنے کے بعد وہ اہم پوزیشنوں پر قبضہ کرنا چاہتی ہے جو پہلے غیر ملکی سرمایہ کے ہاتھوں میں تھیں اس کے ساتھ ہی بورژوازی کے بعض حلقے سامراج سے مکمل قطع تعلق کرنے سے خوفزدہ ہوتے ہیں کیونکہ انہیں سامراج کی مدد اور سہارے کی ضرورت ہوتی ہے اس کے علاوہ انہیں غیر ملکی اجارہ داریوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے اور مضبوط کرنے میں دلچسپی ہوتی ہے بہت سے ایشیائی وافریقی ممالک میں بورژوازی اور خاص کر اس کا بایاں بازو سرکاری شعبے کی ترقی کی حمایت کرتا ہے جس کی مدد سے وہ غیر ملکی سرمایہ کو کمزور اور محدود کرتا ہے معیشت میں اپنی پوزیشن کو مضبوط کرتا ہے بھاری صنعتی کارخانوں کی ترقی کے لئے حالات پیدا کرتا ہے۔

زرعی سوال کے حل میں بھی قومی بورژوازی بے اصول اور غیر مربوط فکر کا مظاہرہ کرتی ہے۔ ایک طرف وہ زرعی اصلاحات کے نفاذ، زراعت میں جاگیردارانہ اور نیم جاگیردارانہ تعلقات جو شہری اور دیہاتی پیداواری قوتوں کی ترقی میں رکاوٹ ہیں کے خاتمے میں دلچسپی رکھتی ہے دوسری طرف بورژوازی کا بڑا حصہ خود زمین کی بھاری ملکیت رکھتا ہے اور اکثر اس کا جاگیرداروں کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے جمہوری اور انقلابی قوتوں کے خلاف بورژوازی کی لڑائی میں جاگیردار اور قبائلی سردار اس کو سہارا دیتے ہیں۔ بورژوازی بنیادی زرعی اصلاحات نافذ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی ہے۔ وہ جاگیرداروں کے اقتدار اور ان کی زرعی ملکیت کو صرف کسی حد تک محدود کر سکتی ہے۔

بورژوازی اپنے ملک کی صنعتی ترقی میں بھی دلچسپی رکھتی ہے لیکن یہاں بھی وہ تذبذب کا شکار نظر آتی ہے وہ عوام کے مزید اثر کے ذریعے سرمایہ حاصل کرتی ہے جس کو قومی معیشت پر ہی صرف کیا جاتا ہے لیکن قومی آمدنی میں عوام کے حصے کو کاٹنے سے، جو پہلے ہی نہایت کم ہے، قومی معیشت کی تیز رفتاری ترقی کی ضمانت نہیں مل سکتی صنعتی ترقی کے لئے سرمایہ کے حصول کا دوسرا راستہ طفیلی طبقات کے منافع اور فضول اخراجات میں کمی ہے لیکن ظاہر ہے کہ بورژوازی اس راستے پر چلنا نہیں چاہے گی بورژوازی کا بڑا حصہ اپنا سرمایہ بڑے صنعتی منصوبوں میں لگانے سے انکار کرتا ہے جن کی تعمیر کے لئے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔ وہ تجارتی، مالیاتی سودی اور چور بازاری کے کاروبار کے ذریعے منافع حاصل کرنے کو ترجیح دیتا ہے ظاہر ہے کہ ایسی سیاست معیشت کی تیز رفتار ترقی کی ضمانت نہیں دیتی ہے۔

بورژوازی آزادی کے حصول سے عوام میں پیدا شدہ جذبے کو قومی احیاء کے لئے استعمال کرنے کے خلاف نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ہی جمہوری عناصر کو جو عوامی مفادات کے ترجمان ہیں اقتدار میں شامل کرنے سے ڈرتی ہے وہ قومی تعمیر میں عوام کی سرگرم شرکت میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اس سے عوام کا سیاسی اثر بڑھے گا انہیں تجربہ حاصل ہوگا اور اپنی قوت اور اہلیت پر ان کا یقین مزید پختہ ہو جائے گا اس لئے بورژوازی اور خصوصاً اس کا دایاں بازو جمہوریت کو محدود کرنے کی سیاست اختیار کرتا ہے اور ترقی پسند پارٹیوں اور تنظیموں کے کام میں رکاوٹیں ڈالتا ہے اکثر دائیں بازو کی قوتیں جمہوریت کے خلاف مہم چلاتی ہیں اور جمہوری قوتوں کو کمزور کرنے کی کوشش کرتی ہیں بنیادی حملہ وہ کمیونسٹوں کے خلاف کرتی ہیں۔

محنت کشوں کی مادی حالت بہتر بنانے میں بھی بورژوازی متضاد سیاست اختیار کرتی ہے ایک طرف وہ اندرونی منڈی کی وسعت میں دلچسپی رکھتی ہے جس کے لئے عوام کی قوت خرید اور رسد میں اضافے کی ضرورت ہے دوسری طرف منافع کی دوڑ میں استحصال کو

تیز تر کرتی ہے اور عوام کے معیارِ زندگی کو کم تر کرتی جاتی ہے۔ موجودہ دور میں بہت سے نو آزاد ملکوں میں حکمران بورژوازی کے ساتھ کسانوں کی بڑی تعداد اور مزدوروں کا اتحاد ہے۔ مگر سرمایہ دارانہ راستے پر ترقی طبقاتی لڑائی میں شدت پیدا کر رہی ہے شدید طبقاتی تضادات کے عمل میں عوام کے وسیع حلقوں کا بڑھتا ہوا شعور انہیں قومی بورژوازی کے بارے میں خیالی تصورات اور خوش فہمیوں سے آزاد ہوتے میں مدد دے رہا ہے اس لئے بورژوازی عوام کو اپنے زیر اثر رکھنے کے لئے نظریاتی و سیاسی پروپیگنڈہ تیز کر رہی ہے۔ جمہوری ڈھونگ اور تصورات کو قائم رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ خود کو قومی مفادات کے واحد ترجمان اور قوم کے واحد اور "قانونی" رہنما کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔

ایشیا و افریقہ کے ممالک میں قوم پرستی اپنی سیاسی خاصیت سے اُس وقت تک ترقی پسند کردار ادا کرتی ہے۔ جب تک اُس کا رُخ قوم کو سامراج اور نوآبادیاتی نظام کی بحالی کے خلاف جدوجہد کے لئے متحد کرنے کی طرف ہو مگر اب بورژوازی اور خصوصاً اُس کا دایاں بازو قوم پرستی کو اپنا اقتدار مضبوط کرتے، مزدور طبقے اور مارکسی لینینی نظریات کے خلاف لڑائی میں استعمال کرتا ہے اس لئے کمیونسٹ نوآبادیاتی مظالم کے خلاف جدوجہد میں مظلوم قوم کی بورژوازی کی حمایت کرنے کے ساتھ ساتھ بورژوازی قوم پرستی کے رجعتی رجحانات کی پُر زور مخالفت کرتے ہیں۔ اقتدار پر قبضے کے بعد بورژوازی قومی اتحاد اور طبقاتی امن قائم کرنے کا نظریہ دیتی ہے، گویا یہ معاشی تعمیر کے اہم مقاصد کے حصول کے لئے ناگزیر ہے۔ وہ قوم پرستی کے نظریات کو اس لئے استعمال کرتی ہے تاکہ محنت کش عوام اور خصوصاً مزدور طبقہ طبقاتی جدوجہد سے انکار کر دیں۔ انقلابی عمل کی ترقی، طبقاتی تفریق میں شدت اور طبقاتی تضادات میں تیزی کے ساتھ ساتھ قوم پرستی نوآزاد ممالک میں زیادہ سے زیادہ غیر جمہوری کردار ادا کر رہی ہے اور اُس کا

سامراج دشمن رجحان ختم ہوتا جارہا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ انقلابی قوتوں میں انتشار پھیلانے کا ہتھیار بنتی جارہی ہے۔ مخصوص حالات میں قوم پرستی متعصبانہ رنگ اختیار کرلیتی ہے۔ اس لئے مظلوم قوموں کی قوم پرستی کا دوہرا کردار ہے۔ ایک مخصوص دور میں وہ ترقی پسند سامراج دشمن رجحان رکھتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا دوسرا رخ بھی ہے جو رجعتی اور استحصالی گروہوں کے نظریات اور مفادات کی عکاسی کرتا ہے۔

۴

اس بات کو مدِ نظر رکھا جانا چاہیئے کہ ترقی کے موجودہ دور میں بورژوازی کی ایک طبقے کی حیثیت سے ترقی پسند صلاحیتیں زیادہ تر نو آزاد ممالک میں ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوئی ہیں مجموعی طور پر وہ ابھی بھی بڑی حد تک سامراج اور جاگیردار دشمن جدوجہد میں دلچسپی رکھتی ہے اس لئے سامراج دشمن جدوجہد اور وسیع قومی محاذ میں اس کی شرکت ممکن ہے۔ بورژوازی کے متعلق حکمتِ عملی بناتے وقت اصولی اہمیت ترقی کے موجودہ دور میں اس کے کردار اور متحدہ جمہوری محاذ میں اس کے صحیح مقام کے تعین کی ہے۔ اس سوال کو حل کرتے وقت انقلابی پارٹیاں بورژوازی کو مختلف پہلوؤں سے دیکھتی ہیں۔ ایک طبقے کی حیثیت سے اس کے متضاد کردار کو بھی سامنے رکھتی ہیں اور اس کے مختلف حصوں کی سیاست کو بھی مدِ نظر رکھتی ہیں بورژوازی اور اس کے مختلف حصوں اور حلقوں کے بارے میں اپنی سیاسی لائن نہایت گہرائی اور احتیاط سے بناتی ہیں۔

اس بات پر نظر رکھنی چاہیئے کہ قومی بورژوازی کے کردار کا غلط اندازہ یا اس کی ترقی پسند صلاحیتوں میں مبالغہ آمیزی، دونوں ہی بہت بڑی غلطیاں ہیں۔ قومی جمہوری انقلاب میں قومی بورژوازی کے کردار کو جانچنے میں جانبداری اور داخلیت پسندی حکمتِ عملی میں بہت سی غلطیاں پیدا کرسکتی ہے۔ قومی بورژوازی کے کردار کو یکطرفہ

طور پر صرف ایک رجعتی قوت کی حیثیت سے سمجھتا دائیں یا زد کی بدعتی اور فرقہ پرستانہ غلطیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ قومی بورژوائی کے ساتھ متحدہ محاذ کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ تمام قومی قوتوں کو متحد کرنے اور بورژوازی کے رجعتی حلقوں کی سیاست کو عوام میں بے نقاب کرنے کے لئے مزدور طبقے کی جدوجہد محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایسی سیاست مارکسسٹ، لیننسٹوں کو تنہا کر سکتی ہے۔ عوامی مفادات کو نقصان پہنچاتے ہوئے رجعتی قوتوں کی پوزیشن کو مضبوط کر سکتی ہے۔

بورژوازی کی ترقی پسند صلاحیتوں میں مبالغہ آرائی اور اس کے موقع پرستانہ کردار کے بارے میں غلط اندازہ بائیں یا زد کی موقع پرستانہ غلطیوں پر، حتیٰ کہ اصولی مسائل پر پیچھے ہٹ کر بھی قومی بورژوازی کے ساتھ اتحاد قائم کرنے کی طرف جاتے ہیں۔ یہ رجحان عموماً اس وقت نمودار ہوتا ہے جب سامراج اور قومی بورژوازی کے درمیان تضادات انتہائی شدید ہو جاتے ہیں اور وہ پرولتاریہ کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہوتی ہے۔ یہ سیاست پارٹی اور مزدور تحریک کے لئے نہایت خطرناک ہے اور وہ اپنا طبقاتی کردار کھو کر بورژوازی کا دُم چھلّہ بن سکتے ہیں۔ مارکسی، لیننی پارٹیاں قومی بورژوازی کی طرف سامراج کے رویّے اور سیاست کو بھی مدِّنظر رکھتی ہیں۔ سامراج بورژوازی کی سیاست میں تنگ نظر طبقاتی رجحانات کو استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس کے خود غرضانہ مفادات کو اُبھارتا ہے تاکہ اُسے سامراج دشمن جدوجہد کے راستے سے ہٹا کر جمہوری قوتوں کے مدِّمقابل کھڑا کر سکے۔

مزدور طبقے کی ہراول پارٹیاں قومی بورژوازی کی حکومتوں سے اپنے تعلقات کا تعین، محنت کش عوام کے مفادات اور ملک کی آزادانہ ترقی کی ضروریات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے کرتی ہیں۔ وہ ایسی حکومتوں کے اُن تمام اقدامات کی حمایت کرتی ہیں، جو عالمی سطح پر اور ملک کے اندر سامراج کی پوزیشن کو کمزور کرتے ہیں۔ یہ پارٹیاں ان حکومتوں

کی صرف اس حد تک حمایت کرتی ہیں جہاں تک ان کے اقدامات کا مقصد قومی مفادات کا دفاع، سامراج اور نوآبادیاتی نظام کی مخالفت، سوشلسٹ ملکوں سے دوستانہ تعلقات کا قیام وغیرہ اور اندرونی سیاست میں قومی صنعت وتجارت کی ترقی، جاگیردارانہ باقیات کا خاتمہ، جمہوریت کی وسعت اور عوام کے معیار زندگی میں اضافہ وغیرہ ہیں

اس کے ساتھ ہی مارکسسٹ لیننسٹ پارٹیاں اپنی مکمل سیاسی و تنظیمی خودمختاری کو قائم رکھتی ہیں مارکسسٹ لیننسٹ ٹھوس مسائل میں حکمران طبقات کی غیرمستقل مزاجی اور تذبذب پر تنقید کرتے ہیں ان کا زیادہ ریڈیکل حل تجویز کرتے ہیں داخلہ و خارجہ پالیسی میں دائیں بازو کے رجحانات کو مضبوط کرنے کی کوشش کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں عوام کی وسیع تر جمہوری تحریک چلا کر وہ قومی بورژوازی کے حکمران حلقوں کو بائیں بازو کی طرف جھکنے پر مجبور کرتے ہیں۔

قومی بورژوازی کے متعلق کمیونسٹوں کی حکمت عملی وسیع تر محنت کش عوام مزدوروں، کسانوں، شہری درمیانہ طبقے کے مفادات کے مطابق اتحاد اور جدوجہد کی حکمت عملی ہے۔ اس سیاست پر عمل کرتے ہوئے مزدور طبقے کی ہراول پارٹیاں بورژوازی کے تذبذب کو دور کرنے اس کے رجعتی رجحانات کو بے اثر کرنے اور اس کی ترقی پسند صلاحیتوں کو سامراج دشمن جدوجہد کے مفادات اور انقلاب کے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

نوآزاد ممالک میں متحدہ محاذ کے قیام کی جدوجہد

غلام اور نوآباد ممالک میں غلامی اور سامراج کی دشمن قوتوں کے متحدہ محاذ کے قیام کے سوال کو سب سے پہلے لینن نے اٹھایا اس نے اس مقصد کے حصول کے لئے بنیاد فراہم کی اور اس کی سیاسی اہمیت کو واضح کیا لینن کے نظریات آج بھی کمیونسٹوں کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ کمیونسٹ انٹرنیشنل نے بھی اس مسئلہ پر خاص توجہ دی: ۱۹۳۵ء میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کی ساتویں کانگرس نے نوآبادیاتی اور نوآبادیاتی ممالک میں آزادی کے حصول

کے لئے سامراج دشمن متحدہ محاذ کے قیام کی غیر معمولی اہمیت پر زور دیا۔ کامریڈ دیتیر یوف نے اپنی تقریر میں کہا کہ نوآبادیاتی اور نیم نوآبادیاتی ممالک میں جدوجہد کے لئے وسیع سامراج دشمن متحدہ محاذ کے قیام کے دوران سب سے پہلے ان مختلف حالات کو جن میں عوام کی سامراج دشمن جدوجہد جاری ہے قومی جدوجہد آزادی کی پختگی کے معیار، اس میں پرولتاریہ کے کردار اور وسیع عوامی حلقوں میں کمیونسٹ پارٹی کے اثر کو مدنظر رکھنا ہوگا کمیونسٹ انٹرنیشنل نے سامراج دشمن جدوجہد کے لئے وسیع محاذ قائم کرنے اور عوامی تنظیموں میں کام کرنے کی لائن دی لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے مارکسسٹ لیننسٹوں پر زور دیا کہ وہ اپنی سیاسی تنظیمی خود مختاری کو ہر قیمت پر برقرار رکھیں۔

آج مشرق کے بیشتر ممالک میں عام قومی محاذ بنانے کا سوال نہیں رکھا جاتا بلکہ قومی جمہوری محاذ کے قیام کے لئے جدوجہد کا مقصد سامنے ہے ایسا محاذ جو نہ صرف سامراج بلکہ اندرونی رجعتی قوتوں کے خلاف اور جمہوریت وسماجی ترقی کے لئے جدوجہد کرے ایسے محاذ میں مزدور، کسان، شہر کے بیٹی بورژوا طبقے، قومی دانشور حلقے اور بورژوازی کے وہ حصے شامل ہو سکتے ہیں جن کا تعلق یا تو سامراج سے بالکل ہی نہیں یا بہت ہی کمزور ہے اور جو آزاد قومی معیشت کے قیام میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

کمیونسٹ اور مزدور پارٹیوں کی ۱۹۶۹ء کی عالمی کانفرنس کی دستاویزات میں واضح کیا گیا ہے کہ قومی وسماجی ترقی کے مسائل کے حل کا راستہ۔ عوام کو سرگرم کرنے پرولتاریہ اور کسانوں کے کردار کو بڑھانے، محنت کش نوجوانوں، طالبعلموں، دانشوروں اور شہر کے درمیانہ طبقوں نوج کے جمہوری حلقوں اور تمام محب وطن قوتوں کو متحد کرنے میں ہے۔

کسی ایک یا دوسرے ملک میں صورتحال کے لحاظ سے ان محاذوں کے ٹھوس مقاصد مختلف ہو سکتے ہیں۔ مثلاً سوشلسٹ رجحان کے ممالک میں متحدہ محاذ کا مقصد انقلابی جمہوری سماج کی مضبوطی اور سوشلزم کی بنیادوں کی تعمیر کے لئے جدوجہد کرنا ہے سرمایہ دارانہ نظام کے ممالک میں متحدہ محاذ کا مقصد رجعت پسند قوتوں کے خلاف، جمہوریت کی وسعت اور ان ممالک کو سماجی ترقی کی راہ

برلانے کے لئے جدوجہد کرنا ہے۔ ایشیا و افریقہ کے ممالک میں رنگارنگ سماجی و معاشی حالات کی وجہ سے متحدہ محاذ کی شکلیں بھی مختلف ہوتی ہیں کئی ملکوں میں متحدہ محاذ کسی سیاسی بلاک یا ترقی پسند سیاسی جماعتوں اور تنظیموں کے اتحاد کی صورت میں منظم ہوتا ہے دوسرے ممالک میں مختلف سامراج دشمن قوتوں کا اتحاد ان کے مشترکہ اقدامات اور سرگرمیوں میں ظاہر ہوتا ہے کئی ملکوں میں سامراج دشمن متحدہ محاذ مختلف متضاد طبقات اور سماجی گروہوں کی غیر منظم سیاسی تحریک کی شکل رکھتا ہے جن کے سامنے آج کے دور میں ایک ہی دشمن یعنی غیر ملکی سامراج کھڑا ہے

بہت سے افریقی ممالک میں متحدہ محاذ واحد عوامی پارٹی کی حیثیت رکھتا ہے جس میں سب سامراج دشمن ترقی پسند قوتیں شامل ہوتی ہیں (مثلاً گوینی تنزانیا وغیرہ) اس کی وضاحت ان ممالک کے مخصوص سماجی و معاشی حالات سے ہوتی ہے سرمایہ دارانہ نظام وہاں ابھی ترقی نہیں کر پایا ہے۔ طبقات کی گہری تفریق ابھی موجود نہیں ہے چھوٹی صنعتی اور تجارتی بورژوازی اور دانشور طبقے معاشی لحاظ سے ابھی کمزور ہیں اور غیر ملکی حریفوں کے ساتھ مقابلے کے قابل نہیں ہیں۔ طبقات کے درمیان تضادات زیادہ شدید نہیں ہیں اس وجہ سے سامراج اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف قومی جدوجہد کے مقابلے میں دبے ہوئے ہیں

کسی بھی صورت میں مؤثر اور جدوجہد کے قابل سامراج دشمن محاذ لیڈروں کے درمیان معاہدوں کے ذریعے قائم نہیں کیا جا سکتا اس کا قیام عوام کے وسیع حلقوں کی جدوجہد، مختلف طبقات اور سماجی گروہوں کی مشترکہ کارروائیوں اور سرگرمیوں کے دوران عمل میں آتا ہے عوام اپنے ذاتی تجربات کے پیش نظر عام سامراج دشمن قوتوں کی متحدہ جدوجہد کے قائل ہوتے ہیں متحدہ محاذ کے استحکام اور مؤثر کارکردگی کا انحصار جدوجہد کے ایسے متفقہ پروگرام کی موجودگی پر ہے جن میں متحدہ محاذ میں شامل تمام قوتوں کے مفادات کو مدنظر رکھا گیا ہو۔

متحدہ محاذ کے قیام اور استحکام میں مزدور طبقے کی ہراول پارٹیاں اہم کردار ادا کرتی ہیں قومی جدوجہد آزادی میں کمیونسٹوں کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے لینن نے کئی بار اس بات پر زور دیا کہ ایشیا و افریقہ

کے ممالک کی کمیونسٹ پارٹیوں کو ان براعظموں کے مخصوص حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے کا تجربہ حاصل کرنا چاہیے یہاں آبادی کا بڑا حصہ کسانوں پر مشتمل ہے اور اکثر قوم پرستی غالب و مسلّط نظریہ ہے یہ مسائل آج بھی نہایت اہم اور ضروری ہیں کمیونسٹوں کے اہم مقاصد میں سے ایک متحدہ جمہوری محاذ کے قیام کے راستے تلاش کرنا اور مزدور طبقے کے اتحادیوں کی جانب صحیح مارکسی لینِنی لائن اختیار کرنا ہے ان مسائل کا حل اس بات کا متقاضی ہے کہ انقلاب کے ہر دور میں ملک کے اندر طاقتوں کے توازن کا صحیح اور حقیقی اندازہ لگایا جائے مگر متحدہ محاذ کا مسئلہ کسی ایک سماجی قوت کے ساتھ تعلقات تعین کرنے کی نسبت زیادہ وسیع ہے اس میں ایسے پیچیدہ مسائل بھی شامل ہیں جیسے مختلف سماجی گروہوں کے مفادات کی علمبردار سیاسی پارٹیوں اور تنظیموں کے ساتھ اپنے رویّہ کا تعین کرنا، ان کے ساتھ صحیح باہمی تعلقات استوار کرنا وغیرہ۔

۲

ایشیا و افریقہ کے کئی ممالک کی جد وجہد آزادی میں انقلابی جمہوریت پسندوں کے اہم کردار اور ان کی زیر قیادت سنجیدہ سماجی و معاشی اصلاحات نے ان ممالک کے سامنے قومی جمہوری انقلاب میں انقلابی جمہوریت پسندوں کی جگہ اور کردار کے صحیح تعین اور اس کے مطابق حکمت عملی تیار کرنے کا پیچیدہ مسئلہ پیدا کر دیا ہے

موجودہ انقلابی جمہوریت ۔ یہ وہ سماجی و سیاسی قوت ہے جو قومی آزادی کے دوران پیدا اور مضبوط ہوئی اور نو آبادیاتی نظام اور سامراج کے خلاف آواز اٹھاتی ہے وسیع معنوں میں انقلابی جمہوریت پسند سیاسی لحاظ سے بیدار ہوتے ہوئے مزدور طبقے، کسانوں شہری پیٹی بورژوازی، ریڈیکل قوم پرست دانشوروں کے وہ حصے ہیں جو سامراج جاگیر دار اور سرمایہ دار دشمن جد وجہد کی حمایت میں کھڑے ہیں محدود معنوں میں انقلابی جمہوریت پسند وہ انقلابی جمہوری پارٹیاں اور تنظیمیں ہیں جو نہ صرف سامراج کے خلاف بلکہ ملک کے اندر ان کے گماشتوں کے خلاف بھی جد وجہد کرتی ہیں۔ حکومت میں آنے کے بعد انقلابی جمہوریت پسند اپنے ممالک کی سامراج سے مکمل سیاسی و معاشی آزادی

عالمی سطح پر مساوی حیثیت کے حصول، ملکی معیشت میں غیرملکی اجارہ داریوں کی پوزیشن کے خاتمے، ترقی یافتہ قومی معیشت کے قیام، کسانوں کے مفاد میں زرعی سوال کے حل کیلئے جدوجہد کرتے ہیں دوسرے لفظوں میں وہ جمہوری اصلاحات کا مسلسل پروگرام پیش کرتے ہیں اور اس پر عوام کی حمایت، شرکت، سامراج اور اندرونی رجعت پرست قوتوں کے خلاف فیصلہ کن جدوجہد کے انقلابی طریقوں سے عمل درآمد کرنے کا اعلان کرتے ہیں اس طرح انقلابی جمہوریت پسندوں کا سیاسی اقتدار بائیں بازو کی جمہوری قوتوں کے مفادات کی ترجمانی کرتا ہے لیکن یہ تمام قوتیں ان حکومتوں میں شامل نہیں ہوتیں. سرکاری مشینری اور معیشت میں حقیقی اقتدار دانشوروں، ملازموں، نوکرشاہی اور فوجی افسروں کے نمائندوں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے جو یکساں حیثیت، تربیت اور طبقاتی مفادات کی بنیاد پر اکٹھے ہوتے ہیں زیادہ تر ممالک میں انقلابی جمہوری حکومتوں کا سہارا سیاسی تنظیم اس قدر نہیں ہوتا جتنا کہ انتظامی مشینری یا فوج پر ہوتا ہے مختلف حالات میں کہیں یہ حکومتیں ترقی پسند قومی انقلابی آمریت کی صورت رکھتی ہیں جو ترقی کے موجودہ دور میں طبقاتی قوتوں کے وسیع بلاک کے مفادات کی ترجمانی کرتی ہیں۔

تاریخی تجربہ شاہد ہے کہ جمہوری اصلاحات کی گہرائی کے ساتھ جب سرمایہ دارانہ دشمن سماجی و معاشی اصلاحات کے نفاذ کی ضرورت ناگزیر ہو جاتی ہے تو انقلابی جمہوریت پسندوں کے درمیان طبقاتی اور سیاسی تفریق بڑھتی چلی جاتی ہے انقلابی جمہوریت پسندوں کے مخصوص حلقے (محترب نواز دانشور نوکرشاہی، فوجی افسروں کے بالائی حلقے، مذہبی راہنما) سوشلسٹ رجحان سے ہٹنا شروع ہو جاتے ہیں اور دایاں بازو قائم کرتے ہیں اگرچہ اکثر وہ کھلے طور پر اس بارے میں اعلان نہیں کرتے ہیں. وہ ترقی پسند اصلاحات پر عمل درآمد میں رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں سماجی مقاصد کو قوم پرست مسائل سے تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کمیونسٹوں کے ساتھ اتحاد کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں جارحانہ قوم پرستی اور مذہبی جنون کو بیدار کرتے ہیں حقیقتاً وہ انقلابی جمہوریت سے کٹ کر علیحدہ ہو جاتے ہیں قومی جمہوریت پسندوں کا دوسرا حصہ، جو سامراج دشمن ہے اور وسیع محنت کش عوام کے

مفادات کی ترجمانی کرتا ہے۔ مستقل سوشلسٹ رجحان کی حمایت کرتا ہے اسے اپنے ملک کی ترقی کا واحد صحیح سہارا سمجھتا ہے اور کمیونسٹوں کے ساتھ اتحاد کے لئے آمادہ ہوتا ہے اس طرح انقلابی جمہوریت یکساں نہیں ہے انقلابی جمہوریت پسندوں کی سامراج دشمن سرگرمیوں کے کردار عوام سے ان کے روابط اور عوام کی طرف ان کی حمایت، قومی سرمایہ دارانہ رجحانات سائنسی سوشلزم اور کمیونزم کی جانب ان کے زاویے پر ہے جس کا اظہار ان کی سیاست اور نظریات میں بھی ہوتا ہے۔

ان ممالک کی سماجی ترقی کے مواقع کا انحصار بڑی حد تک اس علاقے میں دو سب سے اہم اور باثر سیاسی قوتوں یعنی انقلابی جمہوریت پسندوں اور مارکسسٹ لیننسٹوں کے باہمی تعلقات اور سامراج کے خلاف سوشلسٹ کیمپ اور قومی جدوجہد آزادی کی مشترکہ جدوجہد پر ہے کمیونسٹ اور انقلابی جمہوریت پسند معروضی طور پر ایک ہی کیمپ میں واقع ہیں اور ان کے سامنے ایک مشترکہ دشمن ہے وہ اس اہم بات پر متفق ہیں کہ صرف سامراج کے خلاف فیصلہ کن جدوجہد اور سوشلزم کی طرف پیش قدمی ہی ان ملکوں کے جمہوری سماجی و قومی مسائل کا حل ہے ۱۹۶۹ء کی کمیونسٹ و مزدور پارٹیوں کی عالمی کانفرنس کی دستاویز میں کہا گیا ہے کہ کمیونسٹ اپنے عوام کی آزادی، قومی خود مختاری اور سوشلسٹ مستقبل کے لئے جدوجہد کرتے ہیں وہ سائنسی سوشلزم کے علمبردار ہیں اور قومی جدوجہد آزادی کا ہراول دستہ ہیں اس جدوجہد اور نو آزاد ممالک کے عوام کی سماجی ترقی کے مفادات اس بات کے متقاضی ہیں کہ کمیونسٹوں اور دوسری محب وطن و ترقی پسند قوتوں کے درمیان مضبوط اتحاد اور تعاون بڑھے کمیونزم سے دشمنی اور کمیونسٹوں کے خلاف تشدد عوام کی قومی و سماجی آزادی کی جدوجہد کو صرف نقصان ہی پہنچا سکتے ہیں۔

سوشلسٹ رجحانات کے ممالک میں کمیونسٹ انقلابی جمہوری حکومتوں کی ترقی پسند سیاست کی پوری حمایت کرتے ہیں حاصل کردہ کامیابیوں کو مضبوط کرنے اور سوشلزم کی طرف مزید پیش قدمی کے لئے تعاون کرنے پر تیار رہتے ہیں قومی جمہوری حکومتوں کی شروع کردہ اصلاحات کی اہمیت پر زور دینے کے ساتھ یہ بات بھی واضح کرتے ہیں کہ یہ ابھی مکمل قومی و سماجی آزادی

کے طویل اور کٹھن راستے کا صرف آغاز ہی ہے اس راستے پر کامیاب پیش قدمی کے لئے بلا امتیاز سب محب وطن اور ترقی پسند قوتوں کے مضبوط اتحاد اور نئی زندگی کی تعمیر میں ان سب کی قوتوں کی مشترکہ اور سرگرم شرکت کی ضرورت ہے ایسا اتحاد قومی و جمہوری حکومتوں کی مضبوطی اور استحکام، قومی آزادی اور سماجی ترقی کے لئے ان کی جدوجہد کی طبقاتی اور سیاسی بنیادوں کے استحکام اور وسعت، انقلاب دشمن قوتوں کے خلاف مزاحمت اور انقلابی جمہوریت پسندوں کے اندر کمزور اور ڈانواڈول گروہوں کو بے اثر کرنے کیلئے نہایت ضروری ہے۔

قومی جمہوریت پسندوں کے ساتھ اتحاد کے باوجود کمیونسٹ بہت سے اہم مسائل پر ان کے ساتھ اپنے نظریاتی اختلاف کو نہیں چھپاتے ہیں وہاں ملکوں میں مزدور طبقے کے کردار کا غلط اندازہ لگانے پر تنقید کرتے ہیں سماجی زندگی کو گہرا جمہوری رنگ دینے کے لئے آواز اٹھاتے ہیں تمام محب وطن و ترقی پسند تنظیموں کی سرگرم کارروائیوں کے مواقع فراہم کرنے کیلئے جدوجہد کرتے ہیں وہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ عوام پر "اوپر سے" نافذ کردہ اصلاحات اور کامیابیاں زیادہ پائیدار ثابت نہیں ہو سکتیں اگر انہیں عوام کا سرگرم اور منظم سہارا نہیں ہے مگر مارکسی لیننی سوچ رکھنے والے اپنے ان نظریاتی اختلافات کو سامراج کے خلاف اور سوشلسٹ مستقبل کے لئے جدوجہد میں قومی جمہوریت پسندوں کے ساتھ قریبی اتحاد و تعاون کی راہ میں رکاوٹ تصور نہیں کرتے ہیں وہ ان ممالک کی ترقی پسند قوتوں کو سائنسی سوشلزم کے نظریات و تجربات سے لیس کرنے کی ضرورت کی اہمیت کو اچھی طرح سے سمجھتے ہیں وہ مسلسل مارکسی لیننی نظریات کا پرچار اور دفاع کرتے ہیں مگر انہیں زبردستی ٹھونستے نہیں ہیں معاشی ترقی مزدور طبقے کی تعداد تنظیم، شعور اور سیاسی زندگی میں محنت کش عوام کے کردار میں اضافے کے ساتھ ساتھ سائنسی سوشلزم کی بنیادیں مضبوط اور مستحکم ہوتی جاتی ہیں ترقی پسند قوتوں کے اتحاد کا راستہ بہت کٹھن اور طویل ہوتا ہے اور کمیونسٹوں سے بہت تحمل اور لچک کا متقاضی ہوتا ہے سب سے اہم مقصد یعنی سامراج دشمنی اور غیر سرمایہ دارانہ ترقی کی جدوجہد میں

تمام قومی محب وطن قوتوں کی تیاری اور اتحاد کے لئے بہت سیاسی بختگی اور فراست کی ضرورت ہے۔

قومی جمہوریت پسندوں اور کمیونسٹوں کے باہمی تعلقات عالمی سطح ہی کی طرح قومی سطح پر بھی فروغ پا رہے ہیں قومی جمہوری پارٹیوں اور سوشلسٹ وسرمایہ دار ممالک کی کمیونسٹ پارٹیوں کے درمیان تعلقات پارٹی کی سطح پر روابط کے ذریعے استوار ہوتے ہیں جن میں دو طرفہ پارٹی دورے، پارٹی کانگرسوں اور دوسری اہم سرکاری وسماجی تقریبات میں شرکت، سیاسی معاشی اور نظریاتی میدانوں میں کام کے تجربات کا تبادلہ، موجودہ عالمی ترقی کے مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال، ۱ بین الاقوامی جمہوری تنظیموں میں مشترکہ سرگرمیاں، پارٹی، ٹریڈ یونین اور نوجوانوں کی تنظیموں کے لئے کارکنوں کی تیاری وغیرہ شامل ہیں۔

پچھلے چند سالوں کے دوران کئی ممالک کے اندر بھی قومی جمہوریت پسندوں اور کمیونسٹوں کے درمیان اتحاد وتعاون میں ترقی ہوئی ہے مگر قومی جمہوریت پسندوں کے درمیان کمیونسٹوں کے ساتھ تعاون کا سوال ابھی بحث کا موضوع ہے نظریاتی اختلافات کے علاوہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ یہ ہے کہ قومی جمہوریت پسندوں کے کچھ حلقوں میں ابھی تک کمیونسٹوں کے بارے محتاط بلکہ مخالفانہ اور معاندانہ رویہ موجود ہے اس کی وجہ ان بدگمانیوں کی موجودگی ہے جو کمیونسٹ دشمن سامراجی پراپیگنڈے، مذہبی تعصبات، کمیونسٹوں کے بین الاقوامی تعلقات اور ایونزلیشن سے بدگمانی، سیاسی اجارہ داری کی ہوس کا نتیجہ ہیں تاریخی تجربہ شاہد ہے کہ کمیونسٹ دشمن توہمات اور بدگمانیاں انقلابی قوتوں کو سامراج اور رجعت پرستوں کے مقابلے میں کمزور ہی کرتی ہیں۔

مختلف ملکوں کی مخصوص صورت حال کے پیش نظر قومی جمہوریت پسندوں اور مارکسسٹوں کے درمیان اتحاد وتعاون کی صورتیں بھی مختلف ہو سکتی ہیں لیکن سوشلزم کی طرف مسلسل پیش قدمی اسی

بات کی متقاضی ہے کہ یہ اتحاد و تعاون سماجی ترقی کے مفادات کے مطابق ہو سوشلزم کے حامیوں کی پوزیشن مضبوط کرتا ہو سماجی زندگی کی جمہوری بنیادوں کو مضبوط اور وسیع کرتا ہو ظاہر ہے کہ ان انقلابی جمہوریت پسندوں کی کوششیں ان مقاصد کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں جو کمیونسٹ پارٹیوں کی تنظیمی اور سیاسی خود مختاری کو محدود کرنا چاہتے ہیں۔

ایشیا و افریقہ کے ان ممالک میں جہاں آزادی کے حصول کے بعد ترقی کا سرمایہ دارانہ راستہ اختیار کیا گیا ہے وہاں مارکسسٹ لیننسٹ ان ممالک کی قوم پرست اور سوشلسٹ پارٹیوں میں وقوع پذیر پیچیدہ عوامل کو پیش نظر رکھتے ہیں ان پارٹیوں کا بایاں بازو، جو پیٹی بورژوازی، قومی بورژوازی کے ترقی پسند گروہوں، جمہوریت پسند دانشوروں اور اکثر مزدور طبقے کے مخصوص حصوں کے مفادات کی ترجمانی کرتا ہے۔ سامراج دشمن جدوجہد کو تیز کرنے بلکہ ترقی کا غیر سرمایہ دارانہ راستہ اختیار کرنے تک کے مطالبات بھی کرتا ہے اس کے برعکس ان پارٹیوں کا دایاں بازو ہر طرح سے انقلاب روکنے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں اکثر ان پارٹیوں میں پھوٹ پڑ جاتی ہے ان عوامل کا تجزیہ تمام ترقی پسند قوتوں کے لئے سامراج دشمن جدوجہد کے ایک بنیادی پروگرام کے گرد اکٹھے ہونے میں آسانی پیدا کر دیتا ہے مختلف ملکوں میں سماجی و معاشی صورت حال کی مختلف صورتیں اور سماجی ترقی کی خصوصیات متحدہ سامراج دشمن قومی جمہوری محاذ کے قیام کے لئے جدوجہد میں مارکسی، لیننی پارٹیوں کی حکمت عملی پر اپنے اثرات چھوڑتی ہیں۔

اس طرح ایشیا و افریقہ کے ممالک کی معروضی ترقی اس بات کی واضح شہادت دیتی ہے کہ متحدہ سامراج دشمن قومی جمہوری محاذ کے قیام کی جدوجہد نہ صرف سماجی ترقی کے راستے پر ان کی پیش قدمی، بلکہ ان کی آزادی کی حفاظت کے لئے ایک ناگزیر شرط ہے ایسے محاذوں کا قیام بہت پیچیدہ طویل اور ہمہ گیر عمل ہے جو شدید جدوجہد سے گزرتا ہے سامراج دشمن جدوجہد ایشیا و افریقہ میں تمام ترقی پسند اور حقیقی قومی طاقتوں کے اتحاد کے ضمن میں کامیابی کی ایک اہم ترین بنیاد ہے۔

پاکستان میں مزدور قوانین

علی امجد

تعارف

یہ مختصر مضمون اس غرض سے لکھا جا رہا ہے کہ اُن مزدور قوانین کے اہم خدوخال کا ایک ابتدائی جائزہ لیا جا سکے جو اس برصغیر میں کم و بیش پچھلے سو سال کے دوران ارتقا پذیر ہوئے ہیں۔ صنعتی قوانین جنہیں عرفِ عام میں مزدور قوانین کے نام سے جانا جاتا ہے، نے زمانہ حال ہی میں جنم لیا ہے اور ان کی قانونی حیثیت (قانون کی کتاب میں اندراج وغیرہ) ان میں اضافے اور ترامیم جدید صنعت کی ترقی اور نشوونما سے باہم مربوط ہیں۔ صنعتی قوانین کی تعمیر و ترقی کا مطالعہ اس امر کا متقاضی ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں جدید صنعت کی نشوونما کا حتی المقدور ایک مختصر سا جائزہ لیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ مطالعہ بھی ضروری ہے کہ یہاں یکے بعد دیگرے آنے والی حکومتوں کی سماجی و اقتصادی پالیسیوں کے پس پردہ کون کونسے فلسفے کارفرما رہے ہیں اور روبہ عمل لائے جانے کے دوران یہ کس طرح نمو پاتے رہے ہیں۔

پاکستان میں مزدور قوانین کے ارتقا اور قانون سازی کے عمل کی تاریخ خاصی پیچیدہ نوعیت کی حامل رہی ہے اور بعض اوقات اس میں کارفرما محرکات کے متضاد پہلو واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ گزشتہ ۳۷ برسوں کے دوران قانون سازی کے سیلاب کے پیچھے کوئی ایسا متعین سانچہ یا زاویہ نگاہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس میں کسی ٹھوس پن یا مستقل مزاجی کو تلاش کرنا مزید دشوار ہے۔ اس ضمن میں ممکنہ طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس کا سلسلہ بھی اتنا ہی پیچیدہ اور غیر یقینی صورت حال سے دوچار رہا ہے جتنا کہ خود پاکستان کی سیاسی تاریخ کا سلسلہ۔

تاریخی پس منظر

ماہرین معاشیات و عمرانیات نے ہندوستان پر دو سو سالہ برطانوی راج کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے دور کا آغاز ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی سے ہوتا ہے جو ۱۸۱۳ء تک پھیلا ہوا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہندوستان میں اجارہ داری اور چینی تجارت اس دور کا خاصہ ہے جسے بجا طور پر تجارتی سرمائے کا دور کہا گیا ہے G.D.H. COLE اپنی کتاب "معاشی تاریخ کا تعارف ۱۷۵۷ - ۱۹۵۷ء" میں لکھتا ہے "دو سو سال قبل کا یہ سرمایہ دارانہ نظام بہت سے پہلوؤں میں آج کی سرمایہ داری سے مختلف تھا۔ بنیادی طور پر یہ دور صنعتی سرمائے کی بہ نسبت تجارتی سرمائے کا دور تھا۔ اس عہد کی نمایاں خصوصیت بڑے کارخانوں میں مزدوروں کے ارتکاز کی بجائے چھوٹے پیمانے پر اجناس کی پیداوار پر تاجروں کا کنٹرول تھا۔ اٹھارویں صدی کا سرمایہ دار اپنی امتیازی حیثیت میں "ایک تاجر" کے طور پر نظر آتا تھا۔ اس دور کی بڑی بڑی کمپنیاں صنعتی ادارے نہیں بلکہ تجارتی ادارے تھے۔ امیر بننے کا راستہ یہ نہیں تھا کہ اشیا تیار کی جائیں بلکہ یہ تھا کہ جو لوگ اشیا تیار کرتے ہیں ان سے تیار شدہ مال خرید کر اسے منافع پر فروخت کر دیا جائے۔ تجارتی سرمایہ داری کی آمد صنعتی سرمایہ داری سے پہلے ہوئی ہے اور صنعتی سرمایہ داری بہرحال مشینی دور کی آمد پر ہی غالب نظام بن سکا۔"

ایسٹ انڈیا کمپنی کا بھارت سے بیوپار کرنے کا اصل مقصد تجارتی سرمائے کی دیگر اجارہ دار کمپنیوں کی طرح سمندر پار کے ممالک کی پیداوار اور خام مال پر اپنی اجارہ داری قائم کر کے منافع حاصل کرنا تھا۔ اس کا اصل مقصد برطانوی مصنوعات کے لئے منڈی کی تلاش ہی نہیں تھا بلکہ ہندوستان اور ویسٹ انڈیز (گرم مصالحہ۔ کپاس۔ سوتی کپڑا وغیرہ) کی رسد کو محفوظ کرنے کے لئے دوڑ دھوپ کرنا تھا جس کی انگلستان اور یورپ میں بڑی مانگ تھی۔ ان مصنوعات کی درآمد سے کمپنی کو بھاری منافع حاصل ہوتا تھا۔ (رجنی پام دت۔ انڈیا ٹوڈے)

مقامی ہندوستانی صنعت کی تباہی۔

اپنے برطانوی آقاؤں کی سرپرستی میں ہندوستان کی صنعتی ترقی کی خصوصیت یہ تھی کہ جدید مفہوم میں وسیع پیمانے پر صنعتکاری اور اس کے نتیجہ میں صنعتی انقلاب سے پہلے ہی یہاں کی نوزائیدہ صنعتی بنیاد کو بے نظیر تباہی اور بربادی کے دور سے گزرنا پڑا۔ رجنی پام دت اپنی تصنیف "انڈیا ٹوڈے" میں لکھتے ہیں کہ برطانیہ میں تو کرگھا چلانے والے جولاہوں کی تباہی نئی مشینی صنعت کے فروغ پانے کے ساتھ ساتھ ہوئی لیکن ہندوستان میں لاکھوں کاریگروں اور دستکاروں کی بیروزگاری کا سبب مشینی صنعت کی نشو ونما نہیں تھی۔ ڈھاکہ، سورت اور مرشد آباد جیسے قدیم گنجان آباد صنعتی شہر تھوڑے ہی سالوں میں برطانیہ کے ہاتھوں اس بری طرح تباہ ہوئے کہ کسی بڑی تباہ کن جنگ یا غیر ملکی فتح کے نتیجے میں بھی نہیں ہوسکتے تھے۔

۱۸۱۳ء کا سال ہندوستان پر برطانوی حکمرانی کے پہلے دور کے خاتمے کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ دور تجارتی سرمائے کے خاتمے اور صنعتی انقلاب کے نتیجے میں ابھرنے والے صنعتی سرمایہ دار طبقے کے لئے ہندوستان کے دروازے منڈی کی حیثیت سے کھلنے کا دور ہے۔ اس سال ہندوستان کے ساتھ تجارت پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری ختم ہوگئی۔ ہندوستانی جولاہوں کے ساتھ روا رکھی جانے والی لوٹ کھسوٹ کی بدولت ہندوستانی مال اس قدر سستا ہوگیا تھا کہ ۱۸۱۳ء میں ہندوستان کا سوتی اور ریشمی کپڑا برطانوی کپاس اور ریشمی کپڑے کے مقابلے میں ۵۰ تا ۶۰ فیصد کم قیمت پر فروخت ہوسکتا تھا۔ نتیجتاً ہندوستانی اشیاء درآمد پر ۷۰ تا ۸۰ فیصد ڈیوٹی عائد کرکے موخرالذکر کا تحفظ ضروری ہوگیا تھا۔ اگر ریاست کی جانب سے اس قسم کے امتناعی محصول عائد نہ کئے جاتے تو مانچسٹر اور پاسلے کے کارخانے چالو ہوتے ہی بند ہو جاتے اور شاید ہی دوسری بار حرکت میں آتے وہ درحقیقت ہندوستانی مصنوعات کی قربانی کے باعث ہی وجود میں آئے (ایچ ولسن۔ برطانوی ہندوستان کی تاریخ)

یوں برطانوی حکمرانی کے ابتدائی دور میں ہندوستان کی دستکاری کی صنعت کی تباہی دو طرح سے ہوئی۔ جیسے کہ پہلے دیکھا گیا ہے تجارتی سرمایہ کے ساتھ مطابقت رکھنے والے پہلے دور میں جب انگلستان میں ابھی تک جدید صنعت کی کونپل نہیں پھوٹی تھی۔ ہندوستانی زراعت اور دستکاری کا استحصال برطانوی صنعت کے لئے بیش قیمت نقد سرمائے کے بہاؤ کا سبب بنا۔ جدید برطانوی صنعت کا قیام اسی سرمائے کی بنیاد پر ہوا۔ مگر جب صنعتی انقلاب کے نتیجہ میں مانچسٹر اور کپاس کی صنعت کے دوسرے برطانوی مراکز کی نشو ونما ہوئی تو یورپ اور برطانیہ کی منڈیوں میں ہندوستانی مصنوعات کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ اور ان کی صنعت کو طبعی طور پر ختم کر دیا گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے لٹیروں کا پہلے مرحلے میں سستے داموں پر ہندوستانی دستکاروں کا مال خریدنا اور یورپ کی منڈیوں میں اسے مہنگے داموں پر فروخت کرنا اور دوسرے مرحلے میں ہندوستانی دستکاری کی صنعت کی مکمل تباہی وہ بنیاد تھی جو برطانوی قانون سازوں نے ہندوستان میں رکھی۔

صنعت اور ابتدائی صنعتی قوانین

ہم پہلے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے قوانین کی لاقانونیت یعنی ہندوستانی تجارت پر اس کی مکمل اجارہ داری کا مشاہدہ کر چکے ہیں ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ ابھرتی ہوئی برطانوی صنعت کو کس طرح نہ صرف ہندوستانی مارکیٹ میں بلکہ برطانیہ اور یورپ کی منڈیوں میں ہندوستانی مصنوعات کا مقابلہ کرنے کے قابل بنانے کے لئے مقامی صنعت کو تباہ کیا گیا۔ لیکن ۱۸۱۳ء سے لے کر ۱۸۵۷ء کے درمیانی دور میں جو کہ نصف صدی سے بھی کم عرصے کا دور ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی بنیادی طور پر ہندوستانی مقبوضہ پر نظم و نسق چلانے والی کمپنی تھی اور اپنی سرحدوں اور اقتدار کو وسیع کرنے میں سرگرم عمل تھی۔ یہ ہندوستانی عوام کی عظیم بغاوت (۱۸۵۷ء) ہی کا سال تھا۔ جب

برطانوی تاج نے بالواسطہ طور پر ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ ہندوستانی صنعت اور صنعتی قوانین کا آغاز بھی اسی دور کے ساتھ وابستہ ہے۔

یہ ۱۸۱۳ء کا سال ہے جب ہم پہلی بار برطانیہ کو کلکتہ میں GLOUCESTER MILLS نامی کپاس کا کارخانہ قائم کرتے ہوئے سنتے ہیں۔ پچیس سال بعد ۱۸۳۸ء میں آسام ٹی کمپنی قائم ہوئی۔ ۱۸۴۵ء میں لندن میں گریٹ انڈین ریلوے اور گریٹ انڈین پینینسولر ریلوے کمپنی نامی دو پرائیویٹ برطانوی کمپنیوں کی بنیاد رکھی گئی۔ تاہم صرف ۱۸۵۳ء ہی میں بمبئی اور تھانہ کے درمیان بیس میل لمبی ریلوے لائن بچھائی گئی۔ مگر یہ صرف ۱۸۵۷ء کی عظیم بغاوت کے بعد ہی ممکن ہوا کہ ہندوستان میں بڑے پیمانے پر ریلوے لائن کی تعمیر کا آغاز ہوا جس کا بنیادی مقصد اتنے بے قاعدہ طور پر پھیلے ہوئے ملک میں سامراجی ضروریات کی خاطر مواصلاتی نظام قائم کرنا تھا۔

بنگال کول کمپنی ۱۸۴۳ء میں قائم کی گئی تھی جبکہ بہار میں ریلوے کی ضروریات پوری کرنے کے لئے JHARIA COLLIERIES صرف ۱۸۹۵ء ہی میں قائم ہو سکی۔ ۱۸۷۹ء میں کپاس کے ۵۶ کارخانے وجود میں آچکے تھے جن میں ۴۳ ہزار مزدور برسرِ روزگار تھے ان میں سے ۷۵ فیصد کارخانے بمبئی میں تھے جبکہ بنگال میں پٹ سن کے ۲۰ کارخانوں میں تقریباً بیس ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ ۱۹۰۶ء تک کپاس اور پٹ سن کے کارخانوں اور کوئلے کی کانوں میں مزدوروں کی تعداد ساڑھے چار لاکھ تک پہنچ چکی تھی جو کہ تعداد کے لحاظ سے ایک متاثر کن اضافہ ہے مگر دیکھا جائے تو ہندوستان میں انسانوں کے سمندر میں ایک قطرے کے برابر بھی نہیں ہے۔

ہمیں جدید ہندوستانی صنعت کے قیام کے ابتدائی مراحل میں مزدور قوانین کے چار نمونے ملتے ہیں۔

1. APPRENTICE ACT OF 1850

2. MERCHANT SHIPPING ACT
3. WORKMEN'S BREACH OF CONTRACT ACT 1859
4. EMPLOYER'S AND WORKMEN DISPUTE ACT 1860

۱۸۵۰ء کا اپرنٹس شپ ایکٹ غلامی کے خاتمے کے باعث ضروری ہو گیا تھا۔ جسے ۱۸۴۳ء میں متروک قرار دیا گیا تھا۔ اس ایکٹ کے تحت دس سے چودہ سال تک کی عمر کے بچوں کو یہ اختیار دیا گیا کہ ان کو گروی رکھنے کا عرصہ سات سال سے زیادہ نہیں ہو گا۔ اس قانون پر ضلعی مجسٹریٹ کے ذریعہ عمل درآمد کیا جا سکتا تھا جو اپرنٹس شپ معاہدے کو کالعدم قرار دینے اور معاہدے کی خلاف ورزی کرنے والے فریق کو سزا دینے کا مجاز تھا۔ بلوغت کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ان بچوں کو باقاعدہ اجرت نہیں دی جاتی تھی۔ یوں اس قانون نے سستی محنت کی بنیاد فراہم کی جو بے حد غربت کے دباؤ کے تحت اپنے والدین یا سرپرستوں کے ذریعے بچوں کی عارضی گروی یا غلامی کا ذریعہ بن گیا۔ یہ ایکٹ CHILDERN (PLEDGING OF LABOUR) ACT 1933 کے نافذ ہونے تک قانون کی کتاب میں موجود رہا۔

دوسرا آلہ جو شاید ہی چھپا ہوا ہو، ہندوستان میں برطانوی سرمائے کو ہندوستانی مزدوروں کو حدود میں رکھنے اور ان کے کارخانوں اور باغات میں ان کی شرائط پر کام کرنے پر مجبور رکھنا تھا۔ یہ تھا WORKMEN (BREACH OF CONTRACT) ACT 1859 ۔ اس قانون کے تحت اگر کوئی ملازم اپنی ملازمت کے سلسلے میں پیشگی رقم وصول کرتا تھا تو وہ اپنے آجر کے لئے طے شدہ عرصے تک کام کرنے کے لئے پابند تھا۔ خلاف ورزی کی شکل میں آجر نہ صرف پیشگی رقم واپس لینے کا حقدار تھا بلکہ ملازم کو معاہدہ پر عمل کرنے کے لئے مجبور کیا جاتا یا پھر اسے تین ماہ کے لئے جیل بھیج دیا جاتا۔ یہ قانون نہ صرف چائے کے باغات کے لئے تھا بلکہ ہر طرح کی ملازمت پر لاگو ہوتا تھا۔ بہرحال ۱۸۹۸ء اور ۱۹۰۱ء میں اس

قانون کا خاتمہ ہوا اور اس کی جگہ ASSAM LABOUR AND IMMIGRATION ACT نے لے لی۔ اس طرح اس کی سختی عام طور پر چائے کے باغات تک ہی محدود رہی۔

ملازمین اور آجروں کے درمیان "تنازعات کا ایکٹ مجریہ ۱۸۶۰ء نے مجسٹریٹوں کو ریلوے، نہروں اور دوسرے پبلک پراجیکٹوں سے وابستہ کارکنوں کی اجرتوں سے متعلق "تنازعوں" میں فیصلہ کرنے کے خصوصی اختیارات دیئے اور انہیں یہ اختیار دیا کہ معاہدے کی خلاف ورزی کرنے والے مزدوروں کو سزا دیں جو جرائم کی صورت میں دی جاتی ہے۔

ان تمام قوانین کا مقصد ہندوستان میں "لگے ہوئے" برطانوی سرمائے کو بڑی بڑی خصوصی مراعات دینا تھا۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ ۱۸۵۴ء اور ۱۸۶۹ء کے درمیان ہندوستان میں برطانوی سرمایہ کاری کا حجم ۱۵۰ ملین پاؤنڈ کے لگ بھگ تھا۔ ۱۸۷۰ء تک صرف ریلوے میں تقریباً ۵۔۷ ملین پاؤنڈ کی سرمایہ کاری کی جا چکی تھی۔ چائے کے باغات پٹ سن کے کارخانوں اور بنکوں وغیرہ میں تقریباً ۲۰ ملین پاؤنڈ لگے ہوئے تھے۔ ہندوستان کے تمام مورخین معاشیات اس بات پر متفق ہیں کہ ۱۸-۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم تک ہندوستان میں لگے ہوئے برطانوی سرمائے کا ۹۷ فیصد حصہ ٹرانسپورٹ، باغات اور فنانس میں لگا ہوا تھا یعنی یہ سرمایہ کاری ایسے شعبوں میں کی گئی تھی جن کے ذریعے ہندوستان میں تجارتی مداخلت کی جاسکے۔ کچے مال کے سرچشمے کی حیثیت سے اس کا استحصال کیا جاسکے اور مقامی منڈی میں برطانوی مال کی کھپت ہوسکے۔ یہ سرمایہ کسی بھی طریقے سے ہندوستان کی اپنی صنعتی ترقی سے جڑا ہوا نہیں تھا۔

۱۸۵۳ء میں ریلوے کے متعلق لارڈ ڈلہوزی کے خیالات واضح طور پر ان ارادوں کی نشان دہی کرتے ہیں جن کے تحت ریلوے میں سرمایہ لگایا گیا تھا: "ریلوے کے قیام سے ہندوستان جو تجارتی اور معاشی فوائد حاصل کرے گا وہ ان تمام تخمینوں سے زیادہ ہیں جو آجکل لگائے جاتے

ہیں برطانیہ اُس کپاس کا بے چینی سے منتظر ہے جو ہندوستان پہلے ہی بڑی حد تک پیدا کر رہا ہے اور کیفیتی لحاظ سے مزید بہتر اور مقدار کے لحاظ سے افراط میں پیدا کرے گا بشرطیکہ اسے صرف موزوں مواصلاتی وسائل فراہم کئے جائیں تاکہ اسے دور دراز جگہوں سے لاکر بندرگاہوں تک پہنچایا جائے۔ دھرتی کے چاروں طرف ہمارے لئے نئی منڈیاں کھل رہی ہیں اور حالات اُن کے مستقبل کی حد کا حساب لگانے میں عقلمندوں کی پیش گوئی کو چیلنج کریں گے"۔

اسی طرح ریلوے لائنوں کی تعمیر کے نتیجے میں کوئلے کی صنعت میں سرمایہ لگنا شروع ہوا۔ چائے اور پٹ سن صنعت کی دو ایسی شاخیں تھیں جو ہندوستان کی دھرتی کی خصوصیت تھیں اور سامراجی ممالک کی دھرتی پر آسانی سے پیدا نہیں ہوسکتی تھیں اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آیا ہندوستان میں برطانوی سرمایہ کاری اس ملک میں سرمائے کی برآمد تھی تو اس سلسلے میں "انڈیا ٹوڈے" میں رجنی پام دت کی رائے بیان کرنا کافی ہوگا "یوں ہندوستان میں لگا ہوا برطانوی سرمایہ درحقیقت پہلے ہندوستانی عوام کی لوٹ کھسوٹ سے حاصل کیا گیا اور بعد میں اسے برطانیہ والوں کی طرف سے ہندوستانی عوام کے لئے قرض بنایا گیا جس پر انہیں سود کے ساتھ ادائیگی کرنی تھی"۔

ہماری موجودہ بحث کے سیاق و اسباق میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس دور کے مزدور قوانین بنیادی طور پر برطانوی سرمایہ لگانے والوں کے مفادات کی ترجمانی اور عکاسی کرتے تھے جو برطانوی راج کے خاتمے تک جاری رہے البتہ مختلف ادوار میں صورتحال بدلنے کے ساتھ ساتھ اُن کے طریق کار میں تبدیلی رونما ہوتی رہی۔

صنعتکاری کے ابتدائی دور میں محنت کش طبقے کے حالات

انیسویں صدی کے خاتمے کے قریب "صنعت کاری" کے ابتدائی مراحل میں بمبئی اور کلکتے کے کارخانوں میں حالات کار کو "ہندوستان میں معاشی قوم پرستی کی ترقی اور نشو و نما" نامی کتابوں میں یوں بیان کیا ہے "جدید صنعتوں میں کام کرنے والے ہندوستانی مرد، عورتیں

اور بچے" ظالمانہ اور مکروہ قسم کے استحصال کے اس بری طرح شکار تھے کہ آجکل اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مزدوروں کے لئے کام کے وقت کی کوئی حد مقرر نہیں تھی۔ ابتدا میں مزدوروں سے اوسطاً سورج غروب ہونے تک کام لیا جاتا تھا۔ یعنی سردیوں کے موسم میں ساڑھے گیارہ گھنٹے اور گرمیوں میں چودہ گھنٹے۔ ۱۸۸۴ء سے جب کارخانوں میں بجلی متعارف کرائی گئی تو کچھ علاقوں میں روزانہ کام کے وقت میں ساڑھے بارہ گھنٹوں سے لے کر ۱۷ گھنٹوں تک اضافہ کر دیا گیا۔"

کلکتے میں پٹ سن کے کارخانوں میں مزدور ۱۵ سے ۱۶ گھنٹوں تک کام کرتے تھے جبکہ کارخانوں تک پہنچنے میں جو دو تین گھنٹے کا جو وقت لگتا تھا وہ اس کے علاوہ تھا۔ کام کے دوران وقفہ نہیں دیا جاتا تھا اور جہاں یہ وقفہ دیا جاتا وہ ۱۵ سے ۲۰ منٹ سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ دوسروں کو کام کے دوران کھانے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ بمبئی فیکٹری لیبر کمیشن کے مطابق ایک ہندوستانی کارخانے میں اوسطاً ۱۵ چھٹیاں دی جاتی تھیں ہفتہ وار چھٹی نہیں دی جاتی تھی جس کا نتیجہ مزدوروں کی مکمل تباہی کی صورت میں نکلا۔ ۱۸۹۱ء سے پہلے جب عورتوں کے کام کے لئے گیارہ گھنٹے کے وقت کا تعین نہیں کیا گیا تھا۔ وہ بھی مردوں کی طرح ہی کام کرتی تھیں۔ ۱۸۸۱ء کے فیکٹری ایکٹ کے مطابق سات سال سے لے کر بارہ سال تک کی عمر والوں کو بچہ سمجھا جاتا تھا اور ان کے لئے روزانہ کام کے نو گھنٹے مقرر کئے گئے۔ جنہیں ۱۸۹۱ء میں کم کر کے سات گھنٹے کر دیا گیا۔ مگر عمل میں اکثر ان شرائط کی بھی خلاف ورزی ہوتی رہتی تھی۔ خان دیش میں بچے" اور عورتیں چودہ سے لے کر سولہ گھنٹے تک کام کرتی تھیں۔

مزید برآں اس غیر معمولی لمبے کام کے دن اور بہت محنت و مشقت اور تھکا دینے والے کام کے نتیجے میں بہت کم اُجرت دی جاتی تھی۔ بمبئی میں کپاس کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی اُجرت سات سے دس روپے ماہوار تک ہوتی تھی۔

تقریباً" ایک سو سال پیشتر ۱۸۸۱ء میں پہلا فیکٹری ایکٹ قانون کی کتاب میں درج

کیا گیا۔ مگر یہ قانون صرف بچوں کی محنت کے کام کے گھنٹوں کے متعلق تھا۔ سات سال سے کم عمر کے بچوں کی ملازمت پر بندش تھی اور سات سے بارہ سال کے درمیان والے بچوں کے لئے کام کے نو گھنٹے مقرر کئے گئے تھے۔ اس ایکٹ نے تھوڑا بہت تحفظ ضرور فراہم کیا مگر اس سے زیادہ نہیں۔ یہ ایکٹ صرف ان فیکٹریوں پر لاگو ہوتا تھا جو مکینیکل پاور استعمال کرتی تھیں اور سو یا اس سے زیادہ کارکنوں کو ملازم رکھتی تھیں۔ خصوصاً برطانوی لیڈروں کی نیل کی فیکٹریاں اور باغات اپنے آغاز ہی سے اس ایکٹ کے زمرے میں نہیں آتے تھے اور مردوں اور عورتوں کے کام کے گھنٹوں کو بے قاعدہ ہی رہنے دیا گیا تھا۔ فیکٹری قانون ۱۸۹۱ء، ۱۹۰۱ء اور ۱۹۱۱ء میں وجود میں آئے۔ ۱۸۹۱ء والے ایکٹ کے تحت نو سال سے کم عمر والے بچوں کی ملازمت پر بندش تھی اور نو سے چودہ سال تک کی عمر والے بچوں کے کام کے گھنٹوں کو گھٹا کر سات گھنٹے مقرر کیا گیا۔ عورتوں کے لئے کام کے گیارہ گھنٹے مقرر کئے گئے اور بچوں اور عورتوں کے لئے رات کے دوران ملازمت پر پابندی عائد کر دی گئی۔ ۱۹۰۱ء میں پہلی مرتبہ بالغ مرد کارکنوں کے لئے روزانہ کام کے ۱۲ گھنٹے مقرر کئے گئے اور بچوں کے لئے کام کے گھنٹوں کو گھٹا کر چھ گھنٹے کر دیا گیا۔

ان اجزا کا جائزہ لینے سے پہلے جنہوں نے ان قوانین کی شکل اختیار کی۔ پہلے ہم اس قانون پر نظر ڈالیں گے جو چائے کے باغات کی صنعت پر اثر انداز ہوتا تھا۔

ہندوستان میں جدید صنعت کی حقیقی شروعات صرف انیسویں صدی کے آخری نصف میں ہوئی تھیں مگر وہ نہایت محدود، سست اور ملک میں برطانوی حکمرانوں کی سامراجی ضروریات سے مشروط تھیں۔ چائے کے زیادہ تر باغات آسام میں تھے اور اس صدی کی ابتدا یعنی ۱۹۰۳ء میں اس صنعت میں ۹۳ ہزار عارضی کارکنوں کے علاوہ تقریباً پانچ لاکھ مستقل مزدور ملازم تھے۔ چونکہ آسام کی آبادی زیادہ گنجان نہیں ہے اور چائے کے باغات کھلی پہاڑیوں پر تھے۔ اس لئے اشد ضروری محنت بنگال اور چھوٹا ناگپور کے علاقوں سے درآمد کی جاتی تھی آسام کے چائے

کے باغات کے لئے مزدوروں کی بھرتی برسوں تک ٹھیکیداروں کے ذریعے کی جاتی تھی جو بنگال
TRANSPURT OF NATIVE LABOURERS ACT(N III) 1863 کے
کی شرائط کے تحت ہوتی تھی جس میں ۱۸۶۵ء، ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۳ء میں ترامیم ہوئیں اس
ایکٹ کے تحت چائے کے باغات کے لئے مزدوروں کی ٹرانسپورٹ کے لئے بھرتی کا لائسنس فراہم
کیا گیا۔ بھرتی کی جگہ پر کئے گئے معاہدے پر عمل کرنے سے انکار کی سزا ایک مہینہ قید اور دوران سفر
یا باغ سے فرار ہونے پر تین مہینے قید کی سزا تھی۔ مفرور کو پناہ دینے والے کو ایک مہینہ قید یا
دو سو روپے جرمانہ یا پھر اس سے بھی زیادہ کی سزا دی جاتی تھی۔ اس قانون کے تحت نہ صرف
فرار ہونا بلکہ کارکن کی طرف سے کام چوری بھی قابل سزا تھی۔ باغات کے مالکوں کو یہ اختیار حاصل
تھا کہ وہ "بھاگ جانے والے" مزدوروں کو ضلع کی حدود کے اندر جہاں بھی وہ ملازم ہوں گرفتار
کر سکیں۔ پیشگی رقم لینے والے کارکنوں کے لئے معاہدے کی خلاف ورزی یا کام کرنے سے انکار
مجرمانہ قدم سمجھتا تھا جس پر جرمانہ ادا کرنا پڑتا۔

یہ قانون نوعیت کے اعتبار سے غلامی کا قانون تھا اور اس کی مخالفت بغیر کسی سبب
کے نہیں کی گئی تھی۔ اس کے تحت انفرادی آزادی جیسے مقدس حق کی صریحاً خلاف ورزی
ہو رہی تھی اور مزدوروں کو غلام بنا کر باغات کے مالکان کے مکمل رحم و کرم پر چھوڑ دیا
گیا تھا۔

آسام لیبر اور امیگریشن بل مجریہ ۱۹۰۱ء پر تبصرہ کرتے ہوئے ممبر قانون ریلے اس
صورت حال کو یوں بیان کرتا ہے۔

"محنت کا معاہدہ جسے بل کے ذریعہ با اختیار بنایا گیا ہے ایک سودا ہے۔ اگر دو ٹوک
الفاظ میں کہا جائے تو اس بل کے ذریعے انسان کو آسام کے لئے وقف کر دیا جاتا ہے اور یہ معلوم
ہونے سے پہلے ہی کہ وہ کیا کر رہا ہے اُسے گرفتاری اور قید کئے جانے کے ڈر کی وجہ سے چار سال
تک اپنے وعدے پر قائم رہنا پڑتا ہے۔ آقا اور غلام والے قانون میں اس قسم کے حالات

کی کوئی گنجائش نہیں ہے ہم نے آسام کے باغات کے مالکان کے مفادات کی خاطر بالآخر اسے برطانوی ہندوستان کے قانون کا حصہ قرار دے دیا ہے ..... یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اس قانون کا محرک مزدوروں کے مفاد کی بجائے باغات کے مالکان کا مفاد ہے۔"

انیسویں صدی کے اختتام پر ہندوستان میں آقا اور غلام کے عام قانون میں بیک وقت دو مختلف اور متضاد سمتوں میں تبدیلیاں کی جارہی تھیں۔ بمبئی اور کلکتے کے کارخانوں میں جہاں مردوں، عورتوں اور بچوں کے حالات کار میں خاصی اصلاح کی جارہی تھی تو باغات میں قصہ ہی اُلٹ تھا وہاں آزاد محنت کی جگہ معاہدے کی آزادی کے نام سے ایک مقررہ مدت کے لئے مزدوروں کو "غلام" بنالیا جاتا۔

کپاس کے کارخانوں جیسی صنعتوں کو صنعتی قوانین میں مزید "اخلاقی" اس لئے نہیں بنایا گیا تھا کہ بقول اینگلز برطانوی قانون ساز زیادہ ایماندار ہوگئے تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ بمبئی کی ٹیکسٹائل صنعت میں غیر معمولی طور پر طویل کام کے اوقات کی وجہ سے مانچسٹر اور برطانیہ کے دوسرے شہروں کے سرمایہ داروں کے مقابلے میں ہندوستانی صنعتکار زیادہ بہتر پوزیشن میں آگئے تھے۔

دوسری جانب چائے کے باغات کے مالکانہ حقوق برطانوی اجارہ داروں کے پاس تھے اور یہاں انہیں کوئی ایسا خطرہ نہیں تھا کہ غلاموں کی محنت ان کے اپنے دیس میں پیدا ہونے والی اشیا کے مقابلے میں سستا مال پیدا کرتی ہے۔ برطانوی حکمرانوں کے رویوں میں تضاد کو ہندوستانی صنعتکار بھی محسوس کررہا تھا اور ہندوستان میں ان کے ترجمان BIPEN CHANDRA اُن دنوں اپنی کتاب "ہندوستان میں معاشی قوم پرستی کی نشوونما اور ترقی" میں لکھتے ہیں کہ ہندوستانی پریس نے فیکٹریز ایکٹ مجریہ ۱۸۸۱ء کا استقبال ناپسندیدگی سے کیا۔

"مرہٹہ" جس کا ایڈیٹر BAL GHANDAR TALAK جیسا قد آور شخص تھا۔ ۱۳ مارچ ۱۸۸۱ء کے شمارہ میں ایکٹ کے خلاف سخت احتجاج کرتا ہے کسی قانون

بنانے کی ضرورت کو غیر ضروری ثابت کرنے کے لئے جو دلائل پیش کئے جارہے تھے ان میں مزدوروں کی طرف سے تحفظ کا مطالبہ یا شکایت کی مکمل غیر موجودگی کو دلیل کے طور پر پیش کیا جارہا تھا۔ اُن کے متعلق کہا جارہا تھا کہ وہ رضاکارانہ طور پر طویل گھنٹوں تک کام کرنے کے لئے تیار تھے! AMRITA BAZAR PATRIKA نے ۱۲ نومبر ۱۸۸۰ء کو لکھا "اگر ان کے اوپر بڑا ظلم کیا جارہا ہے تو پھر جاکے دوسری جگہ پر نوکری کیوں نہیں کرتے؟ وہ ڈسمس ہونے سے کیوں ڈرتے ہیں؟" لیکن کچھ تنقید نگاروں کی رائے کے مطابق فیکٹری ایکٹ کے مضر نتائج یہ نکلیں گے کہ کم سن مجرموں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوجائے گا کیونکہ جن لڑکوں کو ملازمت سے خارج کیا جائے گا وہ اکثر جاکر بھیک مانگیں گے ادھار لیں گے یا پھر چوری کریں گے" ایک اخبار نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس قانون سے جو بچوں کی ملازمت پر پابندی لگاتا ہے۔ صحت مند لڑکے اور لڑکیوں کو یہ اجازت نہیں ہوگی کہ وہ اپنے معذور والدین کی مدد کرسکیں۔

ایسی مثالیں بہت کم ہیں جب ایک ہندوستانی اخبار یہ لکھ سکتا تھا؛

"یہ آقاؤں کی فطرت میں شامل ہے کہ جتنا ممکن ہوسکے اپنے نوکروں یا ملازموں سے کام لیں۔ غریب نوکر بھی زیادہ پیسے کمانے کی رو میں بہہ کر مرتے دم تک کام کرنے کو تیار ہوجاتے ہیں لہٰذا ریاستی مداخلت ضروری ہوجاتی ہے۔"

جب ASSAM PLANTATION LABOUR ACT کا نمبر آیا تو ہندوستانی پریس اور قوم پرست قیادت نے تیزی سے ردعمل دکھایا۔ مزدوروں کی سخت غربت اور حکومت کی طرف سے جبری INDENTURED محنت کے نظام کو قانونی منظوری دینے کی کوششوں کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور اس کے ناجائز استعمال کو بے نقاب کیا گیا۔

۱۸۸۱ء میں جب INLAND EMIGRATION BILL متعارف کرایا گیا۔ ۱۸۸۲ء میں جب اسے قانونی شکل دی گئی تو اسے ہندوستانی پریس کی طرف سے مزدوروں کو غلام بنانے

کی کوشش کہہ کر سخت مذمت کی گئی اور قومی قیادت کی طرف سے مسلسل سخت تنقید کا نشانہ بنتا رہا۔
آگے چل کر یہ ایک عمومی قومی مطالبہ بن گیا کہ باغات کے لئے محنت کی بھرتی اور MIGRATION
(ترک وطن) کے متعلق تمام تعزیری قوانین واپس لئے جائیں اور ان کی جگہ پر محنت کی FREE
EMIGRATION متعارف کرائی جائے۔

باغات کی محنت کے سلسلے میں ہندوستانی قومی قیادت کی محنت نواز PRO LABOUR
ہمدردیوں کا سبب یہ تھا کہ چائے کے باغات کی صنعت میں صرف غیر ملکی سرمایہ لگا ہوا تھا۔ یہ
ہمدردیاں ان مزدوروں تک نہ بڑھ سکیں جو ہندوستانی مقامی صنعت میں کام کر رہے تھے۔ یہ
ہمدردی اس وقت بے نقاب ہو گئی جب ASSAM LABOUR AND EMIGRATION
RULE 1901 کی منظوری کے دو ہفتے کے اندر اندر INDIAN MINES BILL
بحث اور منظوری کے لئے دستوری کونسل میں آیا۔

ہندوستانی پریس اور کونسل کے تمام ہندوستانی اراکین نے بل کے اعتدال پسند حصوں
کی مخالفت کی جن کا مقصد کانوں میں کام کرنے والی عورتوں اور بچوں کو تحفظ فراہم کرنا تھا۔
انڈین نیشنل کانگریس نے ۱۹۰۰ء میں حکومت کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ
کہ ان حصوں کو ختم کر دے جو محنت پر پابندی عائد کرتے ہیں اور دوسری طرف آسام
میں کام کرنے والے مزدوروں کی مزدوری میں اضافہ کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس قسم کے متضاد رویئے
کی ایک مثال THE "HINDU" کی طرف سے ملتی ہے جس نے مارچ ۱۹۰۳ء میں اپنے ایڈیٹوریل
میں لکھا کہ ASSAM PLANTATION LABOUR ACT سے مشابہ قانون تمام آجروں کے لئے
بنایا جائے جو نہ صرف مزدوروں کو اکٹھا کرنے میں تکلیف محسوس کرتے ہیں بلکہ انہیں معاہدے
پر عمل کرانے پر مجبور کرنے میں بھی مشکلات محسوس کرتے ہیں اس نے مزید لکھا "ہندوستانی
مزدوروں کے سلسلے میں کوئی طبقاتی قانون بنانے کی ضرورت نہیں اگر وہ باغات کے یورپی مالکوں کے
غلام بن سکتے ہیں تو انہیں ہندوستانی زراعت کاروں کو غلام کیوں نہیں بننا چاہیئے۔ ہندوستانی

مزدور صرف کسی ایک طبقے کی غلامی کے لئے پیدا نہیں ہوئے ہیں یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ ہندوستانی پریس اور قوم پرست قیادت کی طرف سے نیکٹریز ایکٹ منظور ہونے کی مخالفت کیوں ہوتی رہتی تھی ان کی طرف سے نرم اور اعتدال پسند MINES ACT کے منظور ہونے کی مخالفت اتنی قابل فہم نہیں ہے۔ ۱۸۸۹ء والے بل کا فقرہ جو چار سال سے لے کر دس سال کے درمیان والی عمر کے بچوں کے زیر زمین کام کرنے پر پابندی عائد کرتا تھا کو اس بنیاد پر حملے کا نشانہ بنایا گیا کہ یہ بل روایتی خاندانی بندھنوں کو توڑ دے گا۔ حکومت کو کسی قسم کی مداخلت نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ مزدوروں نے خود ایسے قانون منظور کروانے کے لئے اپنی خواہش کا اظہار نہیں کیا ہے۔ پھر یہ بہانہ گھڑ لیا گیا کہ اس قسم کے اقدام کا مقصد برطانوی کوئلے کی صنعت کی مدد کرنا ہے یا ہندوستان والوں کی اپنی کوئلے کی کانوں کو نقصان پہنچانا ہے۔ یہ بات ذہن نشین کرنی چاہیئے کہ اس وقت ہندوستان کی اپنی کانیں بہت کم تھیں اور ہندوستانی اور برطانوی کوئلے کی صنعت کے درمیان مقابلے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

جیسے اوپر بیان کیا گیا ہے ہندوستان میں کوئلے کی صنعت میں اس وقت تقریباً ۹۰،۰۰۰ مزدور ملازم تھے اور عورتوں اور بچوں کو بڑی تعداد میں زیر زمین کانوں میں ملازم رکھا جاتا تھا۔ کوئلے کی کانوں میں کام کرنے والوں کے لئے کام کے حالات قابل رحم، خوفناک ہونے کے ساتھ ساتھ صحت عامہ کے اصولوں کے منافی تھے جہاں کام کرنے سے دم گھٹتا تھا۔ ۱۹۰۱ء والا ایکٹ بذات خود قانون کا نہایت نرم حصّہ تھا۔ جس نے کانوں کا معائنہ اور زیر زمین انتہائی مشکل حالات میں کام کرنے والی عورتوں اور بچوں کی ملازمت میں باقاعدگی پیدا کی۔ بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ بہار اور بنگال میں کوئلے کی صنعتوں میں جبری INDENTURED محنت کا نظام دوسری جنگ عظیم کے بعد بھی کچھ عرصے تک جاری رہا۔

انیسویں صدی کے ہندوستان میں صنعتی قانون سازی کے ان تمام سالوں کے دوران اور یہاں تک کہ بیسویں صدی کی اوّلین دھائیوں میں بھی ملک میں منظم ٹریڈ یونین

تحریک موجود نہ تھی۔ ہندوستانی قوم پرست قیادت پیداوار کے صنعتی نظام کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مصائب سے بالکل نابلد تھی۔ انہیں صنعتی قانون سازی کی ہر مشق کے پیچھے مانچسٹر کا ہاتھ یا مقابلے کا خوف دکھائی دیتا تھا۔ ابھرتے ہوئے محنت کش طبقے کے معروضی مفادات اور ضروریات قومی تحریک کی لیڈرشپ کا دردِ سر نہیں تھے۔ یہ صحیح ہے کہ مانچسٹر نے "اخلاقی" طور پر اپنا "کردار" ادا کیا کیونکہ اُسے ہندوستانی تیار شدہ مال سے ڈر تھا جو سستی ہندوستانی محنت کی پیداوار تھا اور جو خود برطانیہ کا مقابلہ کر رہا تھا۔ لیکن یہ بات ہرگز نہیں بھولنی چاہیئے کہ منظم ٹریڈ یونین تحریک اور ایک ایسی موثر آل انڈیا تنظیم جو مزدوروں کے حقوق کی خاطر آواز اُٹھائے، کی غیر موجودگی کے باوجود ہندوستانی مزدوروں نے خود کو اپنی طرف سے کتنی ہی خود رو ہڑتالیں کیں۔

آزادی سے پہلے صنعتی قانون سازی: قومی اُبھار اور ہڑتالیں

پچھلی جنگ عظیم کے تھوڑے عرصے بعد تک کوئی بڑا صنعتی قانون نہیں بنا تھا۔ ۱۹۰۷ء اور ۱۹۱۱ء کے فیکٹریز ایکٹ کے علاوہ صنعتی مزدور طبقے کے کام کے حالات کو باقاعدہ بنانے یا ان کی بُری حالت کی اصلاح کے لئے کوئی دوسری کوشش نہیں کی گئی تھی۔ یہ فطری بات ہے کہ جہاں قانونی انصاف میسر نہ ہو وہاں سماجی انصاف کے لئے مطالبہ صنعتی محنت کش طبقے کی طرف سے اجتماعی طاقت کے ذریعے ہی منوایا جا سکتا تھا جسے عام طور پر ہڑتال کہا جاتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے اس قسم کی دو ہڑتالیں ہو چکی تھیں جو اپنی وسیع اہمیت اور بہت زیادہ اثر کے ساتھ ساتھ نئے قسم کی مزاحمت اور مجاہدانہ رجحان کی علامت کے طور پر گنوائی جا سکتی تھیں۔ ایک تو نومبر ۱۹۰۷ء کی ریلوے ہڑتال تھی جو آسنسول سے شروع ہوئی اور الہ آباد سے تندلا تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ ہڑتال اتنی مکمل اور موثر تھی کہ کلکتہ جو اس وقت ہندوستان میں برطانوی حکومت کا دارالسلطنت تھا باقی ملک سے مکمل طور پر کٹ گیا۔ یہ ہڑتال جو دس دن چلی جلد ہی اُسی سال دسمبر

کے مہینے میں ریلوے انجن ڈرائیوروں، فائرمینوں، بریک مینوں وغیرہ کی دوسری ہڑتال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ ان دونوں ہڑتالوں سے بہت سختی سے نمٹا گیا۔ ۹۰۰ مزدوروں کو ڈسمس کر دیا گیا۔ برطانوی فوج کو بلا کر ریلوے اور پولیس و ملٹری کی فائرنگ سے متاثرہ ورکشاپوں کو چلانے کا کام لیا گیا۔

ریلوے مزدوروں کی طرف سے پیش کئے گئے ۴۳ نکاتی چارٹر آف ڈیمانڈ میں یہ مطالبہ بھی شامل تھا کہ جرمانے اور تعزیری کارروائیوں کے نظام میں ترامیم کی جائیں جو حقیقتاً مزدوروں کے جیب خرچ میں کمی کا باعث تھا بڑے پیمانہ پر یہ محسوس کیا گیا کہ یہ نظام ہی مزدوروں کی اجرتوں میں کمی کرنے کا بہانہ ڈھونڈنے کے لئے متعارف کرایا گیا تھا دوسرے مطالبوں میں یہ مطالبہ بھی شامل تھا کہ ریلوے اسٹاف کی ادائیگی کے مروجہ نظام اوقات کو تبدیل کر کے اسکی جگہ پرفی میل کے حساب سے ادائیگی کا نظام اور کام کے حالات میں بہتری کی جائے۔

یہ بغیر کسی وجہ کے نہیں کہا گیا ہے کہ صنعتی قانون کے پیچھے اصل طاقت سودے کاری کے لئے صنعتی مزدوروں کی اجتماعی طاقت ہے۔ ۱۹۰۷ء میں ریلوے ہڑتال اور اس کے جرمانے اور تعزیراتی نظام کے خاتمہ کے لئے مطالبے کی بازگشت اس وقت تک سننے میں آتی تھی جب تک PAYMENT OF WAGES ACT1934 نے جرمانے کی مقدار پر قانونی بندش عائد نہیں کی۔ اب اس جرمانہ کی رقم ایک روپیہ میں دو پیسہ سے زیادہ نہیں تھی

اس دور کی دوسری بڑی ہڑتال ۱۹۰۸ء میں بمبئی کے مزدوروں کی ہڑتال ہے جو براہ راست سیاسی نوعیت کی تھی اور BAL GANGADHAR TILK کی بغاوت کے الزام میں گرفتاری اور سزا کے خلاف احتجاج کے طور پر کی گئی تھی۔ TILK کو ۲۶ جون ۱۹۰۸ء کو بمبئی میں گرفتار کر کے جیسے ہی ان پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا تو سارا شہر غصے میں آگ کی طرح بھڑک اٹھا۔ ہزاروں لوگ جو انتظار میں عدالت کے باہر کھڑے تھے پولیس کی طاقت کے ساتھ ٹکرا گئے۔ جولائی میں بمبئی کے مل مزدوروں نے ہڑتال کر دی اور جلوس کی شکل میں سڑکوں پر نکل آتے۔ ہڑتالی تحریک اس وقت نئی بلندیوں پر پہنچ گئی جب بمبئی کے ۶۵ ہزار

مزدوروں نے ۱۹ جولائی ۱۹۰۸ء کو ہڑتال کر دی جس میں دفاتر کے ملازمین چھوٹے تاجر دکاندار اور بندرگاہ کے مزدور شامل ہوتے گئے۔ ہڑتالی مزدوروں کا قتل عام، گرفتاریاں اور ان کے اوپر فائرنگ۔ انہیں TILK کی سزا کے خلاف ۲۳ جولائی ۱۹۰۸ء کو احتجاج کے طور پر عام سیاسی ہڑتال کرنے سے نہ روک سکیں۔ اس دن کم سے کم ۲۰۰ لوگوں نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا کتنے ہی لوگ زخمی ہوئے اور ہزاروں لوگوں کو گرفتار کیا گیا۔ یہی حال مئی ۱۹۰۷ء کو راولپنڈی کے ریلوے انجینئرنگ کے کارکنوں اور بارود خانے میں کام کرنے والے سکھ اور مسلمانوں کی ہڑتال سے ہوا۔ یہ تحریک قوم پرست اُبھار کا ایک حصّہ تھی جو ابھرتے ہوئے صنعتی مزدور طبقے سے جڑی ہوئی تھی۔

بمبئی کے مزدوروں کی عام سیاسی ہڑتال صرف اس لئے اہم نہیں تھی کہ اس نے غیر ملکی حکمرانوں سے سیاسی آزادی حاصل کرنے کے لئے جدوجہد میں ایک نئے عنصر یعنی صنعتی مزدور طبقے کی شمولیت کا پیغام دیا۔ بطور ایک تاریخی واقعہ کے اس کی اہمیت خود لینن نے بھی محسوس کی اور اپنی انقلابی تحریروں میں اُسے خوش آمدید کہا۔ یہ عمل ان خوفناک حالات سے فراریت غصّے اور ناراضگی کی علامت تھا جن میں بمبئی اور دوسرے صنعتی مزدوروں کو رہنا پڑتا تھا۔ ٹیکسٹائل فیکٹری لیبر کمیٹی یا فریزر اسمتھ کمیٹی کے نام سے ۷ دسمبر ۱۹۰۷ء کو ٹیکسٹائل کے کارخانوں میں محنت کے حالات کا معائنہ کرنے کے لئے قائم کی گئی تھی اس کمیٹی کی رپورٹ جون ۱۹۰۷ء میں پیش کی گئی جس میں صرف ہندوستانی مزدوروں کے بدترین استحصال سے متعلق جانے پہچانے حقائق کا اعتراف کیا گیا تھا۔ خوفناک قسم کے رہائشی حالات کا ذکر کرتے ہوئے تجویز کیا گیا تھا کہ کارخانوں میں اوقات کار دن میں بارہ گھنٹے یا ہفتے میں ۷۲ گھنٹے مقرر کئے جائیں۔ آج شاید یہ بات اتنی اہم نظر نہ آئے کہ ۱۹۱۱ء میں جو فیکٹری قانون بنایا گیا تھا اُس میں بالآخر کارخانوں میں مرد مزدوروں کے لئے روزانہ ۱۲ گھنٹے اوقات کار مقرر کئے۔ صنعتی قانون سازی کے پیچھے اتحاد کی قوت، اجتماعی طاقت اور تنظیم جیسے بے شمار

ناگزیر قربانیوں کی اعانت حاصل تھی جیسے فیصلہ کن عناصر کو بھی کم اہمیت نہیں دینی چاہیئے جس کے بغیر نوآبادیاتی سرمایہ دارانہ نظام کی بہت ساری استحصالی خصوصیتوں کو جزوی طور پر بھی ختم نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اس پس منظر میں چلتے چلتے یہ بات بھی ذہن نشین کرنی چاہیئے کہ ناقابل برداشت لمبے اوقات کار کے خلاف عوامی کارروائیاں صرف ہڑتالوں تک ہی محدود نہیں تھیں جن کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ سودیشی کپڑا بُننے کی لوم اور بجلی کا متعارف ہونا کاغذ پر فیکٹری قانون کی موجودگی کے باوجود اوقات کار کو زیادہ لمبا بنانے کا باعث بنے۔ سورج طلوع ہونے سے لے کر غروب آفتاب تک کام ہی کافی سخت تھا کہ صرف رات ہونے سے ہی پژمردہ صنعتی مزدور کو آرام کا وقت ملتا تھا۔ سودیشی مشینی لوم نے ضرورت کو پیدا کیا اور بجلی کے رواج نے اوقات کار کو بڑھانے کے لئے ضروری حالات فراہم کئے۔ اس قسم کے غیر معمولی اور حیوانی لالچ کو محدود کرنے اور اس پر پابندی عائد کرنے کے لئے کبھی بے دلی سے تو کبھی نیم دلی سے کوششیں ہونے سے قبل کلکتہ کے پٹ سن کے کارخانوں اور بمبئی کی ٹیکسٹائل ملوں میں بارہ گھنٹے اوقات کار مقرر کروانے کے لیے بڑے پیمانے پر ہڑتالیں ہوئیں تاکہ "قانون" کو عملی شکل دی جاسکے۔

جنگ کے دوران ہڑتالی کارروائی اور قوم پرست اُبھار، دونوں ٹھنڈے پڑ گئے اور ان میں عارضی ٹھہراؤ آگیا۔ لیکن مقامی صنعتوں کو خاص طور پر اسی دور میں ترقی ملی۔ ۱۵-۱۹۱۴ء اور ۱۸-۱۹۱۷ء میں جنگ کے دوران ٹیکسٹائل ملوں کی پیداوار تقریباً ایک تہائی بڑھ گئی۔ کپڑا بُننے کی لومز کی تعداد ۱۰۴ ہزار سے بڑھ کر ۱۱۶ ہزار ہو گئی اور مزدوروں کی تعداد ۲۶ لاکھ سے بڑھ کر ۲۸ لاکھ سے تھوڑی زیادہ ہو گئی۔ اس دوران میں خاص طور پر ٹاٹا آئرن اور اسٹیل کمپنی نے جو ہندوستان میں پہلی فولادی کمپنی ہے اور ۱۹۰۸ء میں قائم ہوئی۔ جنگ کی ضروریات کو پورا کرنے کی خاطر پورے زور و شور سے پیداوار شروع

کی جنگ کے دوران ٹاٹا کمپنی کو اتنا منافع ہوا کہ وہ مزید دو ہائیڈرو پاور اسٹیشن بنانے کے قابل ہو گیا۔ سیمنٹ کے تین کارخانے قائم کئے گئے جن کی زیادہ تر پیداوار ریاست خریدتی تھی۔ اسی دور میں کیمیاوی اشیا کی پیداوار بھی شروع ہوئی۔

عام لوگوں اور صنعتی مزدور طبقے کے لئے جنگ کے برسوں کا مطلب افراط زر اور قیمتوں میں پیچدار SPIRALLING اضافہ تھا جس کے باعث ان کی غربت میں بہت اضافہ ہوا۔ کہیں بھی مزدوروں کی اجرت میں اضافہ کرکے اس کی تلافی نہیں کی گئی چنانچہ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے نے ہڑتالی کارروائیوں کا بڑا مظاہرہ دیکھا جس کی روک تھام غیر معمولی حفاظتی اقدامات کے ذریعہ کی گئی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد والے سالوں میں ہڑتالی تحریک کی سطح اور شدت کی علامت ان میں شرکت کرنے والے مزدوروں کے مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے مل سکتی ہے

۴ نومبر تا ۱۲ نومبر ۱۹۱۹ء ۔۔ وولن ملز کانپور	۱۷ ہزار مزدور
۷ دسمبر ۱۹۱۹ء تا ۹ جنوری ۱۹۲۰ء ریلوے کارکن جمال پور	۱۶ ہزار مزدور
۹ تا ۱۸ جنوری ۱۹۲۰ء کلکتہ جوٹ ملز	۳۵ ہزار مزدور
۲ جنوری تا ۳ فروری ۱۹۲۰ء بمبئی کی عام ہڑتال	دو لاکھ افراد
۲۰ جنوری تا ۳ جنوری ۱۹۲۰ء رنگون	بیس ہزار محنت کش
۳۱ جنوری برٹش انڈیا نیوی گیشن کمپنی بمبئی	دس ہزار مزدور
۲۶ جنوری تا ۱۶ فروری کارخانوں کے مزدور شولا پور	۱۶ ہزار مزدور
۲۴ فروری تا ۲۹ مارچ ٹاٹا آئرن اور اسٹیل ورکس	۴۰ ہزار افراد
۲۰ تا ۲۶ مارچ مدراس کے مل مزدور	۱۷ ہزار مزدور
مئی ۱۹۲۰ء احمد مل ورکرز	۲۰ ہزار محنت کش

(آر کے۔ داس۔ لیبر موومنٹ ان انڈیا)

یہ ہڑتالی کارروائیاں ۱۹۲۲ء میں فیکٹریز ایکٹ میں مزید ترامیم کے ذریعے مزدوروں کے لئے دس گھنٹے کے اوقات کار اور اجرت و معاوضہ میں ایک خاص حد تک اضافے کا موجب بنیں۔

۱۹۱۹ء میں ۱۹۱۴ء کی بہ نسبت مصارف زندگی ۷۵ سے لے کر سو فیصد تک بڑھ چکے تھے جبکہ اسی عرصے میں اجرتوں میں جو اضافہ ہوا ہے وہ ۳۵ سے ۴۰ فیصد سے زائد نہیں تھا اور بعض اوقات تو اس سے بھی کم تھا اس کے باوجود یہ کہا جاتا ہے کہ اجرت میں جو اضافہ اس وقت حاصل کیا گیا وہ پچھلے تیس سال کے دوران حاصل کئے گئے کل اضافے سے زیادہ تھا۔

صنعتی مزدور طبقے کی بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی اور عظیم الشان کارروائیوں کے اس مرحلے نے آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس نامی ٹریڈ یونین جیسی مرکزی تنظیم کو جنم دیا جس کی قیادت تلک اور لالہ لاجپت رائے جیسے مشہور و معروف قوم پرست لیڈر کر رہے تھے۔ نچلی سطح پر یہ ۱۹۲۰ء والی ہڑتال کی لہر اور پہلی جنگ عظیم کے نتائج تھے جنہوں نے ایسی تنظیم قائم کرنے کے لئے بنیاد فراہم کی جن میں روسی انقلاب کو اہم مقام حاصل ہے۔

اب تک صنعتی تنازعات کا فیصلہ کرنے کے لئے کوئی قانون یا قانونی ضابطہ نہیں تھا۔ حکومت صرف اس وقت ہڑتالوں میں مداخلت کرتی تھی جب لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا ہوتا تھا یا پیدا ہونے کا خطرہ ہوتا تھا۔ صنعتی "تنازعات کا فیصلہ کرنے کے لئے اپنی مشینری کے ذریعہ حکومتی مداخلت کی ابتدا بعد کے دور کا واقعہ ہے۔

صنعتی تنازعات کے قانون کی شروعات

ٹریڈ یونین ایکٹ مجریہ ۱۹۲۶ء اور صنعتی تنازعوں کا ایکٹ مجریہ ۱۹۲۹ء صنعتی قوانین کے دو اہم ستون ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں آزادی کے بعد والے دور میں اس موضوع پر صنعتی قوانین کی بنیاد انہی دو قوانین پر رکھی گئی۔

ٹریڈ یونین ایکٹ مجریہ ۱۹۲۶ء کو PROCEDURAL یا انتظامی قانون کہا جا سکتا ہے

جو ٹریڈ یونین کو اختیاری رجسٹریشن کا حق فراہم کرتا ہے اور ان مزدوروں کو ہڑتال منظم کرنے کے لئے" سول ذمہ داری سے نجات کا فائدہ دیتا ہے اس نے ٹریڈ یونین کو MINR MILLS کیس میں مدراس ہائی کورٹ کے فیصلے کے اثر سے تحفظ دیا۔ ۱۲، ۱۳ مارچ ۱۹۲۷ء میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے دہلی والے سیشن نے ٹریڈ یونین ایکٹ مجریہ ۱۹۲۶ء پر بہت سارے نقائص ہونے کی وجہ سے تنقید کی اور مطالبہ کیا کہ

۱۔ ا۔ سازش والے قانون کا استعمال غیر رجسٹرڈ ٹریڈ یونینز کے سلسلے میں بھی بند ہونا چاہیئے۔ ٹریڈ یونینوں کی عدم موجودگی یا غیر رجسٹرڈ ہونے کی شکل میں بھی محنت کشوں کو اجتماعی ایکشن کی آزادی ہونی چاہیئے۔

۲۔ اراکین اور عہدیداران کی سول ذمہ داریوں سے نجات کا دائرہ بڑھا کر غیر رجسٹرڈ ٹریڈ یونینوں تک کیا جائے۔

۳۔ ٹریڈ یونین فنڈز کی سول ذمہ داری سے نجات کا دائرہ بڑھا کر تمام ٹریڈ یونینوں تک کیا جائے۔

۴۔ محنت کش طبقے کی مدد کرنے کے لئے اپنے فنڈز خرچ کرنے کے سلسلے میں یونین کے اختیارات پر کی گئی پابندی ختم کی جائے۔

بہر حال ٹریڈ یونین ایکٹ مجریہ ۱۹۲۶ء کے تحت صنعتی تنازعے کھڑے کرنے کی خاطر یونینوں کی رجسٹریشن کو لازمی قرار نہیں دیا گیا تھا۔ دوسری طرف سازش کا قانون اور سول ذمہ داری LAW OF TORTS کے تحت عملی طور پر کارگر نہیں رہے تھے۔

ہندوستان میں آزادی کے بعد والے دور میں اور پاکستان میں ۵۸-۶۸ ۱۹ء والی پہلی مارشل لا حکومت اور ۷۲-۱۹۷۷ء کے دوران ٹریڈ یونین ایکٹ میں ہونے والی تبدیلیاں اگلے صفحات کے بحث کا موضوع ہیں جو مختلف تاریخی ادوار سے تعلق رکھتی ہیں۔

تاہم یہ ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ یہ دونوں قوانین اس وقت بنائے گئے تھے جب

پہلی جنگ عظیم کے بعد عالمی اقتصادی کساد بازاری کے نتیجے میں صنعتی مزدوروں کی طرف سے عوامی ایکشن اور ہڑتالوں کی دوسری لہر ایک دفعہ پھر اٹھ رہی تھی۔

صنعتی تنازعوں کے ایکٹ مجریہ ۱۹۲۹ء کے اہم حصّوں کا خلاصہ نیچے دیا جا رہا ہے

۱۔ رفاہ عامہ کی نوکریوں میں کم از کم ۱۴ دن اور زیادہ سے زیادہ ایک مہینہ پیشگی نوٹس دینے کے بغیر ہڑتال پر پابندی۔

۲۔ عام ہڑتال، اظہار یکجہتی کے لئے ہڑتال اور سیاسی ہڑتال پر پابندی جو حکومت کو کوئی خاص راہ عمل اختیار کرنے کا مطالبہ کریں۔

۳۔ صنعتی تنازعات کی بنیاد پر کارخانے سے باہر ہڑتال پر پابندی تھی۔

۴۔ صنعتی تنازعہ کو جو موجود ہو یا پھر جس کے ہونے کا اندیشہ ہو حل کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے مصالحتی بورڈ یا کورٹ آف انکوائری کے حوالے کرنا۔

۵۔ ایسے صنعتی تنازعہ کو لازمی طور پر مصالحتی بورڈ یا کورٹ آف انکوائری کے حوالے کرنا جس میں اکثریت کی نمائندگی کرنے والے دونوں فریقین نے حکام سے اس سلسلے میں درخواست کی ہے۔

۶۔ چونکہ نہ تو کورٹ آف انکوائری اور نہ ہی مصالحتی بورڈ کی رپورٹ کسی بھی طریقے سے آجروں یا مزدوروں کو اپنے فیصلوں پر پابند رکھنے کی مجاز تھی اس لئے حکومت کی طرف سے ہڑتال پر پابندی عائد کرنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ صنعتی تنازعے کا فیصلہ ہو گا۔

اس ایکٹ پر آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے صدر ایم داؤد کی طرف سے اس کے نویں سیشن میں مندرجہ ذیل الفاظ میں تنقید کی گئی۔

"ہندوستانی دستور ساز اسمبلی کے گزشتہ سیشن میں صنعتی تنازعات کے بل

کا پیش کیا جانا تحریک کی جانب حکومت کے رویے کی واضح طور پر نشان دہی کرتا
ہے اپنے کردار کے لحاظ سے یہ بل رجعت پرست ہے۔ اگر اس بل کو قانونی شکل
دی گئی تو ٹریڈ یونینوں کا ارتقاء عملاً رک جائے گا۔ ٹریڈ یونینوں اور محنت کش طبقے کے دوسرے
حمایتیوں کو مزدوروں کے جائز مطالبات پیش کرنے کی صورت میں سزائیں دی جائیں گی۔ اگر آجروں
کو ہڑتالیوں کی جگہ پر دوسرے مزدور بھرتی کرنے کے لئے کافی وقت نہ دیا گیا تو
ہڑتالوں کو غیر قانونی قرار دے دیا جائے گا جو مزدوروں کے لئے اپنے مطالبات
تسلیم کروانے کا سب سے موثر اور آخری ذریعہ ہیں۔ ہڑتال منظم کرنے والوں کو
سزا دی جائے گی اور کچھ کارخانوں میں اُسے غیر قانونی قرار دے دیا جائے گا۔
ان قانونی ضابطوں کے ذریعہ حکومت عملی طور پر ہر قسم کی مزدور تحریک کا گلا گھونٹنا
چاہتی ہے جو اس کے مفادات کا تحفظ کرنے کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ اگر یہ
رجعت پرست بل قانون کی کتاب میں جگہ پاتا ہے تو ٹریڈ یونین تحریک ترقی کرنے
کی بجائے سرمائے کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ جائے گی۔ حکومت اس رجعتی
کالے قانون کے ذریعہ تحریک کو کچلنے کا پورا ارادہ رکھتی ہے۔"

ہندوستان کے پہلے صنعتی تنازعوں کے بل کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ

"صنعتی بے چینی کا بڑے پیمانے پر پیدا ہونا جنگ بند ہونے کے بعد والے دور کی
خصوصیت تھی جس نے حکومت ہند کو مجبور کیا کہ صنعتی تنازعات کے حل کے
لئے کچھ انتظامات فراہم کرنے کے امکان پر غور کرے۔ اس کام کے لئے ۱۹۲۰ء میں
جو تحقیقات کی گئیں وہ اس نتیجے کی طرف لے گئیں کہ ان دنوں جو حالات پائے
جاتے تھے ان کی مناسبت سے موثر قانون سازی نہیں ہوئی"

صنعتی مزدوروں کی تنظیم کی نشو و نما اور تنازعات کی رفتار پر رائے عامہ کے بڑھتے
ہوتے اثرات کی وجہ سے بعد میں آنے والے سالوں نے اس موقف میں واضح تبدیلی دیکھی

اور ۱۹۲۴ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے صنعتی تنازعات کی تحقیقات اور حل کے لئے ایک مسودہ بل تیار کیا اور اُسے ان لوگوں میں جنہیں اُس سے براہ راست دلچسپی تھی اور عام پبلک میں تقسیم کیا گیا تاکہ ان کی رائے کا اندازہ لگایا جاسکے۔ ۲۵-۱۹۲۴ء میں کرائی گئی تحقیقات کے نتیجے میں اور اس عرصے میں اسے جو تجربہ حاصل ہوا ہے گورنمنٹ آف انڈیا مطمئن ہے کہ صنعتی تنازعوں کی روک تھام اور حل کے لئے قانون سازی قابل ذکر ندر و قیمت ثابت کرسکے گی اور اسی مقصد کی خاطر یہ بل تیار کیا گیا ہے۔"

صنعتی تنازعات (ترمیم شدہ) کا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۸ء

صنعتی تنازعوں کی دستور سازی کی جانب دوسرا قدم اُس وقت اٹھایا گیا جب ملک کے سیاسی نقشے پر پہلے ہی دور رس تبدیلیاں آچکی تھیں۔ ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ میں صوبائی خود مختاری کی اسکیم کے تحت صوبوں میں پاپولر وزارتیں قائم کی گئی تھیں۔ یہ وزارتیں توسیعی حق رائے دہندگی کی بنیاد پر قائم کی گئی تھیں۔ ۱۹۳۸ء میں صنعتی تنازعات کا یہ قانون اسی پس منظر میں منظور کیا گیا تھا اور اس بل کے مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد بیان کئے گئے تھے۔

"صنعتی تنازعوں کا ایکٹ ۱۹۲۹ء میں پانچ سال کے لئے منظور کیا گیا تھا اور ۱۹۳۴ء میں اسے مستقل حیثیت دے دی گئی تھی۔ رائل کمیشن آف لیبر کی طرف سے اس پر نظر ثانی کی گئی اور کمیشن کے تحت قائم کئے جانے والے انکوائری کورٹ میں اس کے کچھ پہلوؤں پر معمولی تنقید کی گئی تھی اس بل میں جو تجاویز شامل ہیں، وہ ان تبدیلیوں کی ترجمانی کرتی ہیں جو تجربے کی روشنی میں حاصل ہوئی ہیں۔"

ترمیم شدہ ایکٹ میں غیر قانونی ہڑتال کی تعریف میں تبدیلی کر دی گئی۔ رفاہ عامہ کے کاموں کی لسٹ میں ٹرام اور دفاعی جہازوں کی سروس کو بھی شامل کر لیا گیا جس کے بارے میں وقتاً فوقتاً اعلان کرسکتی تھی۔ مختلف صنعتی اداروں کے مالکان کے درمیان تنازعات کو بھی

"صنعتی تنازعہ" کی تعریف کے دائرہ کار میں لے آیا گیا۔

ترمیم کا سب سے اہم اور عملی حصہ وہ تھا جس کے تحت صوبائی حکومتوں کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو ایسے مصالحتی محکمے قائم کر سکتی ہیں جن کے پاس کچھ خاص اختیارات ہوں۔ اس نئی دفعہ کے تحت اس محکمے کے افسران کے ذمہ تنازعوں کو ختم کرنے کا فرض بھی سونپا گیا تھا جبکہ کورٹ آف انکوائری اور مصالحتی بورڈوں میں ان کا کام صرف تنازعات کی تفتیش اور انہیں سلجھانا تھا۔

اس دور میں صنعتی تنازعوں کی قانون سازی پر مرکز کی بہ نسبت صوبائی حکومتوں نے زیادہ توجہ دی۔ ۱۹۳۴ء میں بمبئی میں صنعتی تنازعوں میں مصالحت کا ایکٹ TRADE DISPUTES CONCILIATION ACT منظور کیا گیا۔ قدرتی بات تھی کہ یہ بل الیکشن میں منتخب ہو کر آنے والی صوبائی حکومتوں کے قیام سے پہلے منظور کیا گیا تھا۔ اس ایکٹ میں صرف یہ کہا گیا کہ بمبئی کے کارخانوں میں مزدوروں کے مفادات کی نگرانی کے لئے لیبر افسروں کا تقرر کیا جو ان کی تکالیف کی نشان دہی کریں تاکہ اُن کی تلافی کی جائے۔ اس قانون میں یہ شق بھی رکھی گئی تھی کہ جہاں لیبر افسر کامیاب نہ ہوں وہاں لیبر کمشنر کی تقرری کی جائے۔ اس قانون کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ بمبئی کے ٹیکسٹائل کے کارخانوں میں ہڑتالیں ختم کروانے میں عملی طور پر کامیاب ہو گیا تھا بہر حال اس سلسلے میں کسی حتمی نتیجے تک پہنچنے کے لئے تین سال کا عرصہ بہت کم تھا۔

صوبائی خودمختاری کے حصول کے بعد بمبئی اور ٹیکسٹائل کے دوسرے مراکز میں محنت کشوں کی تحریک کا نیا دور شروع ہوا۔ اس نئی تحریک کے آغاز کو عملاً مزدوروں کی اُن توقعات سے منسوب کیا جاتا ہے جو انہوں نے ان پاپولر وزارتوں کے ساتھ وابستہ کی تھیں کہ وہ اقتدار میں آتے ہی ان کی تکالیف کا خاتمہ کر دیں گے یوں ان پاپولر وزارتوں کے قیام نے ہڑتالوں کی اس نئی تحریک کے لئے محرک کا کام کیا۔

بمبئی کے صنعتی تنازعوں کے ایکٹ مجریہ ۱۹۳۸ء کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی

کہ اس میں محنت کشوں اور یونینوں کے ساتھ ساتھ آجروں کے لئے بھی قانونی طور پر لازمی تھا کہ وہ ہڑتال یا لاک آؤٹ کرنے سے پہلے مصالحتی اور ثالثی انتظامیہ کو جامع بحث کے ذریعے اپنے اقدام کی ضرورت پر قائل کریں۔ اس قانون نے آجروں کے لئے ضروری قرار دیا کہ وہ یونینوں کو تسلیم کریں بشرطیکہ یہ یونینیں ممبر سازی کے معاملے میں کچھ خاص لوازمات کو پورا کریں۔

اس ایکٹ کے ذریعہ ایسا طریقہ کار بھی وضع کیا گیا جس کے ذریعہ مزدوروں کی تکالیف اور ملازمت کی شرائط میں تبدیلی کا سدباب کیا جاسکے۔ لاک آؤٹ اور ہڑتالوں کو اُس وقت تک غیر قانونی سمجھا جائے گا جب تک اس ایکٹ کے تحت فراہم کردہ مذاکرات اور دوسرے تمام تر ذرائع کے ذریعے مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوششیں ناکام نہ ہو جائیں۔ ہڑتال یا لاک آؤٹ کا حق مصالحتی کمیٹی کے ناکام ہو جانے کے دو مہینے کے اندر اندر استعمال ہو سکتا ہے۔ تنازع ہونے کے امکان کی صورت میں ثالث فوراً اپنا کام شروع کر دے گا۔ غالباً اس ایکٹ کی سب سے اہم شق یہ تھی کہ آجر یا مزدور جو اُجرتوں یا کام کے اوقات یا ملازمت کی دوسری شرائط میں تبدیلی کا خواہشمند ہے اُس کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنے ارادے سے مجوزہ محکام کو آگاہ کرے اور اُس وقت تک کوئی تبدیلی عمل میں نہیں لائی جاسکے گی جب تک کہ ایکٹ کے تحت قائم شدہ ادارے اپنی تمام تر کوششیں صرف نہ کرلیں۔

تسلیم شدہ یونینیں

جہاں تسلیم شدہ یونینیں موجود تھیں مذاکرات کے بندوبست کا معاملہ آجروں اور تسلیم شدہ یونینوں کے درمیان طے ہوتا تھا لیکن جہاں تسلیم شدہ یونینیں موجود نہیں تھیں وہاں مزدوروں کے براہ راست منتخب نمائندے یا لیبر آفیسر ابتدائی بحث کرتے تھے اگر بحث کے دوران کوئی معاہدہ ہو جاتا تھا تو انہیں رجسٹر کر لیا جاتا تھا۔ اگر فریقین کسی معاہدے پر پہنچنے میں ناکام رہتے تھے تو صنعتی "تنازعہ" جس کے متعلق اب تک صرف یہ کہا

جاتا تھا "پیدا ہونے کا امکان ہے" اب مذاکرات کی ناکامی کی صورت میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ "رونما ہو چکا ہے" اور سرکاری ثالث درمیان میں پڑ کر تنازعے کو حل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ثالث کی ناکامی یا کسی اور صورت میں اگر حکومت حکم دیتی تو پھر مصالحتی بورڈ تشکیل دیا جاتا تھا۔ جہاں آجر اور یونین جھگڑے کو ثالث کے حوالے کرنے پر رضامند ہو جاتی تھیں وہاں سرکاری مشینری کو ابتدائی مراحل میں حرکت میں نہیں لایا جاتا تھا اور آخری مراحل میں وہ حرکت کرنے کے قابل نہیں ہوتی تھی۔ ایکٹ کے تحت ایک صنعتی کورٹ بھی قائم کیا جا سکتا تھا جس کا سربراہ ہائی کورٹ کا جج ہو یا پھر ایسا وکیل جو ہائی کورٹ کا جج بننے کا اہل ہو۔

یہ کورٹ فریقین کی جانب سے پیش کئے جانے والے معاملات میں رضاکارانہ ثالث کا کردار ادا کرتا تھا اور ٹربیونل کی حیثیت میں کام کرتا تھا۔ یہ کورٹ اس ایکٹ پر عملدرآمد کے دوران ابھرنے والے مقدمات میں آخری اپیل والے کورٹ کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ کورٹ ایک ٹربیونل تھا جو یہ فیصلہ کرتا تھا کہ آیا ہڑتال یا لاک آؤٹ غیر قانونی تھا یا نہیں اور معاہدے کی تشریح سے متعلقہ مسائل بھی اسی کے دائرہ کار میں آتے تھے۔

بمبئی صنعتی تنازعات کے ایکٹ مجریہ ۱۹۳۸ء میں ۱۹۴۱ء میں سیکشن ۴۹ اے کے تحت ترمیم کی گئی جس میں صوبائی حکومت کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ کسی بھی صنعتی تنازعہ کو ثالثی کے لئے صنعتی عدالت میں بھیج سکتی تھی اگر وہ یہ سمجھتی ہو کہ صنعتی تنازعہ کے جاری رہنے کے نتیجے میں ملازمتوں کے متاثر ہونے یا عوام کے بڑے حصے کو شدید مشکلات درپیش آنے کا خطرہ ہو یا پھر امن و امان برقرار رکھنے کا مسئلہ درپیش ہو۔ اس ترمیم نے یہ بھی واضح کیا کہ ثالثی کارروائی کی تکمیل سے پہلے ہڑتال یا لاک آؤٹ پر عملی جامہ پہنانا خلاف قانون تھا۔

۱۹۴۱ء ہی میں ESSENTIAL SERVICES MAINTENANCE

ORDINANCE کے نام سے ایک دوسرا قانون بھی نافذ ہوا۔ اس قانون کے مطابق ایسی ملازمتوں میں جنہیں لازمی قرار دیا گیا ہے، کوئی شخص اپنی ملازمت کی جگہ نہیں چھوڑ سکتا تھا اور اپنی ملازمت کے دوران دیئے جانے والے معقول احکامات کی تعمیل سے انکار نہیں کرسکتا تھا۔ ڈیوٹی سے غیر حاضری یا پھر ملازمت چھوڑ دینا جرم سمجھا جاتا تھا اور سخت تعزیری کارروائی کا حقدار تھا اس آرڈیننس کے تحت کسی ملازم کو کسی معقول وجہ کے بغیر برطرف کرنے والا آجر بھی مجرم تھا۔

اپریل ۱۹۴۳ء میں DEFENCE OF INDIA RULES. میں دفعہ ۵۹ ڈی کا اضافہ کیا گیا جس کے ذریعہ کچھ شعبوں میں ہڑتال پر پابندی عائد کردی گئی افراد کے گروہ کی جانب سے کسی بھی شعبے میں کام کے التواء یا بند کئے جانے کو ہڑتال کے زمرے میں لایا گیا البتہ اگر یہ کام کسی متعلقہ شعبے میں صنعتی تنازعہ کی وجہ سے بند ہوا ہے تو اسے ہڑتال میں شمار نہیں کیا جائے گا۔

صنعتی دستور سازی کے اس ہنگامی سلسلے میں ہمیں ڈیفنس آف انڈیا رولز کا ضابطہ ۸۱ اے بھی ملتا ہے جسے جنوری ۱۹۴۲ء میں نافذ کیا گیا تھا۔ اس ضابطے کی شقوں کو ذیل میں مختصراً بیان کیا گیا ہے۔

مرکزی سرکار نے یہ اختیار حاصل کیا ہے کہ صنعتی تنازعے کے سلسلے میں ہڑتال یا لاک آؤٹ پر پابندی عائد کرے اور آجروں اور مزدوروں یا دونوں کو ملازمت کی شرائط پر پابند رہنے کا حکم دے جس کا تعین اس آرڈر کے مطابق ہوسکتا ہے کسی بھی صنعتی تنازعہ کو مصالحت یا فیصلے کے لئے بھیجے، ان حکام کے فیصلے اور احکام نافذ کرے جن کے پاس یہ صنعتی تنازعہ بھیجا گیا تھا۔

بمبئی صنعتی تعلقات کا ایکٹ مجریہ ۱۹۴۶ء BOMBAY INDUSTRIAL RELATIONS ACT 1946 جنگ کے دوران اختیار کردہ ہنگامی قوانین کی توسیع تھا جس میں ابتدائی قوانین کے کچھ نقائص دور کرکے ۱۹۴۱ء کی ترمیم شامل کردی گئی تھی

نئے ضابطے کی اہم خصوصیات یہ تھیں۔

"لازمی قانونی مشینری کی لازمی مصالحت اور فریقین کو پابند کرنے میں فیصلے کی لازمی ثالثی" ایسے تمام تنازعے جو ثالثی کے لئے نہیں بھیجے گئے تھے انہیں لازمی مصالحت کے ذریعے تین مہینے کے اندر اندر حل کرنا ضروری تھا۔ وہ صنعتیں یا علاقے جن پر یہ ایکٹ لاگو نہیں ہوتا تھا وہاں ریاستی حکومت کی طرف سے نوٹیفیکیشن جاری کر کے لاگو کیا جاتا تھا۔ ریاستی حکومت کو یہ اختیار تھا کہ وہ کسی بھی صنعتی تنازعہ کو لیبر کورٹ یا صنعتی کورٹ میں ثالثی کے لئے بھیج سکتی تھیں۔ ایکٹ کی دفعہ ۱۲ کے مطابق مقامی علاقوں میں عام یا اسپیشل عدالتی اختیارات والے لیبر کورٹ کا قیام عمل میں لایا جا سکتا تھا۔ ان عدالتوں کو با اختیار بنایا گیا تاکہ وہ اپنے پاس آنے والے صنعتی تنازعات کا فیصلہ کریں ہڑتال یا لاک آؤٹ یا اسٹینڈنگ آرڈرز میں تبدیلی کی قانونی یا غیر قانونی حیثیت کے متعلق فیصلہ کریں اور اپنے فیصلوں کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ اس طرح لیبر عدالتیں ثالثی عدالتیں بن گئیں اور صنعتی عدالتیں اپیل کی عدالتیں بن گئیں۔

ما قبل آزادی کے دور میں صنعتی قوانین کے دو اہم نمونے پہلی جنگ عظیم کے بعد والے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں ایک طرف خلافت اور عدم تعاون کی تحریک کی مشترک سیاسی للکار تھی تو دوسری طرف ٹریڈ یونین تحریک موثر سیاسی قوت میں تبدیل ہو رہی تھی۔ صنعتی تنازعوں کے ایکٹ مجریہ ۱۹۲۹ء اور انڈین ٹریڈ یونین ایکٹ مجریہ ۱۹۲۶ء ٹریڈ یونینوں کے اثر کو بڑھنے سے روکنے اور انہیں قومی آزادی اور سماجی نجات کی تحریک کے سیاسی اثرات سے دور رکھنے کے لئے ایک آلہ تصور کئے جانے لگے۔ یہ کوئی اتفاق نہ تھا کہ ۱۹۲۹ء کا سال تاج برطانیہ کا تختہ الٹنے کی سازش کے الزام میں پورے ملک کے ٹریڈ یونین رہنماؤں کے خلاف میرٹھ سازش کیس، اور صنعتی تنازعوں کا قانون نافذ ہونے کا سال تھا۔ اس ایکٹ کا اہم قانونی مقصد صنعتی مزدوروں کی سیاسی اور عام ہڑتال پر پابندی

عائد کرنا تھا۔ اس قانون کے تحت سیاسی ہڑتال سے مراد وہ ہڑتال لی گئی تھی جس کا مقصد حکومت پر اپنی پالیسی بدلنے کے لئے دباؤ ڈالنا تھا اسی طرح عام ہڑتال کا مطلب کسی صنعت میں ایسی ہڑتال سے تھا جس کا اپنے فوری اُبھرسے کوئی تنازعہ نہ ہو۔

صنعتی تنازعوں کا قانون جس کے اہم نکات تقریباً چالیس سال سے برصغیر میں رائج ہیں کو اپنی موجودہ شکل میں پہنچنے تک دو دہائیوں کا عرصہ صرف ہوا۔ یہ قانون صرف رفاہ عامہ کے اداروں میں ہڑتال اور سیاسی یا عام ہڑتال پر پابندی سے شروع ہوا جس کی صنعتی تنازعات کے عدالتی فیصلوں سے کوئی مطابقت نہیں تھی جو مصالحتی بورڈوں اور انکوائری عدالتوں وغیرہ کے فیصلے کو عملی جامہ پہناتے۔ ان کی رپورٹوں اور فیصلوں سے سرمائے اور محنت کے درمیان تنازعے کی حقیقت کے بارے میں رائے عامہ کی بہتر تعلیم سے بڑھ کر اور کوئی امید نہیں کی جاتی تھی۔

۱۹۴۷ء کے ایکٹ میں یہ اصول تسلیم کیا گیا کہ جب تک پہلے ہی سے دونوں فریقوں کو پابند کرنے والا فیصلہ یا تصفیہ موجود یا عمل میں نہ ہو تب تک جب بھی ہڑتال یا لاک آؤٹ پر پابندی ہو وہ تنازعہ کے عدالتی حکم کے ساتھ ساتھ ہو۔ تاہم کسی صنعتی عدالت یا ٹریبونل میں تنازعہ کے عدالتی حکم کا حوالہ حکومت کے لئے اختیاری رہا جب تک دونوں فریقین مشترکہ طور پر اس کے لئے مطالبہ نہ کریں۔ اس طرح یہ پالیسی قومی صنعت کے حساس شعبوں میں مخصوص چیزوں تک محدود رہی اور باقی صنعت میں محنت کی شرائط متعین کرنے کے لئے اجتماعی سوداکاری اور سرمائے اور محنت کے درمیان قوت کی آزمائش کے لئے کافی گنجائش چھوڑی گئی۔ رجسٹریشن کے بعد ٹریڈ یونینوں کے اندرونی معاملات میں حکومت کی مداخلت معمولی رہی۔ ٹریڈ یونینوں کے رجسٹرار کے انتظامی اختیارات کو اس حد تک محدود کر دیا گیا کہ وہ صرف ٹریڈ یونینوں کی طرف سے باضابطہ طور پر پیش کئے گئے سالانہ حساب کو قطعی شکل دے۔

پاکستان میں پہلی مارشل لا حکومت (۶۸ - ۱۹۵۸ء) کے دور میں صنعتی تنازعات کے قانون کے اس پہلو سے روگردانی کی گئی اور بعد کے سالوں میں ٹریڈ یونین ریگولیشن آرڈیننس کے ذریعہ ٹریڈ یونینوں پر تسلط اور انہیں کنٹرول میں رکھنے کے لئے حکومت کا راستہ کھولا جو اس کے بعد سے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

صنعتی تنازعات کا آرڈیننس مجریہ ۱۹۵۹ء مارشل لا حکومت کی طرف سے ایک ایسا اعلان تھا جس کے ذریعہ نجی مقامی سرمایہ دار انفرادی قوت میں ملک کے تمام تر وسائل کو استعمال کرنے میں آزاد تھے۔ قانون میں بہت سی ترامیم کے ذریعے ہڑتالوں پر تقریباً مکمل پابندی عائد کر دی گئی اور تقریباً تمام علاقوں میں لازمی عدالتی فیصلہ کا نظام نافذ کر کے اجتماعی سودے کاری کو ناممکن بنا دیا گیا۔

اجتماعی سودے کاری اور ہڑتال پر پُر فریب طریقوں سے پابندیاں عائد کرنے کی وجہ سے مزدوروں اور یونینوں کے پاس صرف ایک فورم موجود رہ گیا تھا اور وہ تھا صنعتی عدالتیں۔ جہاں پُر فریب اور مصنوعی قسم کی فنی پیچیدگیاں مزدوروں کو کسی قسم کے معاشی انصاف کے حصول میں رکاوٹ ڈالتی تھیں۔ ٹریڈ یونینوں سے کٹی کرانے کی کوشش کی گئی اور انہیں دوسرے قانونی اقدامات سے متعارف کرا کے غیر ضروری بنانے کی کوشش کی گئی۔ مثلاً مزدوروں کی جنرل باڈی کے اجلاس میں چنے گئے پانچ منتخب نمائندوں کا تصور جو صنعتی تنازعہ کھڑا کرنے اور ہڑتال کا نوٹس دینے کے مجاز تھے۔ ٹریڈ یونینوں کو کسی بھی عہدے کے لئے کارخانے سے باہر کے لوگوں کو ماسوائے یونینوں کے "کل وقتی ملازم" کے طور پر منتخب کرنے پر پابندی تھی۔ آجروں کی طرف سے ٹریڈ یونینوں کو تسلیم کرنے کی جامع اسکیم بھی متعارف کرائی گئی۔

ان قانونی کارروائیوں کا مجموعی اثر یہ نکلا کہ ٹریڈ یونین تحریک کو اس حد تک دبا یا گیا کہ ڈاکٹر محبوب الحق جیسے آدمی کو بھی اپنے مضمون میں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ اس دہائی کے آخر میں محنت کشوں کی حقیقی اجرتیں ۱۹۵۶ء کے اوائل کے مقابلے میں کم تھیں۔ صنعتی تنازعات ابھرنے

اور عدالتی فیصلے کے لئے پیش ہونے سے پہلے ہی انہیں "ہنگامہ خیز" کہہ کر دور از قیاس یا تصوراتی قانونی اعتراض کی بنیاد پر مسترد کر دیا جاتا تھا۔ یہ تمام اقدامات صنعتی تنازعات کے آرڈیننس میں مخصوص ضابطہ متعارف کرانے کے بعد ہی ممکن ہو سکے۔ صنعتی تنازعات کیسے ایمانداری اور سچائی سے التوا میں ڈالے جاتے تھے اور انہیں کس طرح فنی پیچیدگیوں میں الجھایا جاتا تھا اس کی ایک کلاسیکی مثال وہ مقدمہ ہے جو بیس سال سے اب تک اعلیٰ عدالتوں زیر سماعت ہے جبکہ جن مزدوروں نے یہ تنازعہ کھڑا کیا تھا۔ وہ تمام کے تمام یا کم سے کم ان میں سے زیادہ مر گئے ہوں گے۔ تنازعہ کی MAINTAINABILITY کے متعلق قانونی نقطے کا فیصلہ اب تک تشنہ ہے۔ اس سلسلے میں AF FERGUSONS مقدمہ پر سپریم کورٹ آف پاکستان کا تازہ فیصلہ اس موضوع پر قانون کی جو تشریح کرتا ہے اسے خوش آئند قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہ بات بنا کسی مبالغے کے کہی جا سکتی ہے کہ اجتماعی سودے کاری کے راستے بند کرنے اور ۶۰ء کی "شاندار دہائی" کے دوران صنعتی تنازعات کو تکنیکی بنیادوں پر رد کرنے کے نتیجے میں ۱۹۶۸-۷۰ء کے دور میں صنعتی مزدوروں کے درمیان "گھیراؤ" جیسے منفی رجحان کی تحریک نے جنم لیا۔

صنعتی تنازعات کا آرڈیننس مجریہ ۱۹۶۹ء کی بنیاد تو ۱۹۵۹ء کے آرڈیننس کے قانونی اصولوں پر ہی رکھی گئی تھی لیکن یہ اپنے پیش رو کی بہ نسبت مختلف تھا۔ ابتدا میں یہ قانون لازمی عدالتی فیصلے کی بجائے لازمی ہڑتالی کارروائی کا قانون ظاہر ہوا۔ کیونکہ کم از کم تیس دن تک چلنے والی ہڑتال یا لاک آؤٹ کے بغیر کسی صنعتی تنازعہ کا عدالتی فیصلے کے لئے پیش کیا جانا ممکن نہ تھا۔ پانچ منتخب نمائندوں کی بجائے جو صنعتی تنازعہ کھڑا کرنے کے مجاز ہوں ہمارے پاس صرف رجسٹرڈ ٹریڈ یونین تھی جو اجتماعی سوداکاری کا ایجنٹ ہونے کے ساتھ ساتھ صنعتی تنازعہ کھڑا کرنے کا خصوصی حق رکھتی تھیں۔ سندھ لیبر اپیلیٹ ٹریبونل کے چیئرمین جسٹس

انعام اللہ خان نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ ٹریبونل ریلیشن آرڈیننس نے آجر کے خلاف مزدوروں کی شکایات اور حقوق کے سلسلے میں انفرادی مزدور کی شخصیت کو اجتماعی سودے کاری ایجنٹ کی شخصیت میں بالکل مدغم کر دیا تھا۔

یہ صورت حال بہرحال جلد ہی درست کر لی گئی اور قانون نے بہت سی ترامیم کے ذریعہ ایک طرف تو ہڑتال اور اجتماعی سودے کاری کے درمیان توازن پیدا کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف اجتماعی سودا کاری ایجنٹ کے مخصوص حقوق اور انفرادی محنت کشوں کی طرف سے لیبر عدالت کے سامنے اپنی شکایات اٹھانے کے حق میں توازن پیدا کیا گیا۔

بہرحال صنعتی تعلقات کے آرڈیننس کا مختصر جائزہ بھی دو رجحانات کا ذکر کئے بغیر مکمل نہیں ہوگا جو آخری مرحلے پر ظاہر ہوئے اور تیسرے مارشل لا کے گزشتہ آٹھ سالوں کے دوران مزید مستحکم ہوئے۔

ان میں سے پہلے رجحان کا مقصد ان صنعتوں، اداروں اور سرگرمیوں کی تعداد بڑھانا تھا جو صنعتی تعلقات کے آرڈیننس کے دائرہ کار میں نہ آتے ہوں اور اس طرح مزدوروں کی اکثریت کو لیبر عدالتوں یا کسی اور صنعتی عدالتی کارروائی میں شریک ہونے سے روکنا تھا۔

دوسرے رجحان کا مقصد ٹریڈ یونینوں کو سرکاری اہلکاروں یعنی رجسٹرار آف ٹریڈ یونینز کا اطاعت پذیر بنانا اور ان کے زیر تسلط لانا تھا۔

صنعتی قوانین تک مزدوروں کی دسترس اور اپنی شکایات کی تلافی کے لئے کسی فورم تک مزدوروں کی رسائی سے بڑھتے ہوئے انکار کو آئی آر او سیکشن نمبر ۱(۳) کی ترمیم کے ذریعے عملی جامہ پہنایا گیا۔ اس کے مطابق عدالتوں میں "صنعت" اور "محنت کش" کی تشریح کو محدود سے محدود تر کیا جاتا رہا اور مختلف معاملات کو فنی پیچیدگیوں کی حد سے زیادہ تکمیل کے ذریعے الجھا دیا گیا۔ مثلاً شکایتی نوٹس پر محنت کش کے اپنے دستخط لازمی قرار دیئے گئے اور اپنے وکیل کے دستخطوں سے پیش کئے گئے نوٹس مسترد کر دیئے گئے۔

اس کے باوجود کہ گزشتہ سات آٹھ سالوں کے دوران نجی شعبے کی بالادستی پر زور دیا گیا ہے ریاست ابھی تک ملک کی سب سے بڑی آجر ہے۔ مختلف قانونی اور دوسرے اقدامات کے ذریعے اس نے خود کو اور اپنی سرپرستی میں چلنے والے اداروں کو صنعتی قوانین خصوصاً صنعتی تعلقات کے قانون اور اسٹینڈنگ آرڈرز آرڈیننس مجریہ ۱۹۶۸ء کے دائرے سے مستثنیٰ قرار دے دیا ہے۔

جمود دراصل ESSENTIAL SERVICES MAINTENANCE ACT

دوسری جنگ عظیم کے بعد والے دور میں بطور ایمرجنسی اقدام کے منظور کیا گیا تھا مستقل قانون بن چکا ہے حالانکہ ملک سے ایمرجنسی اٹھائی جا چکی ہے۔ سپریم کورٹ کے تازہ ترین فیصلے کے مطابق تمام عدالتیں اس ایکٹ کے تحت مزدوروں کو دیئے گئے حقوق پر عملی جامہ پہنانے کے اختیار سے محروم ہو گئی ہیں اور سرکاری و نیم سرکاری اداروں کے مزدوروں کو انتظامیہ اور ادارے کے خلاف ان گنت شکایات سے نجات کا کوئی وسیلہ میسّر نہیں ہے۔

جہاں تک ٹریڈ یونینوں پر محکمہ محنت اور رجسٹرار آف ٹریڈ یونینز کے بڑھتے ہوئے تسلّط پابندیوں اور بالآخر غلبے کا تعلق ہے یہاں اُن وسیع تر اختیارات کا ذکر کرنا بیجا نہ ہوگا جو انہیں ۱۹۷۴ء کی دفعات کے ذریعے عطا کئے گئے ہیں۔ جن سے رجسٹرار کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ یونین کے نمائندوں کی فہرست میں کسی بھی تبدیلی کو رد کر سکتے ہیں۔ اس طرح یونینوں کے داخلی انتخابات محکمہ محنت کی منظوری کے محتاج ہو گئے ہیں۔

مضمون کے آخر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ محنت کش جن کے آئینی یا قانونی حقوق کی خلاف ورزی کی جا رہی ہے۔ عدالت میں انصاف کے لئے رجوع کرنے کو ترجیح دیں گے لیکن لوگ پرامن اور آئینی ذرائع کے صرف اس وقت تک پابند رہ سکتے ہیں جب یہ ثابت کیا جا سکے کہ غیر قانونی کارروائی کے مقابلے میں کوئی معقول، موثر، باآسانی، دستیاب اور ہمدردانہ قانونی نعم البدل موجود ہے۔ محنت کشوں کے ایک کے بعد دوسرے حصوں پر انصاف کے دروازے بند کر دینے کا عمل عوام کے بے چین اور ناامید حلقے کو قانون کی حکمرانی پر اعتماد سے منحرف کر سکتا ہے۔

صنعکاری، سامراجی سرمایہ اور مزدور تحریک

نبی احمد

ٹریڈ یونین تحریک میں کمزوری کی وجوہات

میں آپ تمام حضرات کی توجہ اس حقیقت کی طرف دلانا چاہتا ہوں کہ قیام پاکستان کے وقت ملک کے اس حصّہ میں جو پاکستان کہلایا، صنعتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ میں اب ان تمام اسباب کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں جن کی وجہ سے بے شمار افراد کی بے پناہ قربانیوں کے باوجود بدقسمتی سے ہمارے ملک میں آج تک مزدور تحریک بنیادی طور پر طاقت حاصل نہیں کر سکی۔ ماسوا ریلوے اور سرکاری شعبوں کے ادارے میں، صنعتی شعبوں میں کارکنوں کی تعداد انتہائی محدود تھی۔ ٹریڈ یونین تحریک کی کمزوری کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ملک میں کوئی مضبوط سیاسی پارٹی موجود نہیں تھی ایک بڑا سبب کمزوری کا یہ تھا کہ اس حصّے میں قبائلی جاگیردارانہ سماج نے عوام کے ذہنوں پر انتہائی گہرے خراب اثرات مرتب کئے قیام پاکستان کے بعد ایک بڑے منظم طریقے سے عقیدے، مسلک، مذہب، قبائلی، علاقائی، لسانی مسائل کو فروغ دیا گیا۔ ایک اور سبب کمزور مزدور تحریک کا میرے اپنے خیالات کے مطابق یہ ہے کہ تقسیم ہند نے سالہا سال سے منظم اور متحد معاشرے کو اجاڑ دیا افراد قومی اور ملکی مسائل کی بجائے اپنے ذاتی مسائل میں الجھے، الاٹمنٹ، زمین، مکان روزگار اور ذاتی معاملات کی طرف اکثریت کی توجہ مبذول ہوئی ایک اور سبب جس کی وجہ سے ٹریڈ یونین تحریک اس ملک میں مضبوط بنیادوں پر قائم نہ ہو سکی میرے نقطہ نظر سے سیاسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نوکر شاہی نے تمام وسائل پر قبضہ کیا اور حکمران عوام سے روز بروز دور سے دور تر ہو گئے۔ تمام جمہوری اداروں کو ان حالات میں شدید نقصان پہنچا۔ صنعتی نشوونما کے ساتھ

ٹریڈ یونین اپنے قدم مضبوطی سے نہ جما سکی اور نوکر شاہی نے اس ادارے پر بھی اپنے پسند کے افراد کا تسلط قائم کر دیا۔ صنعتیں اس طرح منظم کی گئیں کہ پاکستانی کارکنوں کو اپنے ہی ملک میں بار بار مہاجر بننا پڑا۔ مزدوروں کو ایک دوسرے سے دور رکھنے کے لئے بڑے بڑے صنعتی شہروں میں علاقائی بنیاد پر آبادکاری کی گئی تاکہ زبان، کلچر اور مقامی مسائل علیحدہ علیحدہ خانوں میں تقسیم رکھے جائیں اور کارکنوں کو متحدہ جدوجہد کے راستے سے ہٹایا جائے۔ ایک اور سبب ٹریڈ یونین کی کمزوری کا میرے نقطۂ نظر سے یہ رہا کہ ملازمتوں کی علاقائی عمائدین، مذہبی رہنماؤں، ذاتی مفاد رکھنے والوں اور با اثر طاقتور عناصر کے ذریعہ فراہمی کے بعد کارکنوں کو ان کے اپنے مفادات کے خلاف استعمال کیا گیا۔ ایک اور سبب جو ٹریڈ یونین کی کمزوری کا باعث بنا وہ یہ تھا کہ بے ضمیر، خود غرض افراد کو ٹریڈ یونین کے نام پر ہر طرح نوازا گیا۔ بیرون ملک کے دورے اور گھومنے پھرنے کے مواقع فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اندرون ملک منفعت بخش نمائندگی کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ کورٹ، ویجز بورڈ اور دوسرے ایسے تمام ادارے جہاں کارکنوں کو نمائندگی کی خاطر جانا پڑتا تھا خاطر خواہ الاؤنسز جاری کئے گئے۔ باضمیر، ایماندار اور مخلص افراد کے لئے ٹریڈ یونین میں کام کرنے کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ مزدور قوانین میں خاطر خواہ تبدیلی کے بجائے، غلامی کے دور میں مزدوروں کو جو حقوق حاصل تھے انہیں بھی رفتہ رفتہ سلب کیا گیا۔ غیر ملکی ماہرین کی آمد کے بعد مزدور دشمن اقدامات کے نایاب طریقے وضع کئے گئے۔ تعلیم کے نام پر ذہنوں کو مسموم کیا گیا۔ صنعتی ترقی کے نام پر مزدوروں اور عوام کو دل کھول کر لوٹا گیا۔ تمام دوراندیش باہر باہم خصوصیات کے حامل اداروں میں یونین سازی میں رکاوٹ ڈالی گئی۔ بھروسے کے افراد تلاش کئے گئے اور مختلف پرکشش نعروں کی بنیاد پر کارکنوں کو کئی کئی تنظیموں میں تقسیم کیا گیا مختصراً یہ تھے وہ عوامل جو میرے نقطۂ نظر سے اس ملک میں ٹریڈ یونین تحریک کے

لئے سب سے زیادہ نقصان کا سبب بنے۔

آزادی کے فوراً بعد کے مزدور قوانین

جیسا کہ آپ حضرات کو علم ہے کہ تقسیم سے قبل صرف مسلح افواج اور پولیس پر یہ پابندی تھی کہ وہ ٹریڈ یونین میں شامل نہیں ہو سکتی ہیں۔ باقی تمام افراد کو جو کسی بھی حیثیت سے ملازمت کرتے ہوں اس بات کا حق حاصل تھا کہ وہ انجمن سازی کریں۔ آزادی کے بعد اس حقیقت کے باوجود کہ انسانی حقوق کے بین الاقوامی بل کی دفعہ ۱۷، آزادی کے بعد پامال کیا گیا۔ اسلامی ری پبلک پاکستان کا دستور جس نے انجمن سازی کی ضمانت فراہم کی ہے وہ بھی آزادی کے بعد پامال کیا گیا۔ بین الاقوامی ادارۂ محنت ILO کا کنونشن ۸۷ بھی آزادی کے بعد حکومت پاکستان نے منظور کیا لیکن آزادی سے قبل انجمن سازی کا وہ حق جو تمام کارکنوں کو حاصل تھا آزادی کے بعد ان تمام متبرک دستاویزات کی موجودگی کے باوجود انجمن سازی پر جس طرح رفتہ رفتہ پابندیاں عائد کی جاتی رہیں اس سے آپ تمام افراد بہتر طور پر واقف ہیں۔ حکومت پاکستان نے سب سے پہلے اگست ۱۹۵۵ء میں اپنی لیبر پالیسی کا اعلان کیا اور اس لیبر پالیسی کے الفاظ یہ تھے

"حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ مزدوروں کی سطح پر اجتماعی سوداکاری کو فروغ دیتے ہوئے ملک میں حقیقی اور صحت مند ٹریڈ یونین سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور مذاکرات کے ذریعہ ملکی معیشت کو فروغ دینے کے لئے مزدوروں کے استحصال کو ختم کر کے ان کی فلاح و بہبود پر توجہ دی جائے۔ اجتماعی سوداکاری کے طریقے کی حوصلہ افزائی کی جائے اور اسے بہتر بنایا جائے حکومت پاکستان بین الاقوامی ادارۂ محنت کے کنونشن ۹۸ کو منظور کر کے پہلے ہی ان تمام باتوں سے اتفاق کر چکی ہے۔"

یہ ۱۹۵۵ء میں حکومت کی پالیسی تھی پھر ۱۹۵۹ء میں تبدیلی آئی اور کہا گیا

" صنعتی زرعی اور تجارتی ہر طرح کے مزدوروں کے حالات

بہتر بنانے کے لئے حکومت پاکستان، ملکی حالات کا بغور جائزہ لینے کے بعد اکثر نہایت کا اعلان کرتی ہے کہ اس نے لیبر پالیسی کے درج ذیل اہداف مقرر کئے ہیں تاوقتیکہ ان میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ نہ کی جائے۔

۱۔ محنت کے میدان میں حکومت کی پالیسی کی بنیاد، بین الاقوامی ادارہ محنت کے کنونشنوں اور سفارشات پر مبنی ہوگی جنہیں پاکستان پہلے ہی منظور کر چکا ہے

۲۔ حکومت پاکستان اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ صحت مند ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں اضافہ صحت مند معاشرے کے لئے بہت ضروری ہے جس میں صنعتی اور سماجی امن کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ پیداوار اور دولت کی منصفانہ تقسیم ہوتی ہے۔"

تیسری بار حکومت نے لیبر پالیسی کا اعلان ۱۹۶۹ء میں کیا اور تعارفی پیش لفظ میں پہلی مرتبہ سرکاری طور پر باضابطگی کے ساتھ تسلیم کیا گیا کہ کارکنوں کے ساتھ شدید زیادتی اور ظلم ہوتا رہا ہے الفاظ یہ تھے۔

"حکومت اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ ماضی میں جو اعلیٰ پیداداری اور خوشحالی کا دور تھا مزدوروں کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ ان کی اصل آمدنی اور حالت جوں کی توں بلکہ بہت سوں کے معاملے میں پہلے سے بدتر ہوگئی کسی بھی ترقی پذیر ملک میں بڑھتی ہوئی معاشی ترقی کا مقصد قومی استحکام ہونا چاہیئے۔ بغیر تیز رفتار معاشی ترقی اور استحکام کے ہم غربت کے تسلسل سے نجات حاصل نہیں کر سکتے اور ہماری آنے والی نسلوں کو ہماری ناکامی کی قیمت چکانی پڑے گی لیکن اس قسم کی ترقی اسی وقت سود مند ہوگی جب ملک کے ہر شہری کو معاشی ترقی کے فوائد سے بہرہ در ہونے کا حق حاصل ہو۔ درحقیقت ترقی کے اس عمل کو اسی صورت میں برقرار رکھا جا سکتا ہے جب ہر شہری ملکی ترقی کے کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے۔"

میرا مقصد ان تینوں پالیسیوں کے مذکورہ حصوں کو پیش کرنے اور ان پر بات کرنے سے یہ تھا کہ آیئے اب ہم اور آپ اس بات کا تجزیہ کریں کہ گزشتہ تمام حکومتوں نے اپنی پالیسی کا جن الفاظ کے ساتھ اظہار کیا ہے ان کا حقائق کے ساتھ کیا رشتہ رہا؟

پہنچے تھے۔ تو جتنے تربیت یافتہ افراد تھے ٹریڈ یونین کے، جان بوجھ کر سب کو ٹریڈ یونین سے محروم کرنے کے لئے گریڈنگ کی بنیاد پر ایک ایسے ملک میں جہاں عام لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لئے مساوات کی لمبی چوڑی باتیں کی جاتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ہمارے یہاں کسی قسم کا طبقاتی فرق نہیں ہے۔ اسلام طبقات کے شدید خلاف ہے اور سب برابر برابر ہیں۔ اگر اس ملک میں کارکنوں کو رتبے اور درجے کے حساب سے تقسیم کر دیا جائے تو آپ اندازہ لگائیے کہ یہاں کس قدر غلط بیانی اور جھوٹے طریقے سے اسلام کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ گروپ پانچ کے بعد سرکار نے زندہ ٹریڈ یونینوں کو جبری طور پر یکجا کرنے کا فیصلہ کیا۔ یکجا کیا اور پھر اس کے بعد پی آئی اے میں کام کرنے والے تمام ارکان کو جنہوں نے ٹوٹے پھوٹے جہازوں سے کاروبار شروع کیا تھا۔ جن کی محنت، جن کی قربانی، جن کی قابلیت جن کی ہوشیاری کی بدولت ایک ایسی صنعت قائم ہوئی جس نے اقوام عالم میں پاکستان کا نام روشن کیا یہ صلہ دیا گیا کہ ان پر پابندی عائد کر دی گئی اور اس سے زیادہ شرمناک صورتحال دنیا کے کسی خطے میں نہیں ہو سکتی کہ نہ صرف ٹریڈ یونینوں پر پابندی لگائی گئی بلکہ حکومتی سطح پر یہ کہا گیا کہ آج تک جتنے معاہدے اور سٹلمنٹ اس ادارے میں ہوئے اور جن کا تعلق شرائط ملازمت سے تھا وہ بھی سب کے سب کالعدم قرار دیئے گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کارکنوں کو کلی طور پر انتظامیہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا کہ جنہوں نے پچیس تیس سال کی طویل جدوجہد کی اور یہی نہیں کہ اس جدوجہد میں وہی معاہدے شامل ہوں جو انقلابیوں نے کئے تھے بلکہ اس دوران میں ایسے افراد نے بھی معاہدے کئے جو اسلام کے بڑے پرستار تھے تو اسلام کے نام پر کئے گئے معاہدوں کو بھی اسی طرح کالعدم قرار دیدیا گیا جس طرح انقلابی ٹریڈ یونینوں کے کارکنوں نے بڑی جدوجہد کے بعد اپنے حالات کو بہتر بنانے کے لئے حقوق حاصل کئے تھے۔ میرے خیال میں دنیا کے کسی خطے میں آپ کو ایسی مثال نہیں ملے گی جہاں یہ کہہ دیا گیا ہو کہ ماضی کی طویل جدوجہد

ریاستی شعبے میں مزدور قوانین

ایک طرف بین الاقوامی ادارۂ محنت کے اس کنونشن کا حوالہ دیا گیا ہے کہ جہاں اس بات کی ضمانت فراہم کی گئی ہے کہ بغیر کسی فرق کے تمام کارکنوں کو خواہ ان کا تعلق سرکاری اداروں کے ساتھ ہو یا غیر سرکاری اداروں کے ساتھ ہو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ انجمن سازی کر سکیں ایک کنونشن کا حوالہ دیا گیا ہے جس کے مطابق تمام کارکنوں کو اس بات کا حق دیا گیا کہ وہ اپنے حالات کار کو بہتر بنانے کے لئے شرائط ملازمت کو درست کرنے کی غرض سے ہڑتال کے حق کو استعمال کر سکتے ہیں۔ اب آئیے ہم اور آپ اس بات کا تجزیہ کریں کہ قیام پاکستان کے بعد سے ہوتا کیا رہا؟ پولیس اور افواج کے علاوہ سب سے پہلا حملہ اس وقت کیا گیا جب یہ کہا گیا کہ ہر وہ شخص انجمن سازی کے حق سے محروم ہو جائے گا جو ریاستی انتظام Administration of state کے تحت کام کرے گا۔ دیکھا آپ نے اس وار کا دائرہ کس قدر وسیع ہوا اس ملک میں اس کا تصور آپ یوں کر سکتے ہیں سندھ روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن نے پہلے لیبر کورٹ میں پھر ٹریبونل میں پھر ہائی کورٹ میں اور پھر سپریم کورٹ میں یہ مقدمہ داخل کیا کہ ہمارا کنڈیکٹر، ہمارا ڈرائیور ہمارا میکینک، ہمارا کلینر یہ سب ایڈمنسٹریشن آف دی اسٹیٹ کے تحت کام کرتے ہیں۔ اس کا دائرہ اتنا وسیع ہوا کہ ہر وہ فرد جو کسی ادارے میں بھی کام کر رہا ہے جہاں کہ کچھ سپلائی فوج کو جاتی ہے تو یہ کہا گیا کہ اس کا تعلق افواج پاکستان سے ہے اور اس لئے اس کا تعلق ایڈمنسٹریشن آف دی اسٹیٹ کے ساتھ ہے لہذا یہاں کے کارکنان انجمن سازی کے حق سے محروم رکھے جائیں گے۔ سب سے بڑا حملہ اس وقت کیا گیا جب یہ کہا گیا کہ پی آئی اے کے گروپ پانچ کے تمام کارکنان انجمن سازی کے حق سے محروم ہیں۔ یہ وہ افراد تھے جنہوں نے قیام پاکستان کے بعد سے جب کہ پی آئی اے کا وجود بھی نہیں تھا اورینٹ ائرویز کے نام سے فضائی سروس کا کاروبار ہو رہا تھا طویل عرصے تک خدمات سرانجام دینے کے بعد تجربہ حاصل کیا تھا اور گروپ پانچ تک

کے بعد جو حقوق آپ نے حاصل کئے ہیں خواہ اس کا تعلق علاج معالجے سے ہو، خواہ پراویڈنٹ فنڈ سے ہو، خواہ اس کا تعلق گریجویٹی سے ہو، خواہ اس کا تعلق تنخواہوں کے ڈھانچے سے ہو، وہ سب کے سب کالعدم قرار دیئے گئے۔ یہ ہمارے ملک عزیز میں ہوا۔ آپ اگر غور کریں گے تو انجمن سازی کے حق کے سلسلے میں سیکیورٹی پرنٹنگ پریس اور سیکیورٹی پیپرز کا نام بھی سرفہرست آئے گا کہ حکومت نے انتہا سے زیادہ ڈھٹائی کے ساتھ ایک ایسے ادارے میں جہاں، ٹیکنیکل سیمی ٹیکنیکل اور انتہا سے زیادہ قابلیت کے افراد ملازم ہوں (دنیا بھر میں یہ بات مانی گئی ہے کہ سب سے زیادہ ٹیکنیکل کام پرنٹنگ انڈسٹری کے اندر ہوتا ہے) پی آئی اے کی طرح سیکیورٹی پریس کو بھی کارکنوں نے ٹوٹی پھوٹی مشینوں سے شروع کیا اور وہ نوٹ، اور وہ سرکاری دستاویزات جو پہلے باہر سے چھپ کر آتے تھے وہ سب کے سب پاکستان میں چھپنے لگے اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہم غیر ملکی کرنسی نوٹ چھاپ کر زرمبادلہ کما رہے تھے وہاں کے کارکنوں کو یہ اجر اور صلہ دیا گیا کہ انہیں بھی ٹریڈ یونین کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ سیکیورٹی پیپر نیا کارخانہ لگایا گیا تھا جو سادے سرکاری تمسکات تیار کرنے والا ادارہ تھا تو سیکیورٹی پریس کے ساتھ نزلہ سیکیورٹی پیپر پر بھی گرا اور وہاں کے کارکنوں کو بھی انجمن سازی کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ ایک بڑا الزام یہ عائد کیا گیا کہ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور پریس کے ذریعہ ایسا مواد آتا ہے جو اسلام کے خلاف ہے۔ پہلے تو بڑے پیمانے پر اس کی تشہیر کی گئی اور اس کے بعد یہاں بھی کارکنوں پر حملہ کیا گیا اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے کارکنوں کو بھی انجمن سازی کے حق سے محروم کر دیا گیا۔

مزدور قوانین اور غیر ملکی ماہرین

یہیں پر خاتمہ نہیں ہوا حکومت نے بڑی چالاکی کے ساتھ اور باہر سے آئے ہوئے بڑے بڑے ماہرین کے مشوروں کے مطابق (جو کہ حقیقت میں آج بھی ہمارے ملک پر حکومت کر رہے ہیں) بعض دوسرے شعبوں میں بھی محنت کشوں کو ان کے حقوق سے محروم

کیا گیا ان غیر ملکی ماہرین نے یہ مشورہ دیا کہ کچھ ادر ایسے قانونی کام کرئے جائیں جس کے ذریعہ بے شمار مضبوط مزدور یونینوں کو کمزور بنایا جا سکے۔ مثلاً عوامی مفاد کی خدمت انجام دینے کے نام پر (Public utility service) گیس کو، بجلی کو، پانی کو صحت و صفائی کو پورٹ کو، ڈاک کو، ان تمام شعبوں کے افراد کو لازمی ملازمت یا خدمت (Essential service) کہا گیا ایک اور ستم ظریفی یہ ہے ہمارے ملک میں کہ عوام پر، غریبوں پر، کسانوں پر، مزدوروں پر جب کوئی ظلم ہوتا ہے تو عوام کے نام پر اس لازمی ملازمت یا خدمت کے سلسلے میں کہا گیا کہ یہ تمام خدمات اور سہولتیں عوام کے لئے جاری رہنا ضروری ہیں یہاں بھی جب ایسے اعلانات ہوتے ہیں کہ جو ظلم کیا جاتا ہے وہ آپ پر، آپ کے نام پر کیا جاتا ہے اور علم اور یہ ہنر غیر ملکی ماہرین، ہشیار اور استاد افراد کا بخشا ہوا ہے اور وہ Essential services جو برطانوی دور حکومت میں صرف جنگ کے زمانے میں محض اپنی فوج کی رسد برقرار رکھنے کے لئے وقتی طور پر رائج کی گئی تھیں وہ اس ملک میں اب ہمارے قانون کا حصہ بن گئیں۔ آزادی کے بعد سے جتنے بھی عوامی خدمات انجام دینے والے ادارے ہیں وہ براہ راست اس کی زد میں ہیں۔ حالت جنگ اس ملک میں ایک محدود مدت کے لئے رہی لیکن جنگ ختم ہونے کے باوجود جنگ کے نتیجے میں جو حقوق سلب کئے گئے وہ حقوق جنگ کے خاتمہ کے بعد بھی اسی طریقے سے سلب رہتے ہیں تو عوامی مفاد کی خدمت انجام دینے والے اداروں پر پابندی لگائی گئی جس میں ٹیلی فون، ٹیلیگراف اور ڈاک کے افراد شامل ہیں، ائر ٹرانسپورٹ کے افراد شامل ہیں۔

سامراجی سرمایہ اور اُس کا منافع

پاکستان میں آج یہ صورتحال ہے کہ غیر ملکی سرمایہ دار ہمارے ملک سے دولت لوٹ کرلے جاتے ہیں کیونکہ کنٹرولنگ شیئرز ان کے ہاتھ میں ہیں مثلاً یہ دیکھیں کہ دو سال

سکے عرصہ میں ۵۳ فیصد ڈیویڈنٹ اور بونس شیئرز کے طور پر ریکیٹ اینڈ کولمین
کے سرمایہ داروں کو ملا۔ سیبا گائیگی، دوائیں تیار کرنے والی کمپنی ہے اور یہ
بڑے مہربان لوگ ہیں۔ ہمارے بڑے دوست ہیں۔ دکھی انسانیت کی خدمت کے جذبے
سے سرشار ہیں انہوں نے پاکستان میں کارخانہ لگایا ہے غریب لوگوں تک دوائیں
پہنچانے کے لئے انہیں زندہ رکھنے کے لئے بیچارے بڑی خدمت کر رہے ہیں ان کا
بڑا نام ہے اور جب کبھی ان کے سربراہ ہمارے ملک میں قدم رنجہ فرماتے ہیں تو ہمارے
یہاں کے بڑے بڑے لوگ ان کی بڑی پذیرائی کرتے ہیں ان کے آگے بچھے جاتے ہیں۔
کہ جناب آپ ہماری بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ ہمارے ملک کو سنبھالے ہوئے ہیں۔
یہ دوائیں بنانے والا ادارہ ہے ایک ایسا ادارہ جس میں منافع کی شرح کم سے کم تر
ہونی چاہیئے تاکہ غریب سے غریب انسان کے لئے بھی دوا کا حصول ممکن ہو سیبا گائیگی
کی سرمایہ کاری ایک کروڑ پچاس لاکھ ہے سنہ ۱۹۸۴ء میں ۷۰ فیصد ڈیویڈنٹ دیا۔
جبکہ ۱۹۸۳ء میں یہی ڈیویڈنٹ ۱۲۰۵ فیصد ہے یعنی ۲ سال ۸۲۰۵ فیصد
ڈیویڈنٹ اور بونس شیئرز دیئے ایک ادارے نے دو سال کے اندر یہ کارگزاری
دکھائی جبکہ وہ سالہا سال سے اس ملک میں کام کر رہا ہے اور میں نے تو صرف
ان دو سالوں کا احوال انتہائی عجلت میں تحریر کیا ہے اس سے پہلے پتہ نہیں
اور کتنے فیصد ڈیویڈنٹ اور بونس شیئرز لے جا چکے ہیں۔ ذرا سوچیں کہ یہ جو نظام ہے
جب تک اسی طریقے پر رائج رہے گا اور جب تک اسے توڑا نہیں جائے گا اس وقت تک
آپ لاکھ ٹریڈ یونین کی آزادی حاصل کر لیں لیکن آپ انہیں اسی وقت قابو کر سکتے ہیں جب
یہ ظالمانہ نظام ختم ہو جائے کیونکہ جب تک یہ نظام رہے گا یہ لوگ قابو میں آنے والے نہیں۔
تیسرا کارخانہ ایکسون ہے جناب۔ امریکی ادارہ ہے۔ فرٹیلائزر یعنی کھاد بناتے ہیں جو ہمارے
غریب کسان خریدتے ہیں۔ یہ وہ چیزیں اور وہ مظالم ہیں جو ہمارے ملک کے کسانوں پر روا
رکھے گئے ہیں۔ میرے خیال میں ہمارے یہاں جتنا ظلم کسانوں پر ہوتا ہے اتنا ظلم ہمارے

صنعتی مزدوروں پر نہیں ہوتا تو یہ کارخانہ EXXON جناب غریبوں کے علاقہ میں قائم کیا گیا۔ غریب کسانوں کے لیئے کھاد تیار کرتا ہے تو اس نے ۱۹۸۳ میں ۴۵ فیصد اور ۱۹۸۴ء میں ۵۵ فیصد ڈیویڈنٹ اور بونس شیئرز دیئے اس کا مطلب دو سالوں میں سو فیصد ان کا سرمایہ دس کروڑ چالیس لاکھ ہے اور ۱۹۸۴ء میں جو ان کا نفع ٹیکس سے پہلے کا ہے وہ دس کروڑ ۸۱ لاکھ ہے ذرا ملاحظہ کریں کہ ان کی سرمایہ کاری کل دس کروڑ چالیس لاکھ ہے اور وہ بھی بونس شیئرز کے ذریعہ کئے جانے والے اضافے کے ذریعہ یہاں تک پہنچی ہے اور ان کا ایک سال کا نفع ٹیکس سے پہلے کا دس کروڑ ۸۱ لاکھ ہے اور انہوں نے دو سال کے اندر ۱۰۰ فیصد ڈیویڈنٹ اور بونس شیئرز کی شکل میں حصص یافتگان کو واپس کیا ہے اس میں کنٹرولنگ شیئرز ایکسون کے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ دس کروڑ چالیس لاکھ روپے صرف ایک کمپنی نے دو سال کے عرصہ میں امریکہ بھجوائے۔ ایکسون کے بعد پاکستان پر یاشیل جواب خیر سے آدھا مسلمان بھی ہو گیا ہے۔ اس نے ۱۹۸۳ء میں ۴۵ فیصد اور ۱۹۸۴ میں ۵۷.۶۶ فیصد ڈیویڈنٹ اور بونس شیئرز دیئے کل ملا کر یہ ۱۰۲.۶۶ فیصد بنا تو دو سال کے اندر سرمایہ کاری کے ۱۰۲.۶۶ فیصد کی واپسی ہوئی اور یہ تمام سرمایہ ہم اور آپ سے وصول کیا گیا۔ ہم نے آپ نے پیٹرول خریدا یا پھر رکشہ ٹیکسی بس اور منی کا کرایہ دیا ہوگا۔ تو یہ سب اس کی بدولت حاصل کیا گیا ہم سب نے کرایہ اس لئے دیا کہ پیٹرول کے دام زیادہ ہیں اور پیٹرول کے دام اس لئے زیادہ ہیں کہ دو سال کے اندر انہوں نے ۱۰۲.۶۶ فیصد انہوں نے حاصل کیا ان کی سرمایہ کاری ۷ کروڑ ۲۰ لاکھ ہے تو دو سال کے اندر انہوں نے ۷ کروڑ ۵۰ لاکھ کی رقم ہتھیالی اور اس کا بھی بیشتر حصہ یہ پاکستان سے لے کر چلے گئے۔

غیر ملکی کمپنیوں کی بات میں نے اس لئے نکالی کہ آپ تمام حضرات دیکھیں کہ غیر ملکی بڑی طاقتیں ہمارے ملک کو آزادی کی نعمت

سے کن مقاصد کے تحت اور کیسے کیسے ڈھکے چھپے انداز میں محروم کرنا چاہتی ہیں اگر حقیقت میں ہمارا ملک آزاد ہوتا اور حقیقت میں ہمارے یہاں قومی سرمائے کی کوئی ٹھوس اور مستحکم شکل موجود ہوتی تو ہماری قومی سرمایہ کاری ہم وطن مالک کی لڑائی بل کران لوگوں سے ہونی چاہیئے تھی جو غیر ملکی سرمایہ دار ہیں جن کا کوئی مفاد اس ملک سے وابستہ نہیں جن کا کوئی مفاد اگر ہو سکتا ہے تو یہاں کی جاسوسی کرنا ہے۔ اگر کوئی مفاد ہو سکتا ہے تو اس ملک کی دولت کو زیادہ سے زیادہ لوٹ کر اپنے ملک میں لیجانا ہے۔ کلورائیڈ والے یہ بیٹریاں بناتے ہیں اور آپ سوچتے ہوں گے کہ بیٹری بنانے والے کو کیا ایسا نفع ہو سکتا ہے۔ اس کا پہلے نام تھا ایکسائیڈ بیٹری تو ۸۳ء میں انہوں نے کل سرمایہ کاری کا پچانوے فیصد ڈیویڈنٹ اور بونس شیئرز دیئے۔ یقین آیا آپ کو ۹۵ فیصد کوئی تصور ہے دنیا کا ہم چھوٹے چھوٹے کاروبار کرنے والوں سے جھگڑ پڑتے ہیں ایک شخص جو تین بجے صبح منڈی جاتا ہے لائن میں لگتا ہے دھکے کھاتا ہے اور سبزی ٹھیلے پر رکھ کر لے آتا ہے تو ہماری خواتین اور ہم مرد حضرات کبھی کبھی اس پر شدید غصے کا اظہار کرتے ہیں کہ مارکیٹ میں تو چیز چودہ آنے ہے تم سولہ آنے بتا رہے ہو۔ تم دو آنے نفع لے رہے ہو ایک روپے میں دو آنے کا نفع تو وہ بیچارہ ان تمام صعوبتوں کو اٹھانے کے باوجود بڑا شرمندہ ہوتا ہے لیکن یہ خبر نہیں کہ ہمارے ملک کے وہ لوگ جو صرف کاروں اور ٹرکوں کے لئے بیٹری سپلائی کرتے ہیں انہوں نے ایک سال کے اندر ۸۳ء میں ۹۵ فیصد اور ۸۴ء میں ۳۵ فیصد یعنی دو سال کے عرصے میں ۱۳۵ فیصد کے ڈیویڈنٹ اور بونس شیئرز دیئے ۲ کروڑ ۲۴ لاکھ ان کی کل سرمایہ کاری ہے تو تقریباً ساڑھے تین کروڑ روپے انہوں نے دو سال میں حاصل کئے اور وہ اس کا بیشتر حصہ اس ملک سے لے کر چلے گئے اور اس کے باوجود یہ ان کا بہت بڑا احسان ہے کہ وہ تکنیکی مہارت بہم پہنچا رہے ہیں ٹیکنالوجی کی منتقلی میں ہماری مدد کر رہے ہیں تو ہم ان کے بڑے شکر گزار اور مشکور ہیں۔ ہمیں تو خیر سے کچھ آتا جاتا ہی نہیں تھا یہ تو انہوں نے بتایا کہ ڈرائی سیل اور بیٹری سیل کیا ہوتا ہے۔

اور اس کی چارجنگ اور ری چارجنگ کس طرح ہوتی ہے۔ بیٹری کیسے بنائی جاتی ہے۔
لیکن اس بیٹری کی آڑ میں جو ہمارے ملک کا سونا لوٹ کر یہاں سے لے جا رہے ہیں
یہ بڑی تشویش کا باعث ہے۔

جتنی غیر ملکی کمپنیاں ہیں ان میں سے بعض کمپنیوں کا معاملہ ایسا ہے
کہ مشینیں بھی وہ خود تیار کرتی ہیں اور خام مال بھی وہی فراہم کرتی ہیں اور پھر ایسی جگہ
جیسے لاطینی امریکہ، افریقہ اور پاکستان، سری لنکا اور بہت سے دوسرے غیر ممالک
میں ان کے اداروں میں کوئی مشین جب آئے گی تو ان کی اپنی کمپنی ہوگی بعض
اوقات تیس سال پرانی مشین کو جواب چلنا بند ہو گئی ہے، متروک ہو چکی ہے جسے
کوئی استعمال نہیں کرتا اس پر رنگ بڑا خوبصورت سا کیا نئی مشین بنا دی اور ہم اندھے
نئی مشین کے طور پر اس مشین کو لے آ رہے ہیں جو تیس سال پرانی ہے اور بیس سال سے
وہاں بند پڑی ہوئی تھی۔ اور نئی مشین کے دام دے رہے ہیں جو غیر ملکی زر مبادلہ کی
شکل میں پہلے ہی وہاں پہنچ گیا۔ خواہ وہ کیمیکل ہو یا کیمیاوی اجزا کا مرکب ہو یہ کثیر الاقوام
کمپنیاں جب خام مال ملک کے اندر لاتی ہیں تو ۲۰۰ سے لیکر ۴۰۰ فیصد تک نفع اپنے
ملک میں اسی وقت رکھ لیتی ہیں جب خام مال ہمارے پاس پہنچتا ہے وہی مال آج
دواؤں کی کمپنیاں یہاں بتاتی ہیں کہ اگر آپ چین سے وہی مال خریدیں تو آپ کو
فرض کریں ۴۰ روپے ٹن ملے گا اور اگر آپ اٹلی سے لیجئے تو ۷۰ روپے فی ٹن ملے گا اور
اگر آپ فرانس سے حاصل کریں تو ۱۲۰ روپے فی ٹن لیکن اگر آپ اسی کو برطانیہ سے لیں
تو ۳۰۰ روپے ٹن ملے گا۔ لیکن لندن سے ہمارا بڑا رشتہ ہے لندن کے تو ہم قریبی حلیف
ہیں ہم اب بھی چاہتے ہیں کہ ملکہ برطانیہ ہماری پھر سے ملکہ بن جائے ہماری بڑی خواہش
ہے کہ ہم کامن ویلتھ میں پھر سے داخل ہو جائیں۔ ہم تو بڑے محروم ہو گئے ان سے
علیحدگی کے بعد ہندوستان کو دیکھیں آج بھی کامن ویلتھ کے ساتھ لگا ہوا ہے۔
تو ہمارا ابھی مقابلہ ہے اس لئے ہم چین سے نہیں خریدیں گے کہ وہ کافر ہیں اٹلی

سے نہیں خریدیں گے کہ دھوکے باز ہیں، ہم فرانس سے بھی نہیں لیں گے جن ہم تو برطانیہ سے خریدیں گے وہ ہمارا یار غار ہے اور یہ ساری چیزیں، یعنی اندھا دھند طریقے سے اس ملک کو لوٹا جا رہا ہے میں کہاں تک آپ کے سامنے مثالیں پیش کروں۔ پاکستان آئل فیلڈ نے ۶۰ فیصد دونوں سالوں میں دیا ہے۔ پاکستان آکسیجن نے ۲۲٫۵ فیصد دیا ہے۔ پاکستان ٹوبیکو کمپنی نے ۴۹ فیصد ڈیویڈنٹ دیا ہے ذرا ملاحظہ فرمائیے پاکستان ٹوبیکو کمپنی جناب ان کا آج ۱۸ کروڑ بیس لاکھ کا پیڈاپ کیپٹل (سرمایہ) بن چکا ہے۔ شروع میں ان کی کل سرمایہ کاری ایک کروڑ کچھ لاکھ کی تھی اب یہ سرمایہ ۱۸ کروڑ تک جو جا پہنچا ہے تو وہ یہیں کے کمائے ہوئے منافع سے ہوا ہے۔ آپ نے میں نے سگریٹ پی تو یہ ۱۸ کروڑ تک پہنچ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب اگر یہ منافع کا اعلان کرتے ہیں یا ڈیویڈنٹ دیتے ہیں یعنی ایک کروڑ پر دس فیصد ڈیویڈنٹ دیں اور اٹھارہ کروڑ پر دس فیصد ڈیویڈنٹ دیں تو آپ خود اندازہ لگا لیجیے کہ کتنا بڑا فرق ہے۔ سرمایہ تھوڑا سا لے کر آئے تھے لیکن یہ کیا تماشہ ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کے یہ کیا ثمرات ہیں کہ ایک کروڑ کا سرمایہ لے کر جاؤ اور پاکستان جیسی سرزمین پر ۱۸ کروڑ بن جائے اور اگر ڈیویڈنٹ کا فیصد کم بھی ہو جائے تو جو رقم پہلے لیکر جاتے تھے اس سے زیادہ لیکر جائیں اور اب اس سال میری اطلاعات ہیں کہ انہوں نے نوٹس لگایا ہے کہ تین سو افراد ہمارے پاس فاضل ہیں اور انہوں نے کمال مہربانی کا مظاہرہ کیا کہ کہا کہ اگر تین سو والنیٹر مل جائیں گے خود ملازمت چھوڑنے کے لئے تو ٹھیک ہے اور اگر نہیں ملے تو جس کی مدت ملازمت سب سے کم ہے اسے ہم جبری طور پر نکال دیں گے

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ ایک ایسی جگہ ایسے ملک میں جہاں مزدور افراط میں ہیں۔ جہاں بیروزگاری کا گراف آسمان سے باتیں کر رہا ہے اور اندیشہ ہے کہ جب بیرونی ممالک کے اندر ملازم ہمارے لوگ واپس آئیں گے تو

جو صورتحال یہاں کی ہوگی وہ بڑی ہی اندوہناک ہوگی۔ آج بھی صبح کے وقت کراچی کے
صنعتی علاقہ کے کسی بھی کارخانے پر چلے جائیں آپ کو سینکڑوں افراد گیٹ پر کھڑے
نظر آئیں گے جو ایک دن کی ملازمت کے لئے بھی راضی ہیں کہ ڈیلی ریٹ پر ہی ہمیں
ملازم رکھ لیں ایسے ملک میں آپ ذرا سوچئے کہ کیا خود کار صنعتی نظام Automization
ہمارے ملک کے مفاد میں ہے یا خود سرمایہ داروں کے مفاد میں ہے۔ جتنی بھی
غیر ملکی کمپنیاں ہیں سب کی سب آج ہمارے ملک میں خود کار نظام کی طرف پیشقدمی
کر رہی ہیں یعنی کارخانے میں ایک چھوٹے سے حصے کو ایک مشین سے لیس کر دیا اور
گیارہ آدمی بیروزگار کر دیئے وہ بیچارے سڑک پر آ گئے وہ لوگ جو سگریٹ کی پیکنگ
کرتے تھے ایک پٹے کے گرد گیارہ گیارہ آدمی دونوں طرف بیٹھتے تھے ایک خود کار
پیکنگ مشین وہ لے آئے ہیں اور اب ان تمام افراد کا کام تنہا وہ مشین کرے گی
تو وہ بائیس افراد جو بیروزگار ہو رہے ہیں ان کی بیروزگاری کا ذمہ دار کون
ہے۔ کیا حکومت کی اجازت کے بغیر یہ سب کچھ ہو سکتا ہے یعنی Automization
کے ذریعہ ہمارے لوگوں کو بیروزگار کیا جائے اور ہماری حکومت ان کا شکریہ ادا کرے
کہ جناب آپ ہمیں تعلیم دے رہے ہیں آخر کونسی ٹیکنالوجی یا تعلیم ہے یہ ہرگز تعلیم
نہیں ہے آپ کے لوگوں کو معاشی پھانسی پر لٹکایا جا رہا ہے اور آپ خوش ہو رہے
ہیں بغلیں بجا رہے ہیں کہ خود کار نظام آ رہا ہے۔ نئی ٹیکنالوجی آ رہی ہے یہ نظام
تو وہاں کے لئے سود مند ہے جہاں افرادی قوت کی کمی ہے جہاں ملازمتیں موجود
ہیں اور لوگ موجود نہیں لیکن ہمارے ملک میں یہ غیر موزوں ہیں۔

اب ICI کا حال دیکھ لیں۔ انہوں نے حکومت پاکستان سے کہا کہ آج تک
کسی بھی غیر ملکی سرمایہ کار نے اتنی بڑی سرمایہ کاری نہیں کی ہے جتنے پیسے ہم لگانے کے لئے
تیار ہیں۔ ہم بڑے خوش ہوئے۔ بھکاری تو ہم ہیں سند یافتہ بھکاری ہیں ۱۹۴۷ء سے
اب تک اسی پر ہماری گزر اوقات ہے اس لئے ہم بڑے خوش ہوئے اور ہم نے کہا کہ ہم

آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں جی تشریف لایئے ایک پلانٹ انہوں نے لگایا بیس کروڑ روپے کا اور پنجاب میں پلانٹ لگایا ان کی شرط یہ تھی کہ آپ ہمیں تمام ٹیکسوں سے بری الذمہ کر دیں تو ہم فقیر لوگ بہت جلدی ہر قسم کی مراعات دینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ امریکی امداد جب آتی تھی تو ہاتھ سے ہاتھ تو ملے ہوئے ضرور ہوتے تھے لیکن شرطوں کا علم آپ کو نہیں ہوتا تھا۔ خالی آپ ملے ہوئے ہاتھ کو دیکھتے تھے گیہوں کھاتے تھے اور خوش ہوتے تھے لیکن ان شرطوں کو آپ کبھی نہیں دیکھتے تھے شرط ان کی یہ ہوتی تھی کہ ہمارے جہاز کے ذریعہ یہ سامان جائے گا ہماری کمپنی اس گندم کا بیمہ کرے گی۔ ہمارے ماہرین آکر تمہارے گوداموں کا معائنہ کریں گے اور تمہیں بتائیں گے کہ ہمارے گیہوں یہاں محفوظ رہ سکتے ہیں یا نہیں شرط یہ ہوتی تھی کہ ہمارے ماہرین آکر جائزہ لیں گے کہ اس گیہوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے کونسے ذرائع آپ استعمال کرتے ہیں۔ اور وہ چیز جو کبھی بھیک اور کبھی مدد کے نام پر ملتی تھی اس کی جو قیمت ہم ادا کرتے تھے اگر ہم نقد پیسے دے کر خریدتے تو اس سے کہیں کم قیمت پر ہم اسے خرید سکتے تھے تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ICI نے حکومت سے کہا کہ ہمیں ٹیکسوں میں معافی دیں ہم سرمایہ کاری کریں گے اور حکومت نے معاف کر دیا ہو سکتا ہے یہ سوچ کر معاف کیا ہو کہ اسی پلانٹ کے لئے معاف کر رہے ہیں لیکن اگر امپیریل کیمیکل کمپنی کو ٹیکس میں چھوٹ مل جائے تو اس کا وہ کارخانہ جو کراچی میں ہے اس کا وہ ادارہ جو کوٹ لکھپت لاہور میں ہے اور اس کے ذیلی ادارے جو مختلف مقامات پر کام کر رہے ہیں سب کو چھوٹ مل جائے گی۔ میں اس بات پر بہت پریشان رہا کہ ایک سال دو کروڑ روپے کا نفع ہے دوسرے سال ۱۷ کروڑ روپے کا نفع ہے یہ اس کمپنی نے کیا کاروبار کیا کہ نفع دو کروڑ سے ایک دم سترہ کروڑ تک پہنچ گیا

مگر جب میں نے پوری بیلنس شیٹ غور سے پڑھی تو پتہ لگا کہ جناب وہاں تو سب کی چھٹی ہو گئی ان کے تو جو دوسرے کارخانے ٹیکس ادا کر رہے تھے اب وہ بھی ٹیکس نہیں

دئے رہے ہے۔ یعنی بیس کروڑ کی سرمایہ کاری جس میں کہ اصل سرمایہ کاری نصف سے بھی کم ہوتی ہے کی اور ۷ اکروڑ روپیہ کا منافع حاصل کر لیا۔ کیا معجزے واقع ہو رہے ہیں ہمارے ملک میں۔ اس سرمایہ دارانہ نظام میں اتنے زبردست کاروبار ہمارے ملک میں ہو رہے ہیں جو دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک میں کوئی تصور نہیں کر سکتا۔ اسپنسر والے بھی دوائیں بیچتے ہیں دو سال کے اندر ۵۶ فیصد انہوں نے کمایا۔ گیمن والوں نے ۵،۷۴ فیصد اور فلپس الیکٹریکل کمپنی نے ۵۳ فیصد منافع کما لیا۔

معاشیات اتنا اہم شعبہ ہے کہ اس پر جس کا قبضہ ہوگا ہر شے پر اسی کا قبضہ ہوگا خواہ اندرونی شعبہ ہو، بیرونی شعبہ ہو، ایکسپورٹ کا معاملہ ہو، امپورٹ کا معاملہ ہو کس سے دوستی رکھنا ہے کس سے دشمنی رکھنا ہے اس مالیات کے شعبہ پر جس کا قبضہ ہوتا ہے ملک کے تمام شعبوں پر حقیقت میں اسی کا قبضہ ہوتا ہے۔ آزادی ہم نے حاصل کی مگر آزادی جن انگریزوں نے ہمیں دی تھی انہوں نے آزادی دینے سے پہلے اس بات کا مکمل انتظام کیا تھا کہ آپ آزادی کی نعمتوں سے محروم رہیں اور وہ انتظام انہوں نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ کیا تھا، اپنے آدمیوں کے ذریعہ کیا تھا ان کے ذریعہ کیا تھا جن کی وجہ سے انہوں نے اس ملک پر قبضہ حاصل کیا تھا، جاگیرداروں کی وجہ سے، ان بڑے لوگوں کی وجہ سے، ان قبائلی سرداروں کی وجہ سے، ان علماء سو کی وجہ سے اور ان پیروں کی وجہ سے انہوں نے اپنا اقتدار اس ملک میں قائم کیا تھا جاتے وقت وہ اقتدار انہیں منتقل کر گئے اور اس امید اور سکون کے ساتھ گئے تھے کہ ظاہری طور پر ہم یہاں سے جا رہے ہیں لیکن باطنی طور پر اور حقیقت میں ہم اس ملک پر حکمرانی کریں گے اور آپ یقین کیجئے آج تک ہمارا ملک آزاد نہیں ہو سکا ہماری کوئی پالیسی آزاد نہیں ہے۔ ہم اپنی مرضی اور منشا کے مطابق اپنے راستوں کا تعین نہیں کر سکتے ہیں۔ آج بھی جو کچھ ہمیں باہر سے حکم ملتا ہے اسی حکم کی ہم فرمانبرداری

کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان سب غیر ملکی ماہرین نے ٹریڈ یونین کو کمزور کرنے کے لئے، خراب کرنے کے لئے، ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے لئے، فعال انجمنوں کو بننے سے روکنے کے لئے جب مختلف اقدامات کئے، تعلیم کے نام پر پیسہ دیا۔ باہر کے ملکوں کے دوروں کے نام پر لوگوں کو بیجا کرگندہ کیا، یہاں ملک کے اندر منفعت بخش عہدے دئے کہ ان کے ذاتی مفاد کو ہوا دی گئی کہ اگر وہ سرکار کے وفادار رہیں گے تو ان کی ملازمت محفوظ رہے گی اور اگر وہ کارکنوں سے وفادار رہیں گے تو اسی طرح پیدل گھومتے رہیں گے۔

پاکستانی سرمایہ اور اس کا منافع

اب ذرا کچھ پاکستانی سرمایہ داروں کی بات ہو جائے وزیر علی انڈسٹریز بڑے نیک نام لوگ ہیں کہا جاتا ہے کہ جب حکومت پاکستان کے پاس ملازمین کو تنخواہیں دینے کے لئے پیسے نہیں تھے تو انہوں نے قرض فراہم کیا تھا۔ انہوں نے ۱۹۸۳ء میں ۵۵ فیصد اور پھر ۸۴ء میں ۵۵ فیصد ڈیونڈنٹ اور بونس شیئرز دیئے یعنی دو سال کے عرصہ میں ۱۱۰ فیصد ڈیونڈنٹ دیدیا ہے۔ کوئی پاکستان میں مائی کا لال اتنی زبردست کمائی کرنے والا ہے کہ دو سال میں جائداد ہماری کارخانہ ہمارا، خام مال پتہ نہیں کتنا ہوگا۔ خالی خالی ڈیوڈنٹ اور بونس شیئرز دو سال کے اندر اندر پورے ۱۱۰ فیصد اب کاکاخیل انڈسٹری کو لیجئے یہ گھی بناتے ہیں جناب بھٹو صاحب کے زمانے میں جب یہ صنعتیں قومیائی گئیں تو انہوں نے کہا تھا کہ ہم یہ ادارے عوام کے نام پہلے رہے ہیں اس لئے لے رہے ہیں کہ سرمایہ دار بار بار قیمتوں میں اضافہ کر رہے ہیں اور گھی ایک ایسی ضرورت کی چیز ہے جو ہر شخص کو چاہیئے لہٰذا اس کی قیمت پر کنٹرول کرنے کے لئے ہم نے گھی کے تمام کارخانے قومیا لئے تاکہ لوگوں کو سستے داموں گھی مل سکے۔ یہ کاکاخیل انڈسٹری گھی کی صنعت اور آپ دیکھیئے کہ سستے داموں گھی پہنچانے والوں نے دو سال کے اندر ۹۵ فیصد ڈیوڈنٹ اور

بونس شیئرز دیئے تو اگر عوام کو یہ گھی مہنگے داموں نہیں دیا گیا تو اتنا منافع انہوں نے
کہاں سے حاصل کیا اور اگر یہ نفع نہ ہوتا تو وہ کس طرح ۹۵ فیصد ڈیویڈنٹ اور
بونس شیئرز دیتے بھلا۔ ایسوسی ایٹیڈ انڈسٹری نے ۸۵ فیصد، شاہ تاج شوگر ۸۰ فیصد
بھر انڈسٹریل کارپوریشن ۹۰ فیصد، سورج گھی ۷۰ فیصد، فتح ٹیکسٹائل ملز ۸۰ فیصد
نیشنل اسمبلی کے امیدوار تھے حیدر آباد سے بہت پیسے خرچ کئے یہ پیسے سب ظاہر
ہے۔ ہم آپ سے ہی وصول کئے تھے اب ان کی مل کی مصنوعات اور کپڑے خریدیں
تو دو روپے کی لاگت آئی تو پانچ روپے میں بیچیں گے۔ جب ہر گز پر تین روپے
کمائے گا تو الیکشن میں بے چارہ آپ کی خاطر و مدارات تو کرے گا نہ اگر ۴۰ فیصد
سالانہ کی اوسط سے ڈیویڈنٹ لینے کے بعد کہتے ہیں جناب کہ یہ ٹیکسٹائل کی صنعت تو
تباہ ہو گئی اس ملک کے اندر ٹیکسٹائل میں زبردست نقصان ہو رہا ہے لیکن اس منافع
کو دیکھیں کہ دو سال کے اندر ۸۰ فیصد انہوں نے ڈیویڈنٹ دیا۔ پریمیئر شوگر نے
۶۵ فیصد، لپٹن پراپلین نے ۹۵ فیصد، پیکیجز لمیٹڈ یہ بھی جی سید صاحبان کا ادارہ
ہے وزیر علی والوں کا انہوں نے ۶۵ فیصد ڈیویڈنٹ دیا۔ سروس انڈسٹری جناب
بچوں کے جوتے بناتے ہیں۔ عید پر یہاں بچوں سب کو خوش کر دیتے ہیں لیکن جوتوں پر
جو نفع وصول کر رہے ہیں دو سالوں میں ۶۲٫۵ فیصد ڈیویڈنٹ دیا۔ باوانی شوگر
۷۰ فیصد، برشین پاکستان لمیٹڈ خواتین ان سے زیادہ واقف ہیں اس لئے کہ جن گھروں
میں گیس نہیں وہاں یہ گیس سلنڈر فراہم کرتے ہیں ان کی کمائی دیکھئے یہ کچھ تیار نہیں کرتے
صرف پیکنگ کرتے ہیں انہوں نے دو سال کے اندر ۶۰ فیصد ڈیویڈنٹ دیا ہارون آئلز
۵۵ فیصد کریسنٹ شوگر ملز ۵۵ فیصد سدرن گیس جناب سرکاری گیس کمپنی ہے
۸۹ فیصد پھر اس تمام کارگزاری کا مظاہرہ کرنے والوں کے بڑے بڑے فوٹو چھپتے ہیں
یہ نہیں کہ ان کے فوٹو نہیں چھپتے ایک اور صاحب ہیں وہ بڑے اسلام کے شیدائی زبردست
اور پاکستان کے بہت وفادار اور ہمارے لیبر سیکرٹری بھی رہ چکے ہیں بڑے دانشور شاعر

اور اعجیب ہیں پورے کا پورا خاندان جناب پڑھنے لکھنے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کا سب یہ تجویز ہیں ہنسے آپ کو اسپینسر والوں کا بتایا تھا کہ دو سال میں انہوں نے ۶۵ فیصد ڈیویڈنڈ اور بونس شیئرز دیئے تو یہ سرکاری درباری صاحب بمعہ اپنی جناح کیپ کے ان ہی اسپینسر والوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ سارے معتبر ہیں جو آپ کو نظر آئیں گے ان کے لئے یہ تاثر دیا جاتا ہے اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ عامہ کے ذریعہ کہ یہ بہت بڑے قوم پرست اور ملک سے محبت کرنے والے ہیں۔

مہنگائی الاؤنس

ذرا اس آرڈی ننس کی صورتحال دیکھئے گا۔ یہ ایمپلائز کاسٹ آف لِونگ کا آرڈی ننس جسے آپ مہنگائی الاؤنس کا آرڈیننس بھی کہہ سکتے ہیں۔ بھٹو صاحب مرحوم نے یکم اگست ۱۹۷۳ء کو پہلی دفعہ یہ آرڈیننس نافذ کیا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ چونکہ ہمارے ملک میں بھاری اکثریت انجمن سازی اور یونین سازی کے حق سے محروم ہے وہ لوگ جو کسی قسم کی اجتماعی سوداکاری نہیں کر سکتے جو اپنے حالات کو بہتر نہیں بنا سکتے گرانی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی اس لئے گرانی میں مدد دینے کی غرض سے یہ قانون لایا گیا اور یہ پہلا قانون یکم اگست ۱۹۷۳ء کو نافذ ہوا جس کے مطابق سات سو روپے تک تنخواہ پانے والے تمام کارکنوں کو ۳۵ روپے ماہانہ گرانی الاؤنس کے طور پر مالکان سے دلوایا گیا۔ اس کے دس مہینے کے بعد ۸ رجون ۷۴ء کو اس میں مزید تبدیلی کی گئی اور یہ کہا گیا کہ تمام لوگوں کو جو ایک ہزار روپے تک تنخواہ پاتے ہیں انہیں آپ دس فیصد اور کم سے کم پچاس روپے تمام کارکنوں کو ادا کریں اس طرح بیس مہینے کے اندر گرانی کا مقابلہ کرنے کے لئے ۳۵ روپے اور پچاس روپے کارکنوں کو دلائے گئے پھر دس مہینے کے بعد یکم اپریل ۱۹۷۵ء کو پندرہ سو روپے تک تنخواہ پانے والوں کو پچیس روپے کا مزید اضافی الاؤنس دلوایا گیا اس طرح بیس مہینے کے عرصہ میں کارکنوں کو ۳۵، ۵۰ اور پچیس روپے دلوائے گئے اس کے بعد ملک میں اسلام کا انقلاب آ گیا جنرل صاحب حکمران بن گئے جن کی سوچ فلاحی تھی اور اسلام سے بڑھ کر کوئی فلاحی مذہب دنیا

میں موجود نہیں اور جہاں بالکل برابری اور مساوات ہے جہاں چھوٹے بڑے کا کوئی فرق نہیں ہے سب کے ساتھ یکساں سلوک ہوتا ہے اور جہاں سرمایہ دار کوئی بن ہی نہیں سکتا۔ یہ ہمارے دوستوں نے ہمیں بتایا کہ اسلام میں ایسا معاشی نظام ہے جس میں لوگوں کے مسلمان بنتے ہی سرمایہ داری ختم ہو جائے گی کیونکہ ان پر جزیہ ہے، مختلف ٹیکس ہیں اور پیسہ سرمایہ دار رکھ نہیں سکتے وہ اسے دوسروں کو پہنچائیں گے وغیرہ وغیرہ تو جنرل صاحب تشریف لائے اب تک جو رقم کارکنوں کو ملی تھی اس کے بارے یہ کہہ دیا گیا تھا کہ یہ کارکنوں کی تنخواہ کا حصہ تصور کی جائے گی اور کارکن اس پر پنشن، پراویڈنٹ فنڈ اور تمام دوسری مراعات کے حقدار ہوں گے جنرل صاحب کی تشریف آوری کے بعد سب سے پہلے یکم جولائی ۱۹۸۰ء کو چالیس روپے بغیر کسی فرق کے سب کو دیئے گئے لیکن یہ کہا گیا کہ یہ چالیس روپے تنخواہ کا حصہ نہیں ہیں۔ نہ اس پر پراویڈنٹ فنڈ کٹے گا نہ گریجویٹی ملے گی نہ اوور ٹائم کے حساب میں شامل ہوگا اور نہ ہی کوئی اور مراعات حاصل ہوں گی۔ یہ ایک طرح کی ٹپ تھی، بخشش تھی جو جنرل صاحب نے کارکنوں کو دی کیونکہ ایسا صرف ہوٹل میں کام کرنے والے ملازمین کے ساتھ ہی ہوتا ہے کہ "ٹپ" جو ان کو ملتی ہے اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ہوتا۔ سو ٹپ کی شکل میں جنرل صاحب نے کارکنوں کو چالیس روپے کا عطیہ دیا۔ یہ چالیس روپے بھی کارکنوں کو باسٹھ مہینے کا وقت گزرنے کے بعد ملے میں نے پہلے آپ کو بتایا کہ بیس مہینے کے عرصہ میں ۳۵ روپے ۵۰ روپے اور پچیس روپے دیئے گئے اور اس کے بعد ۶۲ مہینوں کی لمبی مدت کے بعد جنرل صاحب نے چالیس روپے کارکنوں کو دیئے اس کے بارہ مہینوں کے بعد مزید چالیس روپے دیئے اور اس کے بعد اسمبلی میں بل آیا اور یہ بات یاد رہے کہ آخر کے جو چالیس چالیس روپے جنرل صاحب نے دیئے وہ محض ٹپ کے طور پر دیئے۔ یکم جولائی کو جو آرڈیننس آیا اور قومی اسمبلی اور سینیٹ دونوں میں منظور ہوا وہ آرڈیننس

یہ ہے کہ تمام کارکنوں کو تیرہ اعشاریہ پانچ فیصد تنخواہوں میں اضافہ دیا جائے کہتے ہیں کہ استحقاق مجروح ہوجاتا ہے معزز اراکین کا اگر کوئی غلط بیانی کرے لیکن آج کے اسمبلی کے ممبران کا استحقاق مجروح ہوتا ہے اس بات پر کہ فلاں کو دو کاریں دی گئیں مجھے کیوں ایک کار دی گئی۔ لہذا اسمبلی میں سوال ہوتے ہیں استحقاق کا تذکرہ میں اس لئے کر رہا ہوں کہ بجٹ پیش کرتے وقت سابق وزیر خزانہ نے بتایا تھا کہ پچھلے دو سال سے سرکاری ملازمین کو مہنگائی میں کسی قسم کی رعایت یا اضافی رقم نہیں دی گئی ہے اور اس عرصہ میں مہنگائی میں سترہ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ سرکاری ملازمین کا اس تنخواہ میں گزارا کرنا بڑا مشکل ہے لہذا گورنمنٹ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان تمام سرکاری ملازمین کو جن کی تنخواہیں پندرہ سو روپے تک ہیں انہیں تیرہ اعشاریہ پانچ فیصد اور پندرہ سو روپے سے زائد تنخواہ پانے والوں کو بھی تنخواہ میں دس فیصد اضافہ دیا جائے اور پہلی مرتبہ حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ تمام سرکاری ملازمین کی تنخواہوں کو گرانی کے اعشاریہ کے ساتھ منسلک کر دیا جائے یعنی گرانی بڑھے گی تو تنخواہ آپ سے آپ بڑھ جائے گی اور یہ بھی کہا کہ کارکنوں کی حالت پر غور کرنے کے بعد حکومت نے فراخدلانہ فیصلہ کیا ہے لیکن یہ سب کچھ سرکاری ملازموں کے بارے میں تھا۔ سابق وزیر موصوف کو یہ تو یاد آ گیا کہ سرکاری ملازمین کو دو سال سے کچھ نہیں ملا لیکن وہ یہ بھول گئے کہ پرائیویٹ صنعتوں اور اداروں کے ملازمین کو ۴۸ مہینے گزر چکے تھے اور انہیں کسی قسم کا اضافہ نہیں ملا تھا ان کی تنخواہوں میں آخری اضافہ یکم جولائی ۱۹۸۱ء کو ہوا تھا۔ یعنی ۴۸ مہینے گزرنے کے بعد سابق وزیر خزانہ فرماتے ہیں کہ یہی تمام مراعات جو ہم دو سال گزارنے کے بعد سرکاری ملازمین کو دے رہے ہیں ۴۸ مہینے گزرنے کے بعد نجی اداروں اور صنعتوں میں کام کرنے والے ملازمین کو بھی دے رہے ہیں لیکن جب آرڈیننس آیا تو گرانی کے ساتھ ساتھ تنخواہوں میں اضافہ کا معاملہ نجی صنعتوں اور اداروں

کے کارکنوں کے لئے تو خیر بالکل ہی گول کر دیا گیا اور پندرہ سو روپے سے زائد
تنخواہ پانے والوں کو ایک پیسے کا بھی اضافہ نہیں دیا گیا اور پندرہ سو روپے تک
پانے والوں کو تیرہ اعشاریہ پانچ فیصد دیا گیا جس میں کم سے کم رقم مقرر نہیں کی گئی
اور آپ میں سے چند افراد کو یہ سن کر تعجب ہوگا کیونکہ بیشتر تو اس کو بھگت رہے ہیں کہ آج
بھی سندھ کی حکومت نے جو دسمبر ۱۹۸۳ء میں کم سے کم اجرت مقرر کی تھی وہ
چار سو اسی روپے تھی وہ بھی کراچی جیسے بڑے شہر اور سندھ جیسے صوبے کے لئے
جہاں گرانی بڑے شباب پر ہے کیا آپ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ کوئی فرد ۴۸۰ روپے میں
اپنے چار پانچ بچوں کو پال سکتا ہے، کپڑے پہنا سکتا ہے، تعلیم دلا سکتا ہے اور آپ
تمام حضرات واقف ہیں کہ غریبوں کے خاندان کا تصور اور نظریہ بڑے لوگوں کے
خاندانی ڈھانچہ سے تھوڑا مختلف ہے۔ غریب افراد کے خاندان کی ممبر تو وہ بیوہ عورت
بھی بن جاتی ہے جو اس کے ماموں کی بیٹی ہے اسے اور اس کے بچوں کو پالنا غریب
اپنی ذمہ داری اور فرض سمجھتا ہے اور اپنے بچوں اور بہن کے بچوں دونوں کو فاقے کراتا
ہے لیکن انہیں گھر سے نہیں نکالتا انہیں سڑک پر بھٹکنے کے لئے چھوڑنے کو تیار نہیں
ان تمام باتوں کے باوجود دسمبر ۱۹۸۳ء میں مقرر کردہ کم سے کم اجرت ۴۸۰ روپے ہے
اس میں آج تک کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوا اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس ۴۸۰ روپے
میں بھی بنیادی تنخواہ محض ۱۴۰ روپے ہے آج کے زمانے جنوری ۱۹۸۶ میں ایک کارکن
کی کم سے کم بنیادی تنخواہ ۱۴۰ روپے محض ہے تو گورنمنٹ نے یہ جو اضافہ کیا ہے
وہ بنیادی تنخواہ پر کیا ہے۔ ایک شخص کی تنخواہ اگر ایک ہزار روپے ہے تو گرانی ایک
ہزار پر بڑھی ہے لیکن اضافہ اسے بنیادی تنخواہ پر ملے گا۔ یعنی اگر اس کی بنیادی
تنخواہ ۲۰۰ روپے ہے تو اس کی مجموعی تنخواہ ایک ہزار ہونے کے باوجود اضافہ اسے
صرف ۲۰۰ پر ملے گا۔ لیکن ابلاغ عامہ کے ذریعہ تشہیر اتنی زبردست ہے کہ چھوٹے چھوٹے
دکاندار جنہیں حقیقت کا علم نہیں اور جو ہمارے دوست بن سکتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں

کہ جی تنخواہ ۱۲۶۵ فیصد بڑھ گئی اور ان کے خیال سے یہ ۱۲۶۵ فیصد ہزار روپے پہ بڑھی ہوگی نہ کہ محض ۲۰۰ روپے پہ

محنت کشوں کے بچوں کی تعلیم

ایک تعلیمی اسکیم ہے جس میں ہر آجر کو حکومت کے فنڈ میں کارکنوں کے فی بچہ ایک سو روپے کے حساب سے دینا ہوتے ہیں۔ اس قانون کا مطلب یہ تھا کہ یونیفارم ٹرانسپورٹ اور کتابوں اور اسٹیشنری کے پیسے وہ دے، فیس وہ ادا کرے قانون میں یہ لکھا تھا کہ اگر کوئی کارکن کسی انڈسٹری میں کام کرتا ہے تو اس کے ایک بچے کی تعلیم کی تمام تر ذمہ داری مالک کی ہے۔ اس کی بڑی زبردست تشہیر کی گئی ہمارے کئی بڑے صحافی حضرات بھی اس مباحثے میں شرکت کے لئے آئے تھے پیپلز پارٹی کے دور میں بڑی تعریفیں ہوئیں کہ جی بڑا انقلابی قدم ہے اب کوئی مزدور ایسا نہیں ہوگا جس کا کم از کم ایک بچہ میٹرک پاس نہ ہو ڈیڑھ سال کے بعد بڑی خاموشی کے ساتھ اس قانون میں ترمیم کر دی گئی نہ کوئی پریس کانفرنس ہوئی نہ پبلسٹی اور نہ ہی اس ترمیم یا تبدیلی کا جواز پیش کیا گیا اور یہ کہا گیا کہ ہر مالک ہر کارکن کے پیچھے ایک سو روپے محکمۂ انکم ٹیکس کو دے گا۔ اور کارکن کو کسی اور ایجنسی کے ذریعہ تعلیمی اخراجات کی ادائیگی کر دی جائے گی۔ اس پیسے کا تفصیلی حال دیکھئے ۷۳-۱۹۷۲ء میں ایک کروڑ پچیس لاکھ جمع ہوا۔ ایک پیسہ کسی کو نہیں دیا گیا یہ میں آپ کو سرکاری اعداد و شمار بتا رہا ہوں یہ میں نے مختلف سرکاری کتابوں سے حاصل کئے ہیں سب کے سب مستند ہیں ۷۴-۱۹۷۳ء میں تین کروڑ آٹھ لاکھ سندھ میں جمع ہوئے ایک پیسہ کسی کو نہیں دیا ۷۵-۱۹۷۴ء میں تین کروڑ ۲۶ لاکھ دس ہزار جمع ہوئے ایک دھیلا کسی کو نہیں دیا ۷۶-۱۹۷۵ء میں تین کروڑ ۳۷ لاکھ جمع ہوئے ایک دھیلا نہیں دیا اور یہ دس کروڑ ۹ لاکھ سندھ کی حکومت کے پاس جمع ہیں کارکنوں کے

نام پر کارکنوں کی فلاح و بہبود کے لئے مالکان سے لے لیا ہے یہ فلاحی کام ہے جو ریاستی مشینری کے ذریعہ ہو رہا ہے دنیا میں کوئی بھی پڑھے گا تو جناب قانون تو پاکستان میں موجود ہے کہ ہر کارکن کے ایک بچے کی میٹرک تک تعلیم یہاں پر گورنمنٹ نے مالک کے ذمہ کر دی ہے اور یہ پیسے سرکار لے رہی ہے ۷۷-۷۶ ۱۹ء میں تین کروڑ انسٹھ لاکھ نوے ہزار روپے جمع ہوئے اور کل رقم ۱۴ کروڑ ۵۷ لاکھ ۱۰ ہزار روپے ہو گئی ایک پیسے کی ادائیگی کسی کو نہیں کی گئی ہاں ذرا اب دینا شروع کیا ہے ۷۸-۷۷ میں مزید ۳ کروڑ ۳۶ لاکھ ۷۰ ہزار روپے وصول ہوئے اور صرف ۶ لاکھ روپے تقسیم کئے اب بقایا ۱۷ کروڑ ۸۰ لاکھ رہ گئے ۷۹-۷۸ میں تین کروڑ چار لاکھ روپے وصول کئے اور ۱۰ لاکھ ۵۴ ہزار دیئے ۲۰ کروڑ ۸۲ لاکھ کی رقم حکومت سندھ کے پاس رہ گئی ۸۰-۷۹ میں تین کروڑ ۶ لاکھ وصول کئے اور ۹ لاکھ پچاس ہزار کی ادائیگی کی ۲۳ کروڑ اناسی لاکھ پچپن ہزار کی کارکنوں کی رقم حکومت سندھ کے پاس اس میں بقایا رہی ۸۲-۸۱ میں ۲ کروڑ ترانوے لاکھ ۸۷ ہزار وصولے ۱۰ لاکھ تقسیم کئے اور بقایا ۲۶ کروڑ ۶۳ لاکھ ۲۴ ہزار رہ گئے ۸۳-۸۲ میں ۲ کروڑ ۳۲ لاکھ وصولے اور ۹ لاکھ ۷۰ ہزار کی ادائیگی کی ۲۸ کروڑ ۸۶ لاکھ کی رقم بقایا رہ گئی اور ۸۴-۸۳ اور اس کے بعد کے اعداد و شمار موجود نہیں بہرحال ۸۴-۸۳ کے کراچی کی حد تک کے اعداد و شمار موجود ہیں پورے سندھ کے نہیں ہیں اس کے مطابق حکومت کے پاس ۳۲ کروڑ ۴۲ لاکھ ۸۶ ہزار ۶ سو ۷۵ روپے حکومت سندھ کے پاس قرض ہیں اب ذرا مرکزی حکومت کا کاروبار دیکھئے۔ مرکزی حکومت نے ایک قانون بنایا کہ کارکنوں کے فلاحی فنڈ کے لئے تمام آجر دیں یہ قانون ایوب خان صاحب کے زمانے میں بنا تھا اور ایوب خان مرحوم کے زمانے میں یہ پہلا موقع تھا کہ حکومت نے اس فنڈ میں دس کروڑ روپے دیئے تھے۔ اب

ہر مالک اپنے نفع کا ۵ فیصد اس فنڈ میں دے گا اور پھر ایک قانون آیا جس کے بعد کارکنوں کا پیسہ ادھر منتقل ہونے لگا۔ وہ بہت بڑی رقم ہے وہ میں آپ کو بتاؤں گا۔ دس کروڑ روپے ۶۸-۶۷ میں ایوب خان کی حکومت کی جانب سے دیئے گئے ایک کروڑ اس میں سے مشرقی پاکستان چلے گئے تو وہ وہیں پر رہ گئے ۹ کروڑ ہمارے پاس بچے اب ۷۳-۷۲ سے اس میں مزید فنڈ آنا شروع ہوا مالکان کی طرف سے ۵ لاکھ ۱۳ ہزار آئے اور کارکنوں کی طرف سے کوئی رقم نہیں آئی اگلے سال مالکان کی جانب سے ۲۹ لاکھ ۲۷ ہزار آئے کارکنوں کی طرف سے ۵۱ لاکھ ۳۷ ہزار روپے آئے یعنی جو مالک ہیں وہ دے رہے ہیں ۳۹ لاکھ اور جو مزدور ہیں ان کی جانب سے ۵۱ لاکھ ۷ ۳ ہزار۔ اگلے سال مالکان کی جانب سے ایک کروڑ ۴۴ لاکھ ۲۸ ہزار روپے آئے کارکنوں کی طرف سے ۲۳ لاکھ ۸۱ ہزار روپے آئے چوتھے سال مالکان کی رقم تھی ۹۲ لاکھ اور کارکنوں کی جانب سے دی جانے والی رقم ایک کروڑ ۹۸ لاکھ۔ پانچویں سال مالکان نے دیئے دو کروڑ ۵ ۴ لاکھ اور کارکنوں نے دو کروڑ ۵ ۷ لاکھ روپے کی رقم ادا کی پھر مالکان نے دیا ایک کروڑ ۸۱ لاکھ اور کارکنوں نے دیا ۴ کروڑ ۹۰ لاکھ۔ یہ کارکنوں کی فلاح و بہبود پر اکٹھا کی جانے والی رقم میں ۱۹ کروڑ کی ادائیگی تو مالکان نے کی اور ۳۹ کروڑ ۳۹ لاکھ ۶۷ ہزار ۷ سو ۱۷ روپے ورکرز پارٹیسیپیشن فنڈ کا اس رقم کے اندر منتقل ہوئے کل رقم ۶۸ کروڑ روپے ہو گئی جس کی کہ حکومت کے پاس کارکنوں اور مالکان نے سرمایہ کاری کی۔ اس پر بننے والی سود کی رقم ۱۳ کروڑ ۵۲ لاکھ روپے بنی تو ۸۱ کروڑ ۹۲ لاکھ ۱۲ ہزار چونسٹھ روپے ۸۳-۸۲ تک اس فنڈ میں حکومت پاکستان کے پاس جمع ہو چکے تھے جس میں سے آج کی تاریخ تک جو خرچہ مکانات بنانے پر کیا ہے وہ ۳۱ کروڑ ۱۴ لاکھ ۶۱ ہزار کہتے ہیں کہ ہم نے خرچ کیا اور اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تب بھی ۸۱ کروڑ ۹۲ لاکھ میں سے ۳۱ کروڑ ۶۱ لاکھ کے خرچ کے بعد

باقی کی ساری رقم مرکزی حکومت کے پاس ہے تو جناب یہ ہے صورتحال۔ یہ میں نے آپ کے سامنے وہ حقائق رکھے ہیں جنہیں گورنمنٹ کسی بھی فورم پر کسی بھی جگہ جھٹلا نہیں سکتی اس لئے کہ یہ تمام اعداد و شمار حکومتی کتابوں سے لئے گئے ہیں کہ کارکنوں کی فلاح و بہبود کے نام پر جو کاروبار حکومتی سطح پر ہو رہا ہے اس میں سے بھی خطیر رقم وہ رکھ لیتے ہیں

محنت کشوں کے لئے رہائشی سہولتیں اور مالکان

قائداعظم محمد علی جناح نے جب ولیکا ٹیکسٹائل ملز کا افتتاح کیا تو انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہمیں یقین ہے کہ آپ نے کارکنوں کے لئے رہائشی سہولت ضرور فراہم کی ہوگی۔ یہ قائداعظم کا فرمان ہے۔ جی ہاں بانئ پاکستان کا جن کے مقولے جہاں جہاں حکمران طبقے کو راس آتے ہیں بڑے خوبصورت طغروں میں بھرپور آرائشی سہولتوں کے ساتھ ان کی نمائش کی جاتی ہے ٹیلی ویژن پر ریڈیو پر اور دوسرے ذرائع سے ان کی تشہیر کی جاتی ہے اور ان چھوٹے چھوٹے مقولوں کو اپنے ذاتی اور حکومتی مقاصد کے لئے استعمال کر کے لوگوں کے ذہنوں کو مسموم کرتے ہیں لیکن ان کی وہ بات جو میں آپ کو سنا رہا ہوں یا اس جیسی دوسری باتیں کہیں دکھائی نہیں دیتیں اس کے بعد اس ملک کے تمام سرمایہ داروں نے اور خصوصاً سائٹ کے سرمایہ داروں نے کراچی کے ترقیاتی ادارے KDA اور سائٹ کے ادارے سے کہا کہ اب تو بابائے قوم حکم دے گئے ہیں کہ کارکنوں کو مکان فراہم کیا جائے اس لئے اس مقصد کے لئے زمین ہمیں آپ فراہم کریں اور آپ کو یقین آئے گا کہ بیشمار اداروں کو بہت بڑی بڑی زمینیں الاٹ کی گئیں کارکنوں کی رہائشی سوسائٹیوں کے لئے اور کالونیوں کے لئے اور آپ پورے سائٹ کے علاقہ میں تفصیل کے ساتھ گھوم پھیر لیجئے خود دیکھ لیجئے آپ کو نظر آجائے گا کہ کسی بھی جگہ جہاں زمین اس مقصد کے لئے الاٹ کی گئی تھی کہ کارکنوں کی رہائش کے لئے مکان بنوائے

جائیں وہ زمینیں مختلف منفعت بخش منصوبوں کی نذر کر دی گئیں اور مزدوروں کے لئے کوئی رہائشی گھر نہیں بنا آج صورتحال یہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی ملک میں آپ چلے جائیں آپ کو پہلے گھنٹے کی پیداوار سب سے زیادہ ملے گی آدمی تازہ دم کام پر آتا ہے اس کی جسمانی صلاحیتیں بھرپور انداز میں مصروف عمل ہوتی ہیں تو پہلے گھنٹے کی پیداوار سب سے زیادہ ہوتی ہے دوسرے گھنٹے کی اس سے تھوڑی کم اور اس طرح آخری گھنٹے کے پہنچنے تک پیداوار بتدریج کم ہوتی رہتی ہے کیونکہ آدمی تھکن کا شکار ہونے لگتا ہے اس کی طاقت کام کے وقت کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتی رہتی ہے لیکن اگر آپ اس سلسلے میں پاکستان کے اعداد و شمار دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے پاکستان میں آپ کو پہلے گھنٹے کی پیداوار سب سے کم ملے گی ذرا تجزیہ تو کریں کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ ایک شخص گھر سے تازہ تازہ آیا ہے تو پہلے گھنٹے میں اسے پیداوار سب سے زیادہ دینی چاہیئے وہ کم کیوں دے رہا ہے آپ پورے پاکستان کے صنعتی علاقوں میں چلے جائیں، چاہے سائٹ میں چلے جائیں چاہے لانڈھی کورنگی میں چلے جائیں چاہے فیصل آباد میں دیکھیں آپ کسی بھی ایسے صنعتی علاقے میں چلے جائیں جہاں کارکن کام کرتے ہیں آپ کو نظر آئے گا کہ پبلک ٹرانسپورٹ کا خاطر خواہ انتظام نہیں اور کارکن جانوروں کی طرح سے لد کر، لٹک کر چھتوں پر بیٹھ کر اپنی وہ توانائی جو رات بھر کی نیند کے بعد انہوں نے حاصل کی تھی وہ کارخانے کے گیٹ تک پہنچتے پہنچتے ضائع کر چکے ہوتے ہیں اور قدرتی طور پر پہلے گھنٹے کی پیداوار کم ہوتی ہے جو ۹۴ کروڑ روپے کارکنوں کی فلاح و بہبود کے نام پر حکومت کے پاس جمع ہیں کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ ان کے ذریعہ ایک ایسی کارپوریشن بنا دی جاتی جو کارکنوں کو گھر سے کارخانے اور کارخانے سے گھر تک فری آمد و رفت کے لئے ٹرانسپورٹ فراہم کرتی۔ بہت آسانی کے ساتھ یہ انتظام کیا جا سکتا تھا لیکن اگر وہ یہ انتظام کر لیتے تو پھر سرمایہ داری کا کوئی جواز نہیں ہوتا وہ تو جان بوجھ

کہ سرمایہ داری کے فروغ اور ٹریڈ یونین کو کمزور کرنے کی غرض سے کارکنوں کی پیداوار کم دکھتے ہیں۔

پاکستانی مزدوروں کا کوریا اور جاپان سے مقابلہ

ہمارے یہاں اکثر حکومت اس بات پر شاکی رہتی ہے کہ ہمارے یہاں کارکنوں میں وہ پیداواری صلاحیتیں نہیں جو جاپان اور کوریا کے صنعتی کارکنوں کے پاس ہیں یہ بات حقیقت پر مبنی نہیں جاپان کوریا اور تائیوان میں چوری کا کاروبار نہ ہونے کے برابر ہے لیکن ہمارے یہاں صنعتکار چوری کا اتنا شاندار مظاہرہ کرتے ہیں کہ داد دیتے ہی بنتی ہے یعنی اگر پیداوار پر حکومت ایکسائز ڈیوٹی یا کسی اور طرح کا محصول نافذ کرتی ہے تو آپ یقین کریں کہ کل پیداوار کا پچاس فیصد بھی کتابوں پر نہیں آتا۔ ہم نے اس وقت جب حکومت نے گھی کے کارخانوں کو قومی ملکیت میں لیا تھا تو اس وقت اعداد و شمار جمع کئے تھے اور ان کے مطابق جب وہ کارخانے نجی ملکیت میں تھے۔ مقبول آئل کمپنی، ای ایم آئی جس کی یونین کا میں صدر تھا، برما آئل اور دوسرے اداروں میں تو ان تمام کارخانوں کی چھپی ہوئی بیلنس شیٹ میں ایکسائز ڈیوٹی کی صورتحال کچھ یوں تھی کہ نجی ملکیت میں ایک ادارے نے ایکسائز ڈیوٹی کے دو لاکھ روپے ادا کئے لیکن جب وہی ادارہ قومی ملکیت میں آیا تو آپ یقین کریں گے کہ اس ادارے نے ایک کروڑ روپے ایکسائز ڈیوٹی ادا کی ایکسائز ڈیوٹی کی شرح میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی بقیہ تمام پیداواری حالات بھی تقریباً وہی تھے بات صرف اتنی تھی کہ وہ بقیہ پیداوار کو کتابوں میں درج نہیں کرتا تھا چوری سے مال فروخت کرتا تھا اور جب وہ پیداوار کتابوں پر آئی تو ایکسائز ڈیوٹی ایک کروڑ روپے دی گئی تو کارکنوں کی پیداواری صلاحیتوں کا جہاں تک تعلق ہے جب تک ایکسائز ڈیوٹی اور اس جیسے دوسرے عوامل موجود ہیں۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ ایک صاحب نے مجھے بتایا کہ ایک صابن کے

کارخانے میں پورے سال ایک صابن نہیں بنا۔ انہیں کہیں سے کچھ رسیدیں مل گئیں جن کے مطابق کچھ صابن فروخت ہوا تھا تو وہ رسیدیں لے کر میرے پاس آئے کہ ہماری ملز نے تو پورے سال کوئی صابن نہیں بنایا تو یہ صابن بنے بغیر فروخت کس طرح ہو گیا؟ میری تو عقل حیران ہے؟ جب کمپنی نے خرچ نہیں کیا تو اسے آمدنی کہاں سے ہو رہی ہے؟ میں نے اسے بتایا جناب لائسنس ملتا ہے مختلف خام مال کا، کیمیکل کا وہ صابن بنا کر اگر فروخت کریں تو منافع دس فیصد ہے اور اگر خام مال بیچ دیں تو نفع پچاس فیصد ہوتا ہے تو وہ احمق تو نہیں کہ صابن تیار کر کے دس فیصد یا زیادہ سے زیادہ بیس فیصد تک منافع کمائیں وہ تو خام مال کو، کیمیکل کو کالے بازار میں بیچیں گے اور کارخانے میں اس کی کھپت دکھائیں گے کیونکہ ان کی اصل آمدنی تو یہی ہے اور جب اس کی تفصیل میں گئے تو بات یہی تھی کہ تمام خام مال اور کیمیکل وصول کیا گیا اور کاغذوں پر ان کی کھپت دکھائی گئی صابن کی تیاری اور فروخت دکھائی گئی یہ اور بات کہ پورے سال صابن اس کارخانے میں نہیں بنا۔ ان تمام بے ایمانیوں کے باوجود اب تک حکومت نے جتنے اعداد و شمار جمع کئے ہیں اس نے ہر جگہ خود تسلیم کیا ہے کہ پیداوار اور پیداواری صلاحیتوں میں اضافہ ہوا ہے سرکاری سطح پر حکومت نے ۹ فیصد کے اضافہ کو تسلیم کیا ہے کہ ہماری مجموعی قومی پیدوار میں اضافہ کی شرح ۹ فیصد ہے اس اضافہ کے باوجود اب آپ ذرا تجزیہ کیجئے کہ ایک طرف کوریا جاپان اور تائیوان کا اور دوسری جانب پاکستان کے کارکنوں کی پیداواری صلاحیت کے فرق کے متعلق شکوہ اور شکایت میں کتنا بودا پن ہے۔

اور یہ کارہم نے کہہ پتی سنے ہے جناب ہمیں تو کوریا جاپان اور تائیوان سے مقابلہ کرنا ہے ہم آپ کو ہڑتال کا حق کس طرح دے سکتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ دیکھیں نا آخر جاپان میں ایک لڑکی گیارہ لومز چلاتی ہے اور یہاں پر تم صرف دو لومز فی کارکن چلاتے ہو

لڑکی کیا وہ لومز بلاشبہ چلاتی ہے لیکن اس کے جو پیداواری حالات ہیں جو خودکار نظام وہاں موجود ہے اسے جو اشیاء اور سہولتیں فراہم کی گئی ہیں کیا وہ پاکستان کے کسی بھی صنعتکار نے فراہم کی ہیں ایک دفعہ ایک سروے ہوا تھا اور ۳۵ سال کی عمر کے لومز ۶۷ فیصد کی تعداد میں پاکستان کی ملوں میں لگے ہوئے تھے عجب کہ دس سال کے بعد لومز کو اکھاڑ کر پھینک دینا چاہیئے اس لئے کہ جو لوگ بہت کم ڈیپری سی ایشن نکالتے ہیں وہ دس فیصد نکالتے ہیں اگر دس فیصد لوم کا ڈیپری سی ایشن ہے تو دس سال میں اس کی ۱۰۰ فیصد لاگت آپ نے خرچے کی شکل میں اس میں ڈالدی ہے جب آپ نے خرچ کے طور پر اسے نکال لیا تو آپ کو دس سال کے بعد نیا لوم وہاں لاکر لگانا چاہیئے تھا جو آج کے زمانے کے مطابق کام کرتا تب مناسب تھا کہ آپ کوریا، جاپان اور تائیوان کا موازانہ کرتے لیکن اگر ۶۷ فیصد ایسے لوم آپ کے یہاں لگے ہوئے ہیں جن کی عمر ۳۵ سال ہے یعنی اپنی عمر کے اعتبار سے وہ انتقال کر چکے ہیں تو ایک مردہ لوم سے کارکن اپنی تمام توانائی اور پیداواری صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے باوجود وہ پیداوار حاصل نہیں کرسکتا جو جدید اور زندہ مشینوں سے جاپان اور کوریا کی لڑکی حاصل کرسکتی ہے۔

یہ مضمون نبی احمد صاحب کے دو لیکچروں پر مبنی ہے جو انہوں نے پاکستان فکری محاذ اور ریسرچ فورم میں دیئے۔ ریسرچ فورم پاکستان فکری محاذ کے تعاون کا شکریہ ادا کرتا ہے

پاکستان میں کانکنوں کے مسائل

احمد سلیم

پاکستان میں کانکنی کی صنعت میں حادثات کے نتیجے میں اموات روزمرہ کا معمول بنتی جارہی ہیں۔ کان میں زہریلی گیس بھر جانے یا کان گر جانے سے ہر سال بہت سے کان کن اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں کانکنوں کے حالات کار اور حالات زندگی اتنے ابتر ہیں کہ اس قسم کی اموات اب حادثہ یا اچنبھا معلوم نہیں ہوتیں۔

ان اموات کے ساتھ ساتھ خود کانکن کی زندگی، چار یا پانچ برسوں کے اندر اندر موت سے بدتر ہو جاتی ہے۔ وہ کان میں کسی حادثے کے نتیجے میں اگر بچ بھی جائے تو ٹانگوں اور بیروں سے معذور ضرور ہو جاتا ہے۔ اور پھر اسے بھیک پر زندہ رہنا پڑتا ہے اور اگر وہ حادثے کا شکار نہ بھی ہو تب بھی کانوں میں مختلف معدنیات کی گرد اس کے سینے اور پھیپھڑوں پر جمنے لگتی ہے اور وہ پانچ سات سال تک اپنی بھرپور توانائی صرف کرنے کے بعد، دمہ اور ٹی بی جیسے امراض کا شکار ہو جاتا ہے یا پھر شروع شروع میں سر درد کی معمولی شکایت سے بڑھ کر بالآخر وہ اپنی آنکھیں کھو بیٹھتا ہے۔ وہ ان حادثات اور بیماریوں سے اگر بچ بھی نکلے (جس کا خواب موجودہ حالات میں نہیں دیکھا جاسکتا) تو بھی اسے ہر وقت روٹی، کپڑے اور مکان کے لالے پڑے رہتے ہیں۔ کانوں میں، جہاں وہ کام کرتا ہے وہاں تو غیر انسانی حالات ہیں ہی لیکن کام کے بعد اپنے بیوی بچوں سے سینکڑوں میل دور جن کھولیوں میں وہ اپنی باقی زندگی گزارتا ہے، وہ جگہیں بھی اس کی زندگی کے لئے کم شرمناک نہیں ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ حالات کیوں ہیں اور ان کا کیا سدباب ہو سکتا ہے؟ یوں تو پاکستانی صنعت کے ہر شعبے میں بندۂ مزدور کے اوقات تلخ ہیں لیکن کان کنی کے شعبے میں صورت حال کہیں زیادہ سنگین ہے اگرچہ آئے دن یہ آوازیں سنائی دیتی رہتی ہیں کہ کان کنوں کے حالات کی بہتری کا تعلق خود کان کنی کی صنعت کے بہتر حالات سے ہے لیکن یہ بات اتنی بھی عمومی اور سادہ نہیں ہے اور کان کنی کے "بہتر" اور ترقی یافتہ حالات نہ ہونے کے باوجود بھی کانوں کے مالک اور ان سے وابستہ ریزنگ اور پیٹی کنٹریکٹرز، اس صنعت سے لاکھوں روپے کما رہے ہیں اور مزید کمانا چاہتے ہیں معدنیات کے فروغ کے سلسلے میں پشاور میں منعقد ہونے والے دوسرے قومی سیمینار کے استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے کان کنی کی صنعت سے وابستہ ایک اہم شخصیت اور کانوں کے مالکان کے ایک فعال نمائندے نے اس نکتے پر خاصہ زور دیا تھا کہ کوئلہ کی اضافی پیداوار یا نئے رقبہ جات سے کوئلہ پیدا کرنے کی صورت میں پٹہ داروں کو انکم ٹیکس اور نصب کی جانے والی مشینری پر کسٹم کی چھوٹ ایسے محرکات ہیں جس سے کوئلہ کی ملکی پیداوار میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ انکم ٹیکس اور باہر سے منگوائی جانے والی مشینری پر کسٹم ڈیوٹی کی چھوٹ سے کوئلے کی پیداوار میں کتنا اضافہ ہوتا ہے یا ہوتا بھی ہے کہ نہیں، اس سے قطع نظر، اس بات میں شبہ نہیں کہ اس سے سیٹھوں کی تجوریوں میں آنے والی رقوم میں خاصا اضافہ ہوگا۔

ہم مان لیتے ہیں کہ ان رعائتوں سے معدنی ترقی کو ایک مہمیز ملے گی یہ بھی درست ہے کہ کان کنوں کے بہتر حالات کا تعلق، خود کان کنی کی صنعت کے بہتر حالات سے ہے یہ بھی درست ہے کہ اس صنعت کو ترجیحی بنیادوں پر لئے بغیر، اس کے حالات بہتر نہیں کئے جا سکتے ہم انسٹی ٹیوٹ آف مائننگ انجینئرز کے جنرل سیکریٹری جناب خالد پرویز کی اس بات سے بھی متفق ہیں کہ پاکستان میں کان کنی کے مزدور نہایت تکلیف دہ زندگی اس لئے گذار رہے ہیں کہ پاکستان میں خود کان کنی کا شعبہ کسمپرسی کا شکار ہے ہماری کوئی حکومت

ابھی تک معدنیات کی پالیسی واضح نہیں کر سکی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کان کنی کے پبلک سیکٹر میں سولہ سترہ ایجنسیاں ایک ہی کام کر رہی ہیں بہرحال قومی سطح پر کان کنی کے سلسلے میں اس کوتاہی اور غفلت کا سارا بوجھ کان کنوں پر پڑتا ہے۔

استحصال کا ڈھانچہ

کان کنوں کے خطرناک حالاتِ کار اور حادثوں، بیماریوں اور رہائشی حالات کا جائزہ لینے سے پہلے کان کنی کے اس مجموعی نظام پر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہے جو کان کنوں کی حالت کو بہتر نہ بننے دینے کے ساتھ ساتھ، کان کنی کی صنعت کو بھی پنپنے نہیں دیتا مثلاً اگر ہم ڈنڈوٹ کی کوئلے کی کانوں سے اپنی بات شروع کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی کان کی لیز الاٹ کروالینے کے بعد، اکثر حالات میں کان کے مالک اور مزدور کا آپس میں براہ راست تعلق نہیں ہوتا یہاں تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) مائن اونر کان میں سے خود کوئلہ نکالے

(۲) وہ ریزنگ کنٹریکٹر کو لیز ٹھیکے پر دے دے اس صورت میں ریزنگ کنٹریکٹر فی ٹن معاوضے پر، اسے کوئلہ نکال کر دے گا اور اس سلسلے میں سارے انتظامات (کان کی کھدائی ٹمبر وغیرہ کی خریداری کان کنوں سے معاملہ وغیرہ) وہ خود کرے گا۔

(۳) وہ لیز، پیٹی کنٹریکٹر کو ٹھیکے پر دے دے گا اور اسے فی ٹن اس کا کمیشن ادا کرے گا اب پیٹی کنٹریکٹر آزاد ہے کہ وہ اس کان میں سے جتنا چاہے، کمالے۔

آخری دونوں صورتوں (۲ اور ۳) میں فرق یہ ہے کہ ۲ میں فروخت مالک کے پاس رہتی ہے اور ۳ میں پیٹی کنٹریکٹر کے پاس چلی جاتی ہے تیسری صورت بدترین صورت ہوتی ہے اس میں اندھا دھند کام کیا جاتا ہے زیادہ سے زیادہ کوئلہ نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے اس جنونی دوڑ میں کان کن کے تحفظ SAFETY کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورتیں تک نظر انداز کر دی جاتی ہیں پرائیویٹ کانوں میں حادثوں کی بڑی وجہ پیٹی کنٹریکٹر

ہے پیٹی کنٹریکٹر دو طرف سے لوٹتا ہے. کان کنوں سے زیادہ سے زیادہ کام لے کر اور انہیں کم سے کم اجرتیں دے کر، دوسرے مائن اونر اسے اپنے کاغذات میں پیٹی کنٹریکٹر کی بجائے ریزنگ کنٹریکٹر لکھتا ہے. اب ٹھیکیدار انکم ٹیکس والوں کو بتاتا ہے کہ اس نے مالک سے لیبر کی ریزنگ کا فرض کیا =/۳۰۰ روپیہ فی ٹن لیا تھا. =/۲۷۵ روپے فی ٹن خرچ کر دیا، اب کل =/۲۵ روپیہ فی ٹن بچا ہے حالانکہ ہوتا یہ ہے کہ وہ لیز اونر کو فی ٹن ایک مقررہ رقم دے کر ساری سیل اپنے گھر لے جاتا ہے. چونکہ کاغذات میں اس کا نام پیٹی کنٹریکٹر کے طور پر نہیں آتا اس لئے وہ انکم ٹیکس کے کھاتوں کی زد میں نہیں آتا. اس طرح پیٹی کنٹریکٹر کی صورت میں حکومت کا کروڑوں روپے ٹیکس چرایا جا رہا ہے.

حکومتی عملے کا کردار

ہر کان میں مینجر اور مائن سردار کی تعرری ضروری ہے، یہ کان کی سیفٹی کے ذمہ دار ہوتے ہیں. مائن سردار انسپکٹوریٹ آف مائنز کی طرف سے سرداری کا امتحان پاس کرنے کے بعد سردار کے عہدے پر لگتا ہے بیشتر صورتوں میں وہ پیٹی کنٹریکٹر کا آدمی ہوتا ہے اگر وہ اس کا اپنا آدمی نہ بھی ہو تب بھی نوکری کے ڈر سے، وہ پیٹی کنٹریکٹر سے مائن سیفٹی کے سلسلے میں زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا. لہٰذا مائن سرداروں کی اکثریت ہاں میں ہاں ملانے والوں کی ہوتی ہے وہ کان کے ناقص انتظامات پر حرف گیری نہیں کر سکتے اور ہر چیکنگ کے لیے" درست ہے" لکھنے پر مجبور ہوتے ہیں بعض مائنز میں ہمیں انسپکشن ٹیکس دیکھنے کا موقع ملا ان میں کہیں بھی لکھا ہوا نہیں ملا کہ کان کی کوئی چیز غلط یا ناقص ہے. مائن سردار جو امتحان "پاس" کرتا ہے اس کے ان دنوں کے نرخ =/۳۰۰۰ روپے فی ڈگری ہے.

دو چار مائن سرداروں پر ایک سپروائزر یا مینجر ہوتا ہے مینجر بننے سے پہلے انجینئرز کو قانونی طور پر شروع میں مائن سرداروں کے ماتحت کام کرنا پڑتا ہے ایک سال کا تجربہ

حاصل کر لینے کے بعد انہیں بھی سرداری کا امتحان پاس کرنا پڑتا ہے اس کے بعد وہ مینجر بنتے ہیں پرائیویٹ کانوں میں صورت حال کی سنگینی کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی مائن انجنیئر، مائن کے ناقص انتظامات کے بارے میں انسپکشن بک میں کچھ لکھ دے تو اسے مائن اونر یا اس کے آدمیوں کی طرف سے تنبیہہ کی جائے گی کہ وہ ابھی مینجر نہیں بنا ہے اس لیئے یہ اس کی قانونی ذمہ داری نہیں ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پرائیویٹ کانوں میں جتنے بھی مائن انجنیئر کام کر رہے ہیں، وہ کم و بیش اپنا ضمیر کچل کر وہاں بیٹھے ہوئے ہیں چنانچہ ان کا یہ منفعل PASSIVE کردار بھی بیشتر حادثوں کا باعث بنتا ہے۔

پبلک سیکٹر ہو یا پرائیویٹ، مزدوروں کی بھرتی میٹ MATE کرتے ہیں. میٹ زیادہ تر اپنی لیبر سوات سے لاتے ہیں. میٹ کئی بار مزدوروں کو بیگار میں بھی پکڑ لاتے ہیں اور اس کی مزدوری خود ہڑپ کر جاتے ہیں. میٹ کو بلوچستان میں جوڑی سر JORISAR کہتے ہیں. یوں مزدور کی دوطرفہ لوٹ کھسوٹ میں میٹ بھی اہم کردار ادا کرتا ہے

ٹھیکیداری کا جبر

ٹھیکیداری سے لے کر انسپکشن تک کا یہ تمام ڈھانچہ کم و بیش پاکستان کی تمام کانوں میں رائج ہے. افغانستان کے بارڈر پر چاغی کے علاقہ میں سنگ سلیمان ONYX کی کانوں میں مزدور کی تباہی کا سب سے بڑا سبب ٹھیکیداری نظام ہی ہے. انتظامیہ خود کو ذمہ داریوں سے بچانے کے لئے کانیں ٹھیکے پر دے دیتی ہے اس طرح بہت کم دے کر بہت زیادہ وصول کرنے کی اس کی ہوس بھی پوری ہو جاتی ہے اور ٹھیکیدار بھی من مانیاں کر لیتا ہے. نوشکی کے قریب ماربل کی کانوں میں حالات اور بھی ابتر ہیں جہاں پورے بلوچستان میں سب سے کم مزدوری ہی نہیں دی جاتی بلکہ بعض صورتوں میں کان کنوں سے بیگار بھی لی جاتی ہے سور رینج SORE-RANGE، اور ڈیگاری کی کوئلے کی کانوں میں تمام لیبر سوات سے آتی ہیں تمام معاملے کو مائن اونر، جوڑی سر اور سرکاری افسر مل کر DEAL کرتے

ہیں۔ جوڑی سر سوات سے مزدور بھرتی کرتا ہے یہاں مزدور دو طرح کے ہیں (۱) ریگولر جن کی دہاڑی مقرر ہے (۲) عارضی الکٹریٹ ان مزدوروں کی ہے جنہیں جوڑی سر ٹھیکے پر لاتا ہے انہیں کام کی مقدار کے حساب سے پیسے دیے جاتے ہیں۔ فی ٹن کے حساب سے۔ یہ کنٹریکٹ جوڑی سر اور اونر کے درمیان ہوتا ہے مزدور سے فی ٹن جو رقم طے ہوتی ہے وہ اس کے نصف سے بھی کم ہوتی ہے جو جوڑی سر مائن اونر سے طے کرتا ہے۔ ۲۰٪ افسر لے جاتا ہے کیونکہ اس کی مدد کے بغیر اس لوٹ مار کو جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ سور رینج میں جوڑی سر کی اس تمام کاروائی کو ممنوع قرار دیا گیا ہے لیکن یہ جاری ہے۔ پرح کی کانوں میں یہ ڈھانچہ اس طرح قائم ہے۔

لیز اونر ۔ پیٹی کنٹریکٹرز۔ جمعدار ۔ جوڑی سر ۔ مزدور

ایک جمعدار کئی کانوں کے لئے مزدور بھرتی کرتا ہے اور ہر مزدور سے ایک روپیہ فی بوری وصول کرتا ہے اس کے بعد جوڑی سر کی باری آتی ہے جو مزدور سے ۸ آنے فی بوری وصول کرنے کے ساتھ ساتھ بیشتر حالات میں خود بھی مزدوری کرتا ہے۔ جمعدار اتنا امیر ہوتا ہے کہ وہ کبھی کبھی پیٹی کنٹریکٹر کے لئے سرمایہ بھی فراہم کراتا ہے پرح کے ایک مائن اونر جو خود بھی برسوں مزدوری کرتے رہے تھے بتانے لگے کہ جمعداری نظام اس وقت شروع ہوا جب مزدور زیادہ تھے اور کام کم ان کے مطابق جمعدار ۲ روپیہ فی بوری ہر مزدور سے وصول کرتا ہے۔ یہی نہیں وہ ۸ آنہ سے ۲ روپیہ فی بوری تک مائن اونر سے بھی کمیشن وصول کرتا ہے اس ڈھانچے میں مینیجر بھی مائن اونر یا پیٹی کنٹریکٹر کے مفادات کے تابع ہوتا ہے انسپکٹر آف مائنز بھی مفادات کے اس ڈھانچے میں یا تو مزدور کی حمایت کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا یا پھر وہ خود ہی اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ نتیجہ: کان کن حادثوں، بیماریوں اور اموات کے درمیان اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔

سرحد میں مختلف کانوں میں صورت حال مختلف ہے۔ زمرّد کی کانوں میں (منگورہ)

میں جب کام ٹھیکیداری پر ہوتا تھا تو ٹھیکیدار لوگ خود اپنے طور پر مزدور بھرتی کرتے تھے۔ اور کسی حد تک ان کی بھلائی کا خیال بھی رکھتے تھے کیونکہ نفسیاتی پہلو سے بھی نمک نکال کر دینے والا کچھ تو مطمئن ہونا چاہیئے جب حکومت نے کانوں کو ٹیک اوور کرلیا تو لیبر مینجمنٹ شروع ہوگئی چنانچہ اب مزدوروں کی دو قسمیں ہیں (۱) ریگولر اور (۲) عارضی

ریگولر جیم کارپوریشن آف پاکستان کے ملازم شمار ہوتے ہیں یہ عام طور پر وہی لوگ ہیں جو حکومت کے قبضے سے پہلے ان کانوں پر کام کر رہے تھے۔ عارضی بنیادوں پر کام کرنے والے مزدوروں کو کام کے بعد ڈسچارج کر دیا جاتا ہے انہیں سالانہ چھٹی اور مستقل ملازمین کے دوسرے فائدے حاصل نہیں ہوتے۔ پیس ریٹ کی بجائے وہ دہاڑی پر کام کرتے ہیں لیکن ان کی دہاڑی بہت کم یعنی ۱۶ سے ۱۸ روپے تک ہوتی ہے۔

پنجاب میں نمک کی کانوں (کھیوڑہ) میں صورت حال سب سے الگ تھلگ اور مختلف ہے یہ کانیں پبلک سیکٹر میں ہیں اور ٹھیکے موروثی ہیں دراصل مائنرز کو "محنت کرنے کا حق" ورثے میں ملتا ہے۔ سنہ ۱۸۶۲ء میں انگریزوں نے اس سلسلے کا آغاز کیا تھا۔ ہر مائنر رجسٹرڈ ہوتا ہے انہیں خاندانی طور پر الگ الگ ایریاز الاٹ کئے گئے ہیں جتنے ٹن وہ نمک نکالیں، انہیں اس حساب سے معاوضہ دے دیا جاتا ہے۔ اگر کسی ایک ایریا میں نمک ختم ہوگیا تو اسے اتنے فٹ لمبا، اتنے فٹ چوڑا دوسرا ایریا دے دیا جائے گا اور باپ کے بعد بیٹے کا اس پر حق ہوگا اس حق کو قانونی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے جب سے یہ کانیں صوبائی حکومت کے قبضے میں آئی ہیں حکومت کی کوشش ہے کہ ان کانوں کو پرائیویٹ ہاتھوں میں دے دیا جائے مثلاً I.C.I نمک کی کل پیداوار کا تقریباً ۵۰٪ حصہ یہاں سے خریدتی ہے۔ اگر اسے نئی لیزیں الاٹ کر دی گئیں تو پھر یہاں کی پیداوار یقیناً آدھی رہ جائے گی اور اس حساب سے مزدوروں کی فی ٹن آمدنی، جو پہلے ہی کم ہے اس سے بھی نصف ہو جائے گی یونین، جو انہیں موروثی مائنرز پر مشتمل ہے اس صورت حال کے خلاف شدید مزاحمت

کررہی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت غریب کان کنوں کے موروثی حقوق (محنت کرنے کے) کو اونے پونے داموں بیچنے پہ تلی بیٹھی ہے یہ مسئلہ بھٹو حکومت کے دور میں بھی کافی زور وشور سے اٹھا تھا لیکن بھٹو صاحب نے ان کانوں کو پرائیویٹ ہاتھوں میں دینے سے سختی سے انکار کردیا تھا۔

سندھ میں میٹنگ METING اور لاکھڑا کی کوئلے کی کانیں بھی ٹھیکیداری نظام کی شدید لپیٹ میں ہیں ٹھیکیدار اپنے کارندوں کے ذریعے کان کنوں کو بھرتی کرتے ہیں اور ٹھیکیداری نظام کی چیرہ دستیوں کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں افسوسناک بات یہ ہے کہ کوئلے کی دلالی میں مائن اونرا ور ٹھیکیدار کے ہاتھ اور منہ کالا نہیں ہوتا بلکہ کان کنوں کے خون سے لال ہوجاتا ہے کہیں کہیں تو ٹھیکیدار یونین کی آڑ میں کام کرتا ہے جیسے میٹنگ اور لاکھڑا میں یونین کے لیڈر (جو اصل سیٹھوں کے لوگ ہیں) کررہے ہیں۔

اُجرتیں

پاکستان کی کم وبیش تمام کانوں میں پیس ورک کا نظام رائج ہے اور مزدور عموماً سوات کوہاٹ اور پونچھ کے علاقے سے آتے ہیں ڈنڈوٹ میں کان کن، میٹ کی معرفت آتے ہیں اور وہی ان کی اجرتیں طے کرتا ہے ان اجرتوں میں اس کی اپنی کمیشن، پہلے سے طے ہوتی ہے کان کی کھدائی کے دوران معاوضہ فی فٹ اور کوئلہ نکالنے کے دوران معاوضہ فی ٹن کے حساب سے دیا جاتا ہے لیبر بنیادی طور پر سیزنل ہے پی ایم ڈی سی (پاکستان منرل ڈیویلپمنٹ کارپوریشن) کی ڈنڈوٹ میں دو کانیں ہیں جہاں کوئلے کی کان سے باہر لانے کے لئے ہالیج لگائے گئے ہیں ایسی کانوں کا سائز ۸ × ۷ ہے لیکن ۴ × ۵ سائز کی کانوں میں مزدور کو چوپایوں کی طرح جھک کر چلنا پڑتا ہے ایسی حالت میں ان کی پیٹھ پر کوئلہ کی بوری رکھی ہوتی ہے۔

پی ایم ڈی سی اپنے کان کنوں کو نسبتاً بہتر معاوضے دیتی ہے۔ کوئلہ نکالنے کے دوران

ایک فٹ کا مجموعی معاوضہ =/۱۸۰ روپے ہے اگر بارش کے باعث کان میں پانی ہو اور کیچڑ کے باعث کام کرنا مشکل ہو جائے تو اس صورت میں =/۳۰ روپے فی فٹ اضافی بطور کیچڑ الاؤنس دیے جاتے ہیں. اگر شدید گرمی پڑ رہی ہو تو اس صورت میں بھی =/۲۰ روپے فی فٹ اضافی دیے جاتے ہیں. کان کی کھدائی - DEAD WORK کے دوران اجرتوں کی شرح کافی مختلف ہوتی ہے کان کی کھدائی کا آغاز =/۲۰ روپے فٹ سے ہوتا ہے اور ہر ۵۰ فٹ کے بعد -/۱۰ سے -/۱۵ روپے بڑھتے جاتے ہیں.

اس بات کو اس مرحلے پر واضح کرنا ضروری ہے کہ یہ معاوضے براہ راست کان کن کو نہیں ملتے بلکہ MATE کو دیے جاتے ہیں آگے وہ کان کنوں کے ہاتھ میں کیا دیتا ہے اس کا انحصار خود اس پر ہے ڈنڈوٹ کی بعض مقامی کانوں، مقامی لوگوں کی اطلاع کے مطابق میٹ بہت سے لوگوں کو بیگار پہ بھی لگائے رکھتے ہیں اور ان کی مزدوری خود ہڑپ کر جاتے ہیں

ڈنڈوت سے چند میلوں کے فاصلے پر کھیوڑہ کی نمک کی کانوں میں موروثی محنت کی اجرتوں کی صورت حال کہیں زیادہ ابتر ہے. کھیوڑہ کی سی. بی. اے یونین کے نائب صدر مرزا صوبیدار خان اور ڈپٹی جنرل سیکرٹری ملک غلام حیدر نے اجرتوں کی صورت حال کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالی انہوں نے بتایا کہ دن بھر کے کام کے بعد (جس میں گھر سے کان کے مقام تک اور پھر کان کے اندر سر پر اوزاروں کا بوجھ لادے میلوں پیدل چلنا بھی شامل ہے) ایک کان کن اور اس کے مددگار مزدور کو صرف تیس روپے ملتے ہیں یہ رقم ظاہر ہے دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے.

بلوچستان میں پیس ورک کی صورت حال بھی خوش آئند قرار نہیں دی جا سکتی نارمولا ایک ہی ہے کہ جتنا کام، اتنی مزدوری، لیکن حقیقت میں یہاں بھی مزدوری کی شرح، کام کی نسبت سے بہت کم ہے کان کی کھدائی کا معاوضہ فی فٹ اور کوئلہ نکالنے کا معاوضہ فی ٹن ہے اب اس بات کا انحصار کان کن پر ہے کہ وہ روزانہ کتنے ٹن کوئلہ نکال پاتا ہے اس بات

کا تعلق بھی اس کی اجرت کے سوال سے ہے کہ سیزن ختم ہونے کے بعد وہ بیروزگار ہو جاتا ہے اس صورت میں اسے یا تو کام کی تلاش میں دوسرے علاقوں میں جانا پڑتا ہے یا پھر اسی آمدنی کو سال بھر میں تقسیم کرنا پڑتا ہے. جمعداری نظام اس کی روٹی کا خاصا بڑا ٹکڑا پہلے ہی کاٹ لیتا ہے.

لیکن اجرتوں کی سنگین ترین صورت حال چاغی کے علاقہ میں سنگ سلیمانی ONYX کی کانوں میں پائی جاتی ہے یہ کانیں افغانستان کے بارڈر کے ساتھ ساتھ، ایک پٹی کی شکل میں، پاکستان میں آکر، ایران میں چلی جاتی ہیں یہاں کان کن زیادہ تر مقامی ہیں پہلے وہ دہاڑی پہ کام کرتے تھے جب مائن اونرز نے محسوس کیا کہ دہاڑی کا نظام ختم کر کے پیس ورک کے ذریعے بڑھ سکتا ہے تو انہوں نے نام نہاد "جتنا کام، اتنی اجرت" کی بنیاد پر کان کنوں سے کام لینا شروع کر دیا یہی نہیں اس کے ساتھ انہوں نے کوالٹی، کی پیخ بھی لگا دی یعنی جو مال تم نکال رہے ہو، اگر وہ "مطلوبہ کوالٹی" کا نہ ہوا تو اجرت ضبط کر لی جائے گی. اب ایک چیز جو زمین کے اندر ہے، اس کا مزدور کو کیسے علم ہو گا کہ اس کی کوالٹی مطلوبہ معیار پر پوری اترے گی یا نہیں؟ صورت یہ ہے کہ اگر تین آدمی مل کر ۳ × ۳ کا بلاک نکالیں تو اس کے لئے انہیں پورا دن چاہیئے اور اگر وہ بلاک مطلوبہ کوالٹی کے معیار پر پورا نہ اترا تو تین آدمیوں کی دن بھر کی محنت ضائع ہو چلی جائے گی. ان کانوں کی بڑی اجارہ داریاں نبی بخش زہری (ماربل انڈسٹریز) اور پرنس کریم آغا خان کے پاس ہیں. ان کے علاوہ چھوٹے چھوٹے سرداروں کی کئی کمپنیاں ہیں. نبی بخش زہری کی کانیں سب سے زیادہ میکنائزڈ ہیں لیکن یہ میکنائزیشن بھی کسی سائنسی منصوبہ بندی کے نتیجے میں نہیں کی گئی. علاوہ ازیں ان کی کچھ کانوں (سینڈک پراجیکٹ سے تھوڑے فاصلے پر) میں پرانے روائتی طریقے ہی رائج ہیں. اس کے حوالے سے انہوں نے اجرتوں کا تعین بھی کر رکھا ہے جس کا کنٹرول جمعدار کے ہاتھ میں ہے. اگر اجرت کا فی کس اوسط نکالا جائے تو وہ پورے دن میں پچاس ساٹھ روپے سے زیادہ نہیں بنتی. اس کے

ساتھ کرنے کی شرط یہ ہے کہ بلاک صحیح حالت میں نکلنا چاہیئے۔ یہ گلّا سسٹم کہلاتا ہے۔ کان کن تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سوراخ کرتے جاتے ہیں (اس میں بلاک کا مقررہ سائز برقرار رہنا چاہیئے) کوئلے کی کانوں میں تو یہ صورت حال ہے کہ جتنا ٹکڑا نکل آیا، نکل آیا لیکن یہاں ایک قطعی سائز کا ٹکڑا نکالنا پڑتا ہے اور اس میں بڑی دقتیں ہیں پھر سائز اور کوالٹی کا تعین بھی انتظامیہ کے لوگ کرتے ہیں اور وہ یقینی طور پر مالکان کے دباؤ میں ہوتے ہیں۔ مزید ستم یہ ہے کہ کان کن ایک بلاک کو نکالنے کا کام اکیلا نہیں کر سکتا وہ دو تین آدمی ساتھ لے کر آتا ہے۔ خود اس کی آمدنی اتنی کم ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو آگے اجرت نہیں دے سکتا اس لئے وہ اپنے بیٹے یا گھر کے دوسرے افراد کو ساتھ لگا لیتا ہے اور یوں یہ فیملی لیبر بن جاتی ہے ستم بالائے ستم یہ ہے کہ بلاک توڑنے کے لئے کالا بارود، مزدور خود اپنے گھر میں بناتے ہیں گویا یہ بھی ان کا درد سر ہے۔ اگر کام چاہیئے تو کالا بارود ساتھ لے کر آئیں، ورنہ چلتے بنیں یہ تو کنڈی کی صورت حال ہے نوشکی کی طرف آئیں تو زہری خاندان ہی کی سنگ مرمر کی کانوں میں کان کن کو بھوکوں مارنے کا پورا پورا بندوبست کیا گیا ہے

اگرچہ یہاں پہاڑ کی سطح پر ہی کام کرنا پڑتا ہے لیکن پہاڑ کو توڑنے کا کام مشینوں سے نہیں بلکہ ہاتھوں سے کروایا جاتا ہے مزدور کدالوں سے پہاڑ توڑتے ہیں لیکن دن بھر کے کام کے بعد ان کی اجرت ۲۰/= روپے سے زیادہ نہیں بنتی بمعاوضے کی شرح یہاں بھی فی ٹن مقرر ہے

صوبہ سرحد میں مختلف کانوں میں اجرتوں کی شرح مختلف ہے لیکن سب جگہ پیس ورک بنیادوں پر ہے جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بتایا جا چکا ہے کہ منگورہ (سوات) کی زمرد کی کانوں میں عارضی کان کنوں کی اجرتیں کم سے کم مارکیٹ ریٹ (۲۰/= روپے سے ۲۵/= روپے تک) سے بھی کم یعنی ۱۶/= سے ۱۸/= روپے تک ہیں۔

پاکستان کی مختلف کانوں میں، بظاہر صورت حال، ایک دوسری سے کافی مختلف نظر آتی ہے لیکن اجرت کے سلسلے میں بنیادی اصول ہر جگہ ایک ہی ہے یعنی پیس ورک

بنیادوں پر اجرت کا تعین. لیکن اس بات کا تعین انتظامیہ کرتی ہے کہ مثلاً بازار میں ۴۰/۰ روپے من بکنے والے نمک کو کان سے نکالنے کی اجرت صرف ۱/۲ ۱ روپیہ فی من ہو اس اعتبار سے بظاہر کافی دلکش لگنے کے باوجود یہ اصول اپنے جوہر میں بے حد ظالمانہ بن جاتا ہے خاص طور پر جب حالات کار کے مسئلے اس کے ساتھ نتھی کر کے دیکھا جائے۔

حالات کار

پاکستان کی کانوں میں جس طرح کے حالات کار پائے جاتے ہیں ان کے نتیجے میں تین طرح کی صورتوں کا ہونا لازمی ہے۔

۱. بیماریوں کی صورت میں موت

۲. حادثے کی صورت میں موت

۳. حادثوں اور بیماریوں کی صورت میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی تیاری

کانیں چاہیں کالے پتھر کی ہوں یا سرخ نمک کی سنگ سلیمانی کی ہوں یا زمرّد کی. وہ معدنیات کے ساتھ ساتھ موت بھی اگلتی ہیں۔

مثلاً منگورہ (سوات) میں، زمرد کی کانیں حادثوں اور بیماریوں سے آزاد نہیں ہیں اگرچہ یہاں حالات کی نوعیت مختلف ہے۔ یہاں چٹانوں کا پتھر نرم ہوتا ہے۔ اگرچہ گیسوں وغیرہ کے مسائل یہاں نہیں ہیں لیکن بارش کے دنوں میں پتھر کے مٹی ہو جانے کے بعد کان کے COLLAPSE ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ حادثوں کے علاوہ یہاں بیماریوں کی صورت حال بھی سنگین ہے چٹانوں میں ڈرلنگ کی وجہ سے گرد پیدا ہوتی ہے اور اگرچہ وہاں پانی بھی بکثرت پایا جاتا ہے اور زیادہ تر گرد اپنے آپ دب جاتی ہے لیکن یہاں کئی خشک ٹنل بھی ہیں وہاں اگر مزدور زیادہ دیر تک کام کریں تو مائیکرو ڈسٹ کے اڑنے سے سانس کی بیماری پیدا ہو جاتی ہے احتیاطی تدبیر کے طور پر ہونا یہ چاہیئے کہ ڈرلنگ یا بلاسٹنگ کے فوراً بعد مزدور کو وہاں سے ہٹا لیا جائے یا جلدی سے پانی کا چھڑکاؤ کر دیا جائے لیکن ان تدابیر کی طرف توجہ نہیں کی جاتی باقاعدہ REGULAR مزدوروں کو علاج کے لئے منگورہ میں کوالیفائیڈ میڈیکل افسر سے

البتہ عارضی مزدوروں کو صرف فرسٹ ایڈ یا ایمرجنسی مدد ہی دی جاتی ہے ان کے باقاعدہ علاج معالجے کی کوئی ضرورت نہیں۔

سرحد کے کوئلے کی کانوں میں حالت، سوات سے کہیں زیادہ خراب ہیں ان کانوں میں گرد وغبار کے باعث آنکھوں کی بینائی متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ سینے کے کئی امراض بھی لاحق ہو جاتے ہیں کانوں میں موجود زہریلی گیسوں (مثلاً مانو آکسائیڈ اور میتھین وغیرہ سے جان کو خطرہ لاحق ہوتا ہے)۔

سب سے زیادہ سنگین بات یہ ہے کہ مائنز ایکٹ کی صریحاً خلاف ورزی کی جاتی ہے مثال کے طور پر جن حفاظتی آلات کی فراہمی ۱۹۲۳ء جیسے پچھڑے ہوئے دنوں میں لازمی سمجھی جاتی تھی۔ صوبہ سرحد کی کانوں میں کان کنوں کو وہ آلات آج بھی فراہم نہیں کئے جاتے زہریلی گیسوں سے بچنے کے لئے جو آلات لازمی طور پر فراہم کئے جانے چاہئیں کان کنوں کو ان سے آج بھی محروم رکھا جاتا ہے اور یہ صرف پرائیویٹ کانوں میں نہیں ہوتا بلکہ سرکاری تحویل میں موجود کانوں میں بھی برسوں سے ایسا ہی ہو رہا ہے اس صورت حال کے نتیجے میں کان کنوں کی جانیں اکثر خطرے میں رہتی ہیں۔ انسپکٹوریٹ آف مائنز کا صوبائی محکمہ بھی ابھی پوری طرح سرگرم عمل نہیں ہو سکا ہے حادثات سے بچاؤ کے لئے اس نے تربیتی پروگرام شروع کئے تو ہیں لیکن ابھی تک وہ زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہو سکے۔

ڈنڈوٹ میں لیز کی الاٹمنٹ کے بعد، پہاڑ جہاں سے ٹوٹا ہوا ہے وہاں سے کھدائی کے دو لیول ایک ساتھ شروع کئے جاتے ہیں HIGH LEVEL اور LOW LEVEL
یہ وینٹی لیشن بھی ایک خاص گہرائی اور فاصلے تک ہی قابل عمل ہے اگر ایک سطح پر پہنچ کر یہ قابل عمل نہ رہے تو مصنوعی وینٹی لیشن استعمال کی جاتی ہے وینٹی لیشن کو چیک کرنے کے تین معیار ہیں۔

۱۔ آکسیجن کا تناسب

۲. درجۂ حرارت

۳. گرد کی مقدار اور گرد کو دور کرنے کے لئے ہوا کی مقدار اور رفتار کا تعین

لیکن ان سب چیزوں پر کبھی توجہ نہیں دی جاتی مصنوعی وینٹی لیشن صرف اس وقت استعمال کی جاتی ہے جب لیبر موت کے منہ میں جانے سے بالکل انکار کر دے اور لیبر اسی وقت انکار کرتی ہے جب اس کی زندگی واقعی خطرے میں پڑ رہی ہو حادثات کے علاوہ بیماریوں کا تناسب بھی کم نہیں ہے انسپکٹوریٹ آف مائنز پنجاب نے نصف درجن سے زائد ایسی مختلف بیماریوں کی فہرست جاری کی ہے جو کان کنوں کو، کانوں میں لگتی ہیں اور ناقص حالات کار کے باعث انہیں جلد ہی گھن کی طرح چاٹ جاتی ہیں ان میں آنکھوں اور پھیپھڑوں کی بیماریاں زیادہ عام ہیں۔

۱. کوئلے کی گرد سے پھیپھڑوں میں ایک بیماری ہو جاتی ہے گرد کی تہہ پھیپھڑوں پر جمنے لگتی ہے (مائیکرو ڈسٹ) جو بالآخر انہیں ناکارہ کر دیتی ہے اگر ایک کان کن پانچ سے سات سال تک ان کانوں میں مسلسل کام کرتا رہے تو وہ اس بیماری کا شکار ہو جاتا ہے اس بات کا پریشان کن پہلو یہ ہے کہ نہ تو کان کن کو اور نہ کان کی انتظامیہ کو کبھی اس بیماری کا پتہ چلتا ہے کیونکہ مزدوروں کا باقاعدہ چیک اپ تو کبھی نہیں کیا جاتا ہمارے مزدور نہ تو کان میں جانے سے پہلے اپنا میڈیکل چیک اپ کراتے ہیں اور نہ کان سے واپس آنے کے بعد۔

۲. آنکھوں کی بیماریاں گیسوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں خاص طور پر کاربن مونو آکسائیڈ گیس کافی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ پنجاب کی کانوں میں دھماکے کا سبب بننے والی گیسیں نہ ہونے کے برابر ہیں اسلیئے یہاں کھلی بتی کا استعمال کیا جاتا ہے اس کے دھوئیں سے آکسیجن گیس خرچ ہو جاتی ہے اور کاربن مونو آکسائیڈ اور کاربن ڈائی آکسائیڈ جیسی گیسیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کاربن مونو آکسائیڈ آنکھوں پر بری طرح اثر انداز ہوتی ہے جس سے سر درد کی شکایت بڑھ جاتی ہے کان کن کبھی نہیں جان سکتے کہ یہ سر درد ایک دن ان کی آنکھوں کی روشنی ختم کر دے گا۔

چوا سیدن شاہ CHOA SAIDAN SHAH ڈنڈوٹ اور خوشاب وغیرہ میں

ڈسپنسریاں تو ہیں لیکن وہاں ڈاکٹر نہیں ملتے اگر ڈاکٹر ہیں بھی تو وہ لیبر سے پیسے جھاڑنا شروع کر دیتے ہیں اب جو کان کن پیسے نہیں دیتا اس کا علاج نہیں ہوگا دوسری بات یہ ہے کہ ان علاقوں میں کوئی ڈاکٹر مشکل سے سال ڈیڑھ سال ٹکتا ہے اس لئے کئی بار خود ڈاکٹر کو پتہ نہیں چلتا کہ کان کن کو کیا بیماری ہے؟ اینتھری کوز اور سلیکوز جیسی بیماریاں ان کانوں میں عام ہیں لیکن اکثر ان کی تشخیص نہیں ہو پاتی۔

کھیوڑہ کی نہایت قدیم کانوں میں بھی کام کرنے کے حالات کم و بیش ایک صدی پرانے اور فرسودہ ہیں یہاں بیشتر کان کنوں کو ٹی بی اور دمہ کی بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔ علاج معالجے کا کوئی خاص انتظام نہیں ہے حادثوں کی صورت میں کان کے اندر فرسٹ ایڈ تک کا کوئی انتظام نہیں حادثے کے شکار زخمیوں کو پنڈی ریفر کیا جاتا ہے کبھی وہ یہیں مرجاتے ہیں کبھی چوا سیدن شاہ پہنچ کر (کان سے دس میل دور)۔ پنڈی وہ پہنچ ہی نہیں پاتے۔

کھیوڑہ کی یونین نے، جو کانوں کو پرائیویٹ ہاتھوں میں جانے کے خلاف مزاحمت کر رہی ہے، صحت اور علاج معالجے کے ضمن میں بھی چند مطالبے کئے ہیں۔

۱۔ حالات کار بہتر بنائے جائیں
۲۔ ہوا کا انتظام کیا جائے
۳۔ کان میں خچروں وغیرہ کے آنے جانے سے، جو گندگی پھیل رہی ہے، اسے دور کیا جائے۔
۴۔ یہاں ایک سرجن تعینات کیا جائے۔

سندھ کی کانیں بھی بیماریوں سے محفوظ نہیں ہیں یہاں کان کن عموماً دو بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں۔

۱۔ سلیکوز۔ جو سلیکا سے لاحق ہوتی ہے
۲۔ دوسری بیماری کوئلے (کاربن) کے ذرات اندر چلے جانے سے لگ جاتی ہے۔

گیسوں اور دھوئیں میں مستقل طور پر رہنے کے باعث آنکھیں بھی بری طرح متاثر ہوتی ہیں

بیماریوں کو روکنے کے لئے انسدادی تدابیر کا تو خیر کیا ذکر کریں بیماری کے بعد علاج معالجے کی کوئی سہولتیں نہیں ہیں نہ کوئی ہسپتال ہے، نہ ڈسپنسری لاکھڑا میں مائنز لیبر آرگنائزیشن کے محکمے نے ایک ایمبولینس کا انتظام کر رکھا ہے حالانکہ اس محکمے کے پاس بہت فنڈز ہیں اور وہ اس سے کہیں زیادہ کر سکتا ہے جتنا کر رہا ہے۔

بلوچستان کی کان کنی کے استحصال کا سلسلہ سنگ سلیمانی ONYX کے پہاڑوں جتنا ہی طویل ہے اگرچہ ان کانوں میں گرد زیادہ نہیں ہوتی لیکن کان کنوں کو گلاسز فراہم نہ کرنے کے باعث چھوٹے چھوٹے ذرات اڑ کر ان کی آنکھوں میں پڑتے ہیں اور آنکھوں کو نقصان پہنچاتے ہیں دوسرے مسلسل مشین چلانے سے VIBERATION ہو جاتی ہے اور اعصابی نظام بری طرح متاثر ہوتا ہے اور متاثرین کو پتہ تک نہیں چلتا کہ ان کی صحت پر کتنا برا اثر پڑ رہا ہے ستم یہ ہے کہ انجنیئرز اور انسپکٹوریٹ والے جو ان باتوں کو جانتے ہیں، وہ بھی اس طرف توجہ نہیں دیتے کان کنوں کو نہ تو حفاظتی جوتے ملے ہوئے ہیں (ایک شو آتا ہے جس کے اندر اسٹیل کور سیج ہوتا ہے تاکہ اگر پاؤں پر کوئی وزنی چیز گر جائے تو نقصان نہ ہو) اور نہ فرسٹ ایڈ بکس اور اسٹریچر کا کوئی انتظام ہے۔

مچھ اور سورینج کی کانوں میں موت گیسوں اور حادثوں کی صورت میں اپنے شکار تاکتی ہے بعض کانوں میں گیس کا پتہ چلانے کے لئے ضروری سائنسی آلات کی بجائے پنجروں میں بند پرندوں کو کان میں لے جایا جاتا ہے اگر پرندہ مرجائے یا بے ہوش ہو جائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ گیس موجود ہے گیس سے متاثرہ شخص کو ہوش میں لانے کے لئے کسی سائنسی طریق کار کی بجائے سرکا گھول کر پلا دیا جاتا ہے وہاں نہ کوئی ڈاکٹر ہے نہ دوائیاں حادثے کی صورت میں کان کن کو کوئٹہ کے ہسپتال میں بھیجا جاتا ہے جہاں وہ کئی بار پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتا ہے مچھ میں ہنگامی حالات میں ہنگامی سہولتوں کا فقدان ہے کئی بار سیلاب کے باعث بولان ندی کا راستہ بند ہو جاتا ہے اور حادثے کے شکار فرد کو کوئٹہ یا کہیں اور طبی امداد کے لئے نہیں لے

جایا جاسکتا۔

سورینج اور ڈگاری کی سرکاری کانوں میں کان کن کے پاس نہ ماسک ہوتا ہے نہ آکسیجن کا کوئی باقاعدہ انتظام صرف سر پر بیٹری سے چلنے والی ایک لائٹ لگا دیتے ہیں آکسیجن کی بہت کم مقدار اس کی بیٹھ پر فکس ہوتی ہے۔

دنیا بھر کی کانیں سائنسی انداز کی ہیں ہمارے یہاں کانیں لکڑی کے اسٹینڈ پر کھڑی ہوتی ہیں۔ انجنیئر ہفتے میں صرف تین بار کان میں جاتا ہے حالانکہ یہ اس کی روز کی ڈیوٹی ہوتی ہے کہ وہ دیکھے کہ سیفٹی کی پوزیشن کیا ہے زیادہ تر کان کن خود اپنے رسک پر کام کرتے ہیں یہاں کا ٹرین سسٹم بھی بہت ناقص ہے ٹنل کے اندر سے جو پٹری بنائی گئی ہے وہ بھی اچھی پوزیشن میں نہیں ہے لائٹ کا انتظام نہ ہونے سے چھوٹے موٹے حادثے ہوتے رہتے ہیں بڑے حادثے عموماً گیس سے ہوتے انجنیئر روزانہ چیک نہیں کرتے دوسرے مائنز انجنیئرز کی کمی ہے ناتجربہ کار انجنیئروں اور مائن سرداروں کو کان کے پھٹنے کے اسباب اور حالات کا پتہ نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ ڈگاری اور سورینج کی کانوں میں سب سے زیادہ حادثے کانوں کے پھٹنے کے ہوتے ہیں گیس کی نکاسی کا انتظام بہت ناقص ہے جہاں انجنیئر کو اندازہ ہوجائے کہ گیس بہت بھر گئی ہے تو اس کے لئے تھوڑا بہت انتظام کرلیا جاتا ہے چونکہ گیس کی نکاسی کا کوئی باضابطہ انتظام نہیں ہے چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ گیس بھر جاتی ہے مزدور کام کر رہے ہوتے ہیں انجنیئر نے کان کو چیک نہیں کیا ہوتا اس لئے مزدوروں کو اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ موت کے منہ میں جا رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ سال میں پانچ چھ حادثے صرف سورینج میں ہوجاتے ہیں جن میں مرنے والوں کی سالانہ اوسط بیس سے پچیس تک پہنچ جاتی ہے یہ حالات کار ایک طرف حادثوں کا باعث بنتے ہیں اور دوسری طرف کان کن سینے کی مختلف بیماریوں میں مبتلا ہوتا چلا جاتا ہے پانچ سات سال کے اندر اندر ایک کان کن عموماً ٹی بی کا شکار ہوجاتا ہے دمہ اور ٹی بی کی بیماریوں کے ساتھ ساتھ کئی بار کان کن اپنی بینائی بھی کھو بیٹھتے ہیں۔

پاکستان کی کانوں میں حالات کار کا جائزہ لینے کے بعد اگر ہم ایک نظر دوسرے ملکوں کی صورت حال پر ڈالیں تو حالات کی سنگینی کا بآسانی اندازہ کیا جاسکے گا مثلاً ہندوستان میں بہار کو کان کنی کے مرکزی علاقے کی حیثیت حاصل ہے چنانچہ وہاں تحقیقات کے باقاعدہ انسٹی ٹیوٹ ہیں وہاں پہلے سے بڑے پیمانے پر EXPLORATION کا کام کیا گیا ہے۔

ہمارے یہاں کانوں میں کوئی ماہر ارضیات نہیں ہوتا جب کہ ہندوستان میں ہر کان میں ماہر ارضیات لازمی ہے وہاں ۱۹۲۳ء کے مائننر ایکٹ میں قومی تقاضوں کے مطابق ریڈیکل تبدیلیاں کی گئی ہیں چنانچہ کان کنوں کے حالات کار ہمارے یہاں سے بہتر ہیں ٹریڈ یونین کی آزادی ہے اور کان کن شاذونادر ہی حادثوں کا شکار ہوتے ہیں بیماریوں اور حادثوں سے بچنے کے لئے کان کنوں کو انسدادی آلات فراہم کئے جاتے ہیں سابقہ حکومت کے دور ۱۹۷۳ میں مائننر ایکٹ میں تبدیلیاں تو ہمارے یہاں بھی کی گئی ہیں لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ کانوں کی افادیت کو ابھی تک سمجھا ہی نہیں گیا مثلاً ہم افغانستان کی مثال لیتے ہیں اس ملک کے پاس نہ بندرگاہ ہے، نہ دیگر سہولتیں لیکن اس کے معدنی وسائل بہت وسیع ہیں ان کے پاس دنیا کا بہترین سلیمانی پتھر ہے چنانچہ کانوں کو نجی ملکیت سے نکال کر ایک طرف قومی معیشت کو ترقی دینے کی زبردست منصوبہ بندی کی گئی ہے دوسری طرف کان کنوں کو بہترین حالات کار فراہم کئے گئے ہیں کان کنی کو زیادہ سے زیادہ مشینی بنیادوں پر استوار کیا گیا ہے جس کی وجہ سے حادثوں کا تناسب بہت کم ہوگیا ہے ایران میں بھی مشین کاری کا رجحان عام ہے ترکی نے اس حد تک ترقی کی ہے کہ وہ کانکنی کی تربیت تک دینے لگا ہے۔ سری لنکا نے معدنیات کی دولت سے مجموعی قومی خوشحالی سے زیادہ محنت کشوں کو سہولتیں دینے اور ان کے حالات کار بہتر بنانے پر توجہ دی ہے بھوٹان جیسا بالنسبت کمزور ملک بھی اپنے آپ کو ہم سے زیادہ منظم کرنے کی کوشش کر رہا ہے وہاں بھی کانوں میں زہریلی گیسیں اور معدنیات کی گرد ہوتی ہے لیکن ان کے انسداد کے لئے زیادہ سے زیادہ تنظیم کاری کی گئی ہے یہ وہ ممالک ہیں جو ہماری طرح ترقی پذیر ان پر عمل درآمد کرنے کا ہے۔ ہمارے یہاں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کانوں

کہلاتے ہیں لیکن اگر سوشلسٹ بلاک (مثلاً سوویت یونین) میں کانکنی کی صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو حالات کہیں بہتر ہیں صرف وینٹی لیشن کی مثال سے اس فرق کو واضح کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ وہاں ہر چیز پیمائش سے گزرتی ہے مثلاً ہوا کی رفتار ایک REQUIREMENT ہے کہ کول کٹنگ کے دوران اتنے میٹر فی سیکنڈ ہوا گزرنی چاہیئے۔

۲۔ اگر ایک انسان ۲۰۰ کیوبک فٹ فی منٹ آکسیجن CONSUME کرتا ہے تو اندازہ لگایا جاتا ہے کہ فیز پر جتنے آدمی کام کر رہے ہیں وہاں آکسیجن کی موجود مقدار کافی ہے یا نہیں اگر ناکافی ہو تو متبادل وینٹی لیشن کا انتظام کیا جاتا ہے

۳۔ اسی طرح گرد کے اثرات کو روکنے کے لئے فیز میں پانی چھڑکا جاتا ہے تاکہ گرد دب جائے چھڑکاؤ کے باوجود اس کے باریک ذرات ہوا میں رہ جاتے ہیں لیکن یہ اتنے کم ہوتے ہیں کہ جو بیماری ایک سال بعد پیدا ہوسکتی تھی، اب دس سال بعد پیدا ہوگی۔

ہر کان کے اپنے سینٹی ٹوریم ہیں جہاں کان کنوں کے لئے تفریح اور علاج کا اعلیٰ انتظام ہے کان پر جانے سے پہلے ہر کان کن کا طبی معائنہ ہوتا ہے یہی چیک اپ کان سے واپس آنے کے بعد بھی ہوتا ہے اگر اس دوران میں کوئی بیماری لگ گئی ہو تو اس کا باقاعدہ علاج کیا جاتا ہے

ٹریڈ یونین ازم

کان کنی کے شعبے میں ٹریڈ یونین سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر ہیں اور جہاں ہیں بھی وہ اتنی کمزور ہیں کہ ان کا کوئی خاص اثر دکھائی نہیں دیتا پھر یہ زیادہ سرکاری کانوں میں ہیں پرائیویٹ کانوں میں اول تو کوئی یونین ہے ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو وہ سیٹھوں کی اپنی بنائی ہوئی ہے یا اس پر ان کا بالواسطہ یا بلا واسطہ کنٹرول ہے۔

کھیوڑہ کے نمک کی کانوں میں یونین خاصی پرانی (۱۹۲۸ سے) ہے اور اس کی موجودہ قیادت بہتر معاوضوں اور بہتر حالات کار کے ساتھ ساتھ اس کی پبلک حیثیت ختم نہ کرنے کے

سلسلے میں بھی جدوجہد کر رہی ہے خصوصاً اس کی پرانی حیثیت میں تبدیلی نہ کرنے کیلئے اس کی جدوجہد مثالی ہے۔ ایک صدی پہلے کانکنوں کو موروثی الاٹمنٹ کے جو حقوق ملے تھے اگر وہ چھن گئے تو ان کے پاس، دوبارہ فوج میں بھرتی ہونے کے علاوہ روزگار کا کوئی اور ذریعہ باقی نہیں رہے گا نمک کی کانوں کو پرائیویٹ سیکٹر میں دینے کے خلاف یونین کی مزاحمت صرف کان کنوں کے فائدے میں نہیں ہے یہ ملک کے وسیع تر مفاد میں بھی ہے مثلاً اگر حکومت پنجاب نے ICI اور دوسرے اداروں کو پرائیویٹ لیزیں جاری کردیں تو وہ نمک نکالنے کے لئے جگہ جگہ سے کھدائی کریں گے جس سے نہ صرف نمک کے ذخائر ضائع ہوں گے بلکہ نمکین پانی زرعی زمینوں کو بالکل بنجر بھی بنادے گا اس علاقے کی زرعی زمینیں پہلے ہی ان کانوں سے متاثر ہیں لیکن اب تک کام ایک حد میں رہ کر ہوا تھا نئی لیزیں ساری حد بندیاں توڑ دیں گی پھر پرائیویٹ سیکٹر حکومت کا کروڑوں روپے کا ریوینیو بھی کھا جائے گا، جیسا کہ کول مائنز میں ہو رہا ہے۔

سندھ کی کوئلے کی پرائیویٹ کانوں میں جو یونین ہے وہ دو ٹھیکیداروں کے زیر انتظام چلتی ہے دونوں ٹھیکیدار سیٹھوں کے لوگ ہیں اور کان کنوں کی آواز اٹھنے سے پہلے ہی دبا دیتے ہیں۔

سورینج اور ڈگاری کی کانوں میں بھی یونین کا وجود تو ہے لیکن اس کا رول بالکل غیر مؤثر ہے اس کے غیر مؤثر ہونے کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ہر مائن کی اپنی ایک یونین ہوتی ہے جس کا دوسری مائن کی یونین سے کوئی تعلق نہیں ہوتا نہ وہ کسی لیبر یونین یا فیڈریشن سے منسلک ہوتی ہے چنانچہ وہ کان کنی کے مفاد میں کام کر ہی نہیں سکتی ایک دو جگہ، جہاں یونین نے مؤثر کردار ادا کرنا چاہا اسکی آزادانہ حیثیت ۔ کو کچل دیا گیا اور اسے مجبور کیا گیا کہ وہ مزدوروں کے نام مالکوں اور ٹھیکیداروں کی یونین بن کر رہے چنانچہ سورینج اور ڈگاری میں یونین کی نہ صرف مالک، ٹھیکیدار اور جوڑی سر کے ساتھ بلکہ کانوں کے مینجر اور اسسٹنٹ مینجر کے ساتھ بھی

"انڈر اسٹینڈنگ" ہوتی ہے پنج میں بھی صورتِ حال تقریباً ایسی ہی ہے یہاں بھی ایک نام نہاد ورکرز یونین ہے جہاں جمع دار یونین کا مالک بنا بیٹھا ہے اس کے غیر مؤثر ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ کان کن مستقل نہیں ہوتے اور سیزن تبدیل ہوتے ہی انہیں جانا پڑتا ہے سرحد کی زمرد کی کانوں میں صرف ریگولر مزدوروں کی یونین ہے۔ سوات زمرد کان مزدور یونین جو پاکستان میں کانوں کے مخصوص حالات کے باعث بے اثر اور کمزور ہے۔

اس مختصر جائزے سے یہ بات نکل کر آتی ہے کہ پاکستان کی کانوں میں ٹریڈ یونین سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کیونکہ

۱. کام مسلسل نہیں ہوتا کان کنوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا پڑتا ہے۔
۲. کان کنوں کو باقاعدہ ملازم نہیں رکھا جاتا
۳. کان کن اور مالک کا براہ راست تعلق نہیں ہوتا کان کنوں کی اجرت تک ٹھیکیدار وصول کرتا ہے اور خود تقسیم کرتا ہے۔

اس تمام صورتِ حال کے باوجود سرکاری کانوں میں حالات نسبتاً بہتر ہیں اور وہاں ٹریڈ یونین کسی حد تک مزدوروں کے مفادات کا تحفظ کر پاتی ہے۔

حالاتِ زندگی

کانوں کے اندر مزدوروں کے لئے جو حالات ہیں سو ہیں لیکن کانوں کے باہر جہاں ان کے گھر ہیں وہ زندگی بھی کم تباہ کن نہیں ہے کان کنوں کو غیر انسانی حالات میں کام ہی نہیں کرنا پڑتا جینا بھی پڑتا ہے

بلوچستان میں صورتِ حال سب سے زیادہ ناگفتہ بہ ہے پنج میں ہم نے کانوں سے باہر کچے، مٹی کے گھروندے اور جھگیاں دیکھیں جنہیں کان کن اپنے گھر کہتے ہیں۔ اپنے خاندانوں سے سینکڑوں میل دور پہاڑوں کے دامن میں، اپنے پیاروں اور بچوں کی صداؤں سے محروم ان لوگوں میں کئی طرح کے اخلاقی جرائم (منشیات، ہم جنس پرستی) جڑ پکڑ گئے

ہیں۔ چاغی کے علاقے میں سنگ سلیمانی کی کانوں کے مزدوروں کے جینے کے حالات بھی بہت تکلیف دہ ہیں خصوصاً سردیوں میں ان کے پاس سر چھپانے کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ نوشکی میں ماربل کی کانوں کے مزدوروں کے لئے بھی رہائش کا کوئی انتظام نہیں سورینج اور ڈگاری میں رہائش کی انتہائی ناقص صورت کے علاوہ پورے مائننگ ایریا میں صرف ایک پرائمری اسکول ہے جبکہ افسروں کے بچوں کے لئے تعلیم کا باقاعدہ انتظام ہے۔ انہیں پی۔ایم۔ڈی سی کی مائیکروبسوں میں کوئٹہ لے جایا جاتا ہے پھر وہی بسیں انہیں سکول سے واپس لاتی ہیں جہاں تک رہائشی مسئلے کا سوال ہے' آفیسرز اور لیبر کالونی کی سہولتوں میں نمایاں فرق ہے لیبر کالونی میں مزدوروں کو رہنے کے لئے جو کمرے دیئے جاتے ہیں ان میں جیل کی طرز پر تین یا پانچ مزدور رہتے ہیں لیکن لیبر کالونی سب کان کنوں کے لئے ناکافی ہوجاتی اور ان کی کافی بڑی تعداد کو جھگیوں میں رہنا پڑتا ہے۔

پنجاب (ڈنڈوٹ، کالا باغ) کی کانوں میں لیبر کو ٹینٹ اور چارپائیاں دی جاتی ہیں یا پھر پانچ چھ مزدوروں کو ایک کچے کمرے میں رکھا جاتا ہے کان کنوں کو ان کے خاندانوں سمیت رہائش فراہم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ ان کی کوئی سماجی زندگی نہیں ہے۔

کانکنوں کی زندگی اور حالات کار کے اس مختصر سے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملکی معیشت کی اس اہم صنعت میں ماقبل سرمایہ دارانہ رشتے ابھی تک متروک نہیں ہوئے کانکنوں کا غیر منظم ہونا اور ملک کے دیگر محنت کشوں کے ساتھ موثر اتحاد کی عدم موجودگی اس صورتحال کی بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔ کانکنوں کی طبقاتی قوت اور اس کا منظم مظاہرہ ہی انہیں اپنے بنیادی حقوق کے حصول میں مدد دے سکتا ہے اور انہیں بڑی لڑائیوں کے لئے تیار کر سکتا ہے ہے۔ کانکنوں کے مسائل ملک کے دیگر جمہوری مسائل سے جڑے ہوئے ہیں اور ان کی مشترکہ جدوجہد ہی موجودہ صورتحال کو بدلنے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

سندھ ہاری کمیٹی ۔ ایک تجزیہ

محمود حسن خان

تعارف

بیشتر ترقی پذیر ملکوں کی طرح پاکستان میں بھی دیہی آبادی کا منقسم و متفرق سماجی ڈھانچہ مالک و مزارع کے رشتے پر مشتمل نظام کی تاریخی پیداوار ہے ۔ آج کے پاکستان کے بیشتر زرعی علاقوں میں یہ سندھ کا صوبہ ہی ہے جہیں مالک و مزارع کے نظام کو ملکیت اراضی کی نمایاں خصوصیت کی حیثیت حاصل ہے اس نظام کی دو نمایاں خصوصیات ہیں ۔ اوّل یہ کہ زمین کا بیشتر حصّہ مٹھی بھر زمینداروں کی ملکیت میں ہے اور دوم یہ کہ کاشتکاروں کی اکثریت مزارعوں پر مشتمل ہے جن کے حقوقِ مزارعت زمینداروں کی منشا پر منحصر ہیں ۔ مزارعت کے اس بندوبست نے جسے سندھ میں انگریز نے انیسویں صدی میں متعارف کیا تھا ایک ایسا کاشتکاری نظام پیدا کیا جو غیر متوازن و عدم منصفانہ ہونے کے باوجود نسبتاً مستحکم تھا ۔

زیرِ نظر مطالعہ سندھ ہاری کمیٹی کے کردار کے تجزیے پر مبنی ہے یہ تنظیم ہاریوں (بٹائی پر کاشت کرنے والے بے زمین کسانوں یا مالکانِ زمین کی مرضی، رضا اور خوشنودی کے محتاج کاشتکاروں) میں اس لئے قائم کی گئی کہ اس مظلوم طبقے کو زمین اور زمین کی پیداوار کے سلسلے میں اُن کے کمتر حقوق اور اُن کے کمتر سماجی مرتبے کا احساس دلایا جائے اور اُن میں اپنے حقوق کی بازیابی کے لئے بیداری کی لہر اُبھاری جا سکے ۔ اور بہت سی کسان تحریکوں کی طرح، سندھ ہاری کمیٹی بھی ہاریوں کی تخلیق نہیں تھی ۔ اس تنظیم نے ہاریوں کے مالکانِ زمین کے خلاف برجستہ ردِّ عمل کی نمائندگی بھی نہیں کی ۔ بہر حال وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس تنظیم کا دائرہ وسیع ہو گیا اور اسکی کامیابیوں میں اضافہ ہوتا رہا ۔ اس کے بعد ایک دورِ زوال آیا ۔ اس دورِ زوال میں خارجی

دباؤ کے زیر اثر اس کا رُخ تبدیل ہونے لگا۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے کے اوائل میں سندھ ہاری کمیٹی کسانوں کی ایک مؤثر تحریک کی حیثیت سے ختم ہو کر رہ گئی۔ یہ تجزیہ سندھ ہاری کمیٹی کی تاریخ پر اور اُن قوتوں کو سمجھنے کی کوششوں پر مشتمل ہوگا جو اسکے عروج و زوال کا باعث ہوئیں [۲]۔

پس منظر

۱۸۴۳ء میں سندھ پر برطانوی تسلّط سے پہلے کے ڈیڑھ سو سال کے دوران مقامی مسلمان حکمرانوں کی باہمی جنگوں کے سبب، روایتی لگان داری کا نظام زوال پذیر ہو چکا تھا [۳]۔ ۱۷۹۳ء میں بنگال کے بندوبست دوامی کے بعد، برطانوی حکمرانوں نے زمین کے مالکانہ حقوق اُن لوگوں کو عطا کر دیئے جو حکمرانوں (ریاست) اور رعیّت (چھوٹے مالکانِ زمین) کے مابین، مالیہ جمع کرنے والوں کی حیثیت سے، دلالی کرتے تھے [۴]۔ وسیع و عریض زرعی رقبوں (یا زرعی ریاستوں) پر ملکیتی حقوق تسلیم کرنے اور اسطرح زمینداروں کا طبقہ وجود میں لانے کا مقصد یہ تھا کہ زرعی علاقوں سے مالیہ وصول کرنے کی رفتار اور مالیے کی رقم میں مزید اضافہ کیا جائے۔ نتیجتاً، سندھ میں پہلا مالیہ وصولی کا انتظام نقد رقم کی بنیاد پر قائم کیا گیا۔ یہ نقد رقم ہاریوں کی کاشت کردہ زمین کی کل پیداوار کا ایک مخصوص حصّہ تھی جو زمیندار، متعیّن کر کے علیحدہ کر لیتا تھا۔ زمین کا نقد

مصنف، مختلف افراد کی جانب سے تعاون پر اُن کا ممنون ہے۔ جناب ایم مسعود، جناب نذیر احمد، جناب پی کے شاہانی، جناب محمود الحق عثمانی، جناب ایس جمال الدین، جناب قاضی فیض محمد، جناب غلام حسین سومرو اور جناب خالد اسحاق کے مکالمات (انٹرویوز) کے لیے مصنّف خصوصی طور پر شکر گزار ہے، مرحوم حیدر بخش جتوئی کے ایک فرزند جناب مظہر جتوئی اور مصنف کے پرانے دوست جناب عبدالودود خان کے فیاضانہ مشورے رہنمائی کرتے رہے، لیکن اس کے باوجود متن کی پوری ذمہ داری مصنف خود قبول کرتا ہے۔

مالیہ ادا کرنے سے زمینداروں کا صرف وہ طبقہ مستثنیٰ تھا جس کی "زرعی ریاستیں" جاگیروں (یعنی مالیے سے مستثنیٰ زمینی عطیات) کے زمرے میں شامل کر لی گئی تھیں۔ یہ جاگیریں یا تو اُن افراد کو عطا ہوتی تھیں جنہوں نے نئے حکمرانوں کی حمایت کی تھی یا جو پہلے سے قائم تھیں اور جنکو نئے حکمرانوں نے قائم رکھنے کی اجازت دے دی تھی، مثلاً میروں (بڑے زمینداروں) کی پرانی جاگیریں۔ ان جاگیرداروں کا وجود مغلیہ عہد میں بھی قائم تھا، فرق یہ تھا کہ ان جاگیرداروں کو ملکیتی حقوق حاصل نہیں تھے بلکہ اُن کی حیثیت مالیہ وصول کرنے والوں کی تھی اور اُنکو حکمرانوں کے لیے سپاہی فراہم کرنے کی خدمت کے صلے میں مالیے کی رقم پر تصرف رکھنے اور اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرنے کی اجازت تھی برطانوی۔ انتظام کے تحت اُس "رعیّت" کے زمین پر مالکانہ حقوق تسلیم کر لیے گئے تھے جو درحقیقت واضح طور پر زمیندار نہیں تھے اور زمین کا متعیّن لگان براہ راست حکومت کو ادا کرتے تھے۔ اس ذیل میں آنے والے مالکانِ زمین، لغداد کے اعتبار سے کم تھے اور سندھ کی زرعی زمین کا بہت کم حصّہ ان کی ملکیت تھا ۵۔ درحقیقت جب برطانوی حکومت نے نقد مالیہ کا انتظام متعارف کروایا تو چھوٹے ملکیتی زمیندار (رعیّت) قرضوں کے بوجھ تلے آ گئے۔ سرکاری مالیہ اب جنس کی صورت میں ادا نہیں کیا جاتا تھا اور نہ ہی اسکا انحصار فصل کی حالت پر تھا، لہٰذا یہ زمیندار مہاجنوں کے چنگل میں پھنس گئے، چنانچہ ان مہاجنوں نے اُن زمینداروں سے زمین کی ملکیت حاصل کرنی شروع کر دی اور یُوں آہستہ آہستہ اپنا نقد قرض وصول کرنے کے لیے زمینوں کے مالک بنتے چلے گئے۔ چھوٹے زمیندار، نقد قرض ادا کرنے کے لیے اپنی زمینیں ان مہاجنوں کے ہاتھ فروخت کرنے پر مجبور تھے ۶۔ زمینداروں کے اُس طبقے کے آغاز کے ساتھ جو بنیادی طور پر غیر حاضر زمیندار تھے اور اپنی زمینوں کی کاشت میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے، پٹے دار (یعنی وہ مہاجن جو اپنے قرضوں کی وصولی کے لیے زمینداروں سے پٹے پر زمینیں حاصل کر لیتے تھے) بھی سندھ کے زرعی لگان کے انتظام میں ایک اہم عنصر کی حیثیت اختیار کر گئے۔ یہ پٹے، عموماً پانچ سال کی مدّت کیلیے حاصل کیے جاتے تھے اور پٹے دار، جنکا کاشت اور زمینداری سے کوئی براہ راست واسطہ نہیں ہوتا

تھا، ہاریوں کی خدمات حاصل کرتے تھے۔

زرعی زمین پر محنت کرنے والے (کھیت مزدور) افراد کی اکثریت ہاری تھی اور زمین پر اُن کی محنت، کاشت اور قبضے کے حقوق عملاً اور قانوناً تسلیم نہیں کئے جاتے تھے۔ ایک طبقہ صاحب قبضہ مزارعوں (مقدموں) کا تھا۔ یہ مقدم، صرف جاگیروں پر اپنا وجود رکھتے تھے اور زمینوں پر غیر مالکانہ قبضے کا استحقاق رکھتے تھے۔ تیسری دہائی کے وسط تک مقدموں کے حقوق میں وراثت، تقسیم یا انتقالِ اراضی کے حقوق شامل نہیں تھے ۵۔ یہ مقدم مالیے کا حصہ جاگیرداروں کو ادا کرتے تھے چند مقدمے تو مزارعے ہی رہے لیکن کچھ دوسرے مقدموں نے وسیع وعریض زرعی رقبے حاصل کر لیئے اور یہ زرعی رقبے اُنھوں نے ہاریوں کو بٹائی کی بنیاد پر کاشت کے لیے دے دیئے۔ ان کے علاوہ ایک طبقہ موروثی ہاریوں کا تھا۔ موروثی ہاریوں (نسل در نسل مزارعوں) کے حقوق قانون کی کتابوں میں تو محفوظ تھے لیکن عملاً ان قانونی حقوق کا احترام کرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا ۸۔

سندھ میں زرعی لگان کا نظام

سندھ میں زرعی زمین سے مفادات وابستہ رکھنے والے دو گروہ بنیادی حیثیت رکھتے تھے اوّل زمیندار، جو لتعداد میں کم ہونے کے باوجود بیشتر زرعی زمین پر قابض تھے اور دوسرا ہاری، جو زرعی آبادی کی اکثریت پر مشتمل ہونے کے باوجود بے زمین تھے اور کاشتکاری کے مستقل حقوق سے محروم تھے۔ گزشتہ ادوار کے اعداد و شمار معلوم نہیں ہیں، لیکن ایک تخمینے کے مطابق ۱۹۴۷ء میں سندھ کی زرعی آبادی کا ۸۰ رفیصد ہاریوں پر مشتمل تھا ۹۔ یہ تخمینہ بھی لگایا گیا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں اکثر زرعی فارم ہاریوں کی محنت سے آباد تھے اور قابلِ زراعت رقبے کے ۵۰ رفیصد پر ہاری کاشت کرتے تھے ۱۰۔ حتیٰ کہ چھٹی دہائی میں اور ساتویں دہائی کے اوّل میں ۶۰ سے ۷۰ رفیصد زراعت ہاریوں کی کاشتکاری کی مرہونِ منت تھی اور صرف ۲۰ سے ۲۴ رفیصد زرعی زمین مالکانِ زمین کی خود کاشتہ تھی (جدول ۱) ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ زمین کے مطابق، ایسے مالکانِ زمین جو ۱۰۰۰ ایکڑ کی ملکیت کے حامل تھے تمام مالکانِ زمین سے ۹ فیصد کم تھے اور کل زمین کا ۵۲ فیصد اُن کے زیرِ ملکیت تھا۔ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۲ء

میں کچھ بہتر ہو گئی تھی۔ اس بہتر صورتحال میں، یہ مالکان زمین تمام مالکان زمین سے ۲ فیصد سے قدرے زیادہ تھے اور کل زمین کے ۲۱ فیصد کے مالک تھے (جدول ۲) جہاں تک واقعی بڑے زمینداروں کا تعلق ہے (۵۰۰ ایکڑ سے زیادہ زمین کے مالک) تو ایک اندازے کے مطابق ۱۹۴۷ء میں اُن کی تعداد ۹۸۰۴ تھی (تمام مالکان کا ایک فیصد) اور ان کی ملکیتی زمین ۲۰۹۶ ملین ایکڑ تھی (تمام زمین کا ۳۰ فیصد) ۱۹۵۹ء میں اُنکی تعداد کم ہو کر ۲۱۴۷ ہو گئی ۱۱ء ۱۹۴۷ء میں جاگیروں کی تعداد ۱۳۰۳ تھی اور ان جاگیروں کا کل رقبہ ۱۲۰۱ ملین ایکڑ تھا جس کا صرف ۲۵ فیصد حصہ زیر کاشت تھا ۱۲ء

زمینداروں کے حقوقِ ملکیت میں وراثت تقسیم اور انتقال کے حقوق شامل تھے۔ صرف چند جاگیریں غیر موروثی تھیں۔ چونکہ زرعی ملکیتیں زمین کے بڑے بڑے ٹکڑوں پر مشتمل تھیں، مثلاً ۲۰۰ ایکڑ سے زیادہ، لہٰذا زمیندار اپنی زمین کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں بانٹ کر ہاریوں کو کاشت کے لئے دے دیتا تھا۔ بیشتر زمیندار ہاریوں کے کام کی نگرانی کے لئے، کامدار مقرر کرتے تھے۔ زمیندار اپنی بچی ہوئی فصل کے ہر ایکڑ کی کل آمدنی کا ۳ء ۳۳ فیصد بطور لگان یا مالیہ حکومت کو ادا کرتا تھا۔ نظری اعتبار سے ہاریوں کی زمین پر محنت کا معاوضہ نصف بٹائی ہوتا تھا یعنی زمیندار کی فصلوں کی آمدنی کا ۵۰ فیصد حصہ ہاریوں کا حق ہوتا تھا۔ اُنہیں بیج اور آلاتِ زراعت خود خریدنے اور فراہم کرنے پڑتے تھے لیکن وہ حکومت کو مالیہ یا لگان ادا نہیں کرتے تھے۔

زمیندار اور ہاری کے رشتے کی دو بنیادی خصوصیات ہوتی تھیں پہلی تو بٹائی کا نظام اور دوسری زمین پر عارضی قبضہ جو زمیندار کی خوشنودی پر منحصر ہوتا تھا اور زمیندار ہاری کا زمین پر قبضہ ادلتا بدلتا رہتا تھا۔ بٹائی نظام میں دو باتیں شامل تھیں۔ اوّلاً، زمیندار اور ہاریوں کے مابین پیداوار آدھی تقسیم ہوتی تھی ۱۳ء ثانیاً، بٹائی کے حصے کے علاوہ زمیندار اپنے ہاری سے مختلف "ابواب" (جبری ٹیکس اور جبری حصہ) وصول کرتا تھا۔ ان میں سے پانچ "ابواب" تو روائتی ہوتے تھے، اور بعض جاگیروں میں ان کی تعداد بیس تک پہنچ جاتی تھی۔ اسطرح ہاری کے جائز حصے میں

زمیندار کا چھینا ہوا ناجائز حصہ ۵ سے لیکر ۳۰ فیصد تک پہنچ جاتا تھا۔ اکثر ہاریوں کو بیگار (بلا معاوضہ محنت) بھی زمیندار کی خدمت میں پیش کرنی پڑتی تھی۔ اور زمیندار جب چاہے ہاریوں سے بیگار طلب کر سکتا تھا۔[۱۴] کاشتکاری کے سلسلے میں دوسرا طریقہ یہ تھا کہ زمیندار ہر سال ہاری کو اپنی زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بدل بدل کر دیتا تھا۔ زمین کے یہ ٹکڑے ۱۲ سے ۱۶ ایکڑ سے زیادہ نہیں ہوتے تھے، بظاہر اس کی وجہ یہ تھی کہ پانی کی کم دستیابی کا مقابلہ کرنے کے لئے فصلوں کی کاشت زمین کے ایک ٹکڑے سے دوسرے ٹکڑے پر منتقل کی جاتی ہے یہ وجہ بعد میں، زمیندار کے لئے ہاری کو قانوناً بے دخل کرنے کا ایک ہتھیار بن گئی۔ ہاری کے لئے یہ ناممکن ہوگیا کہ وہ ایک قطعہ زمین پر، زمیندار کی طے کردہ مدت سے زیادہ قبضہ کاشتکاری برقرار رکھ سکے۔ بٹائی نظام میں اگر کوئی قضیہ پیدا ہوجاتا تھا تو ہاری کی مدد کے لئے کوئی موثر سرکاری قانون نہیں تھا۔ بالغ رائے دہی کے لئے حکومت نے ہاری کی عمر ۲۱ برس طے کر رکھی تھی اور اس کے علاوہ یہ شرط بھی موجود تھی کہ ہاری نے کم از کم اتنی زمین کاشت کی ہو جسکا مالیہ اُس سال ۱۶ روپے ہو۔[۱۵] زمینداروں اور مزارعوں کا یہ نظام سندھ میں اسوقت تک قائم رہا جب تک کہ ۱۹۵۰ء میں سندھ مزارع ایکٹ منظور نہیں ہو گیا۔[۱۶]

سندھ میں مزارعوں اور زمینداروں کے یہ رشتے غیر متوازن اور غیر متناسب ہونے کے باوجود اس لئے مضبوط اور مستحکم رہے کہ یہ چند مخصوص معاشی اور سماجی قوتوں کے باہمی ردِعمل کا نتیجہ تھے اور ان ہی کی کوکھ سے انہوں نے جنم لیا تھا۔ سندھ بنیادی طور پر اور جغرافیائی اعتبار سے ایک خشک علاقہ ہے اور یہاں وہ قدرتی وسائل موجود نہیں ہیں جو زیادہ زراعت کو فروغ دے سکیں اور قائم رکھ سکیں۔ چنانچہ یہاں انسان کے تعمیر کردہ آبی نظام کے بغیر اچھی اور نفع بخش فصلوں کی کاشت صرف ان علاقوں میں ممکن ہے جو بارانی علاقے ہیں اور بارانی علاقوں کا تعین بارشوں سے ہوتا ہے۔ لہٰذا ۱۹۳۲ء میں دریائے سندھ پر لائڈ بیراج تعمیر ہونے تک یہی صورتحال تھی۔ جو علاقے دریائے سندھ سے نکلنے والی نہروں سے

دور تھے وہاں بہت کم کاشت ہوتی تھی اسی وجہ سے کاشت کاری کا دائرہ چاول اور گندم کی کاشت تک محدود تھا۔ چاول شمال میں سال میں ایک مرتبہ اور گندم جنوب میں سال میں ایک مرتبہ پیدا ہوتی تھی یا تھوڑی بہت کپاس کاشت ہوتی تھی لیکن صرف ان علاقوں میں جہاں موسم گرما میں پانی دستیاب ہوتا تھا۔ اسی صورتحال کے متعلقہ ایک اور عنصر کھیت مزدوروں کی کمی تھا کہ اس علاقے میں نسبتاً آبادی میں اضافے کی رفتار بہت سست تھی۔ یہ کہا جاتا رہا ہے کہ ایک اچھا ہاری سندھ کے بیشتر علاقوں میں ایک خوش قسمت فرد ہوتا ہے [۱۷] تجارتی پیمانوں پر زراعت کی ترقی پانی کی کمی کی وجہ سے بہت ہی محدود تھی۔ پانی اور کھیت مزدوروں کی کمی وہ دو بنیادی معاشی عناصر تھے جنہوں نے زمینداروں کو ہاریوں کے نام نہاد روایتی حقوق مزید غصب کرنے سے روکے رکھا۔

زمینداروں پر ہاریوں کا انحصار قرض کی زنجیروں اور زمین اور کام کی تلاش کے متبادل مواقع نہ ہونے کی وجہ سے اور بڑھ گیا تھا۔ یہ انحصار دو اور اہم عناصر کا مرہون منت بھی تھا۔ ایک تو زمیندار کے ساتھ ہاریوں کے قبائلی اور خاندانی رشتے (ابتدائی رشتے) اور دوسرا ہاریوں کے لئے قانون اور پولیس کے تحفظ کی عدم موجودگی جس نے یہ صورتحال پیدا کر رکھی تھی کہ زمیندار جب چاہے۔ ہاری کو اپنی زمین سے بے دخل کر سکتا تھا [۱۸] تاریخ کے دور کے جاگیردارانہ نظاموں کی طرح سندھ میں بھی زمینداروں اور مزارعوں کا نظام بیک وقت ظلم اور شفقت پر قائم تھا [۱۹]۔

سندھ ہاری کمیٹی: تشکیلی دور

بہت کم کسان تحریکیں ایسی ہیں جو کسانوں کے اپنے نظام کے اندر سے پھوٹتی ہیں [۲۰]۔ سندھ میں ایک غیر کسان بیورو نے ہاریوں میں بیداری کی لہر اٹھانے کے عمل کا آغاز کیا یہ "رہنما" ہاریوں میں ان کے کم سماجی رتبے کے سلسلے میں ایک اجتماعی ردعمل پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے چونکہ ۱۹۲۰ء کے اواخر میں کچھ مخصوص حالات سامنے آنے دیکھے مقدموں کی زمینوں پر

جاگیرداروں کا بڑھتا ہوا ناجائز قبضہ اس تحریک کو ہوا دینے میں معاون ثابت ہوا۔

۱۹۲۰ء میں برطانوی حکومت کے خلاف ہندوستانی مسلمانوں کی تحریک خلافت کے نتیجے میں متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے مولوی دیہی علاقوں میں پھیل گئے اور انہوں نے مسلمان کسانوں میں شعور بیدار کرنا شروع کر دیا۔ تمام ہاریوں کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ ان مولویوں نے ہاریوں کو بتایا کہ برطانوی حکومت مسلم مفادات کے خلاف ہے [۲۱]۔

چونکہ زمینداروں کی شناخت اور وفاداریاں ہندوستان میں برطانوی حکومت کے ساتھ تھیں لہذا تحریک خلافت بالواسطہ جاگیرداروں کے بھی خلاف تھی۔ ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے اس تحریک کو منظم کرنے کے لئے رضاکار سندھ میں آنے لگے [۲۲]۔

یہ تحریک آل انڈیا کانگریس پارٹی کی اس تحریک سے منسلک ہو گئی جو برطانوی حکومت پر ہندوستان سے نکل جانے کے لئے دباؤ ڈال رہی تھی۔ ہندوستان چھوڑ دو کی یہ تحریک نہ صرف برطانوی حکومت سے آزادی دلانے کی دعوے دار تھی بلکہ زمینداروں کا چنگل توڑنے کا دعوٰی بھی کر رہی تھی۔ شہری علاقوں کے پڑھے لکھے لوگوں میں جدید خیالات کی ترویج بھی کسانوں کی مظلومیت اور ان پر ہونے والے ستم کا شعور پھیلانے لگی۔ ہاریوں کی زندگیوں کی غیر انسانی حالت اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں کسانوں کا بڑھتا ہوا زمین کی حقِ ملکیت کا مطالبہ سماجی مصلحین اور اس میدان میں سرگرم عمل افراد کی توجہ اس طرف مبذول کروانے میں کامیاب ہوا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہاریوں کی نجات کا مطالبہ چند لوگوں کی طرف سے اس لئے بھی اٹھایا گیا ہو کہ تمام زرعی زمین کو قومی ملکیت میں لینے کا انقلابی نعرہ تقویت حاصل کر سکے۔

۱۹۳۲ء میں لائڈ بیراج کی تکمیل کے بعد لاکھوں ایکڑ زمین کی آب پاشی کے متوقع مواقع نے زمینداروں اور ہاریوں کے سامنے زمین حاصل کرنے کے مزید دروازے کھولنے شروع کر دیئے۔ اب زمیندار حکومت سے اپنی وہ تمام ضبط شدہ غیر مزروعہ زمینوں کی واپسی کا مطالبہ کر سکتے تھے جن تک پانی پہنچ گیا تھا [۲۳]۔ آب پاشی بڑھنے کا مطلب یہ تھا کہ پیداوار میں اضافے

کے امکانات بڑھ جائیں گے۔ باہر سے خصوصاً پنجاب سے سندھ میں آکر آباد ہونے والے کاشتکاروں کی وجہ سے کھیت مزدوروں کی کمی ختم ہو جائے گی اس کے علاوہ چھوٹے مالکانِ زمین کی یہ اُمید بندھنے لگی تھی کہ وہ اپنی کم ملکیتیں بڑھا سکیں گے۔ ہاریوں میں یہ توقعات پیدا ہو گئی تھیں کہ انہیں سرکاری زمین "ہراپ" (کسان) عطیات کی صورت میں مل جائیں گی۔ نتیجتاً سب زرعی طبقوں کے لئے بڑھتی ہوئی اُمیدوں کی ایک فضا قائم ہو گئی تھی۔

کساد بازاری نے بھی حکومت اور زمینداروں کے باہمی رشتوں پر بُرا اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا چونکہ کپاس وغیرہ کی فاضل پیداوار ان کے لئے منڈیوں میں مناسب قیمت حاصل نہیں کر رہی تھی اور قیمتیں روز بروز گرتی جا رہی تھیں۔ مالیے کے بڑھتے ہوئے بوجھ کو کم کرنے کے لئے زمینداروں نے ہاریوں پر اپنا یہ دباؤ بڑھانا شروع کر دیا کہ وہ اپنا لگانی حصہ جنس کی صورت میں ادا کریں۔ اس بڑھتے ہوئے دباؤ کے زیادہ واضح اثرات حیدرآباد ضلع میں جاگیری زمینوں پر دیکھے اور محسوس کئے جا سکتے تھے۔

غالباً ایسی ہی طاقتوں اور عناصر کے مجموعی تانے بانے اور باہمی ردِّعمل نے شہری افراد کے ایک گروہ کو سندھ ہاری کمیٹی کے نام سے ایک تنظیم قائم کرنے کی ترغیب دی جو ۱۹۳۰ء میں حیدرآباد شہر کے نزدیک ٹنڈو جام میں منعقد ہونے والے ایک اجلاس میں قائم کی گئی۔ یہ افراد مختلف مفادات کے نمائندے تھے لہٰذا ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تھے انہوں نے غالباً مختلف وجوہ کی بنا پر ہاریوں کی ایک اجتماعی عمل اختیار کرنے کے سلسلے میں مدد کی اور ان کو کمتر سماجی رتبے کا احساس دلایا۔ اس تنظیم کے بانی ارکان میں صرف ایک رکن ایسا تھا جو ایک ہاری کا بیٹا تھا۔ صرف دو رکن ایسے تھے جو بظاہر زراعت سے براہِ راست تعلق رکھتے تھے۔ باقی تمام اراکین میں شہری تاجر اور کالجوں کے استاد شامل تھے

صرف تین ارکان غیر مسلم تھے (ایک پارسی اور دو ہندو) مسلم ارکان میں سے چند لوگ تحریکِ خلافت میں شامل تھے۔ نظریاتی اعتبار سے وہ مختلف اسباب و علل کی

بنیاد پر آمادہ عمل ہوئے تھے، کچھ سامراج کے خلاف تھے کچھ زمینداروں کے خلاف تھے اور کچھ انسانی آزادی اور حقوق پر یقین رکھتے تھے۔ سندھ ہاری کمیٹی کی نئی تنظیم کے قیام میں ان میں سے اکثر افراد یہ سمجھ رہے تھے کہ اس تنظیم کے ذریعے وہ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرنے کے سلسلے میں برطانوی حکومت پر اپنا دباؤ بڑھا سکیں گے۔ سندھ ۱۹۲۰ء میں بمبئی کا ایک حصّہ بنا دیا گیا تھا۔ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کروانا مسلمانوں کے لئے یقیناً بہت اہم تھا جو سندھ میں واضح اکثریت کے حامل تھے لیکن بمبئی جیسے بڑے صوبے میں اقلیت بن کے رہ گئے تھے۔ اس گروہ کے ابتدائی مددگاروں میں چند نمایاں سماجی مصلح اور مخیّر حضرات شامل تھے۔

ابتدا میں سندھ ہاری کمیٹی نے عوام کے سامنے اپنے تین مقاصد پیش کئے تھے[۱] "ابواب" اور بیگار سے ہاریوں کو چھٹکارا دلوا کر بٹائی نظام کو بہتر بنانا (۲) اگر کسی ہاری نے ایک مخصوص مدت تک زمین کو کاشت کیا ہو تو ہاریوں کو زمین پر قبضے کی سہولت دلوانا اور (۳) ۱۹۳۲ء کے بعد لائیڈ بیراج کے علاقے میں "ہاراپ" عطیات کے طور پر سرکاری زمین ہاریوں کو الاٹ کروانا۔ یہ مطالبے ان معنوں میں محدود مطالبے تھے کہ ان کے ذریعے ہاریوں اور زمینداروں کے باہمی تعامل کی مروجہ صورتحال میں چند بہتر تبدیلیاں لانا ہی مقصود تھا۔ یہ مطالبے کسی بھی اعتبار سے انقلابی مطالبے نہیں تھے۔ ان مطالبوں کو آگے بڑھانے کے لئے جو نعرہ اپنایا گیا وہ "ہاری حقدار" تھا۔ پیداواری لگان کے نظام کی قانونی حیثیت یا زمینی ملکیّت کے زمیندارانہ ڈھانچے میں کوئی تبدیلی لانا زیر بحث نہیں آیا۔ اگرچہ یہ ایک نرم اور دھیمی ابتدا تھی لیکن مستقبل بعید میں اس کا مقصد یہ تھا کہ کسانوں کو مالکانہ حقوق دلوائے جائیں۔ سندھ ہاری کمیٹی کے چند رہنماؤں نے زمین کو قومی ملکیت میں لینے کا لفظی کھیل بھی کھیلا لیکن یہ بات صرف چوتھی دہائی میں اُبھر کر سامنے آئی[۲۴]

چونکہ حیدرآباد اور اس کے گرد و پیش میں واقع جاگیروں پر بے چینی کے واضح نشانات ابھرنے شروع ہو گئے تھے لہٰذا سندھ ہاری کمیٹی نے اسی علاقے میں ہاریوں اور چھوٹے مالکان

زمین کو اپنے اراکین میں شامل کرنے کی کوششوں پر توجہ مرکوز کی۔ گاؤں کی سطح پر رہنماؤں نے چھوٹے چھوٹے جلسے منعقد کئے سندھ ہاری کمیٹی کی رکنیت حاصل کرنے کی شرائط بہت سیدھی سادھی تھیں۔ اور کوئی بھی شخص جو زمینداری نظام کے خلاف کوئی شکایت رکھتا تھا وہ ایک آنے کی فیس دے کر تنظیم میں شامل ہو سکتا تھا۔ اس تنظیم نے ابتدائی دور میں مقدموں اور چھوٹے مالکانِ زمین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی اور یہی لوگ پہلے پہل اس تنظیم میں شامل ہوئے۔ چونکہ یہ لوگ ہاریوں کے مقابلے میں زیادہ احساسِ تحفظ سے مالامال تھے اور اپنی شکایات زیادہ کھل کر بیان کر سکتے تھے۔

تیسری دہائی کے اوائل اور وسط میں چند ایسے واقعات رونما ہوئے جنہوں نے سندھ ہاری کمیٹی کی قیادت اور مزاج میں اہم تبدیلیوں کو جنم دیا۔ اسی دور میں اس تنظیم نے ایک زیادہ متعین اور عہدداری ڈھانچہ مرتب کیا تاکہ تنظیم میں ہاریوں کی زیادہ سے زیادہ شرکت ممکن بنائی جائے۔ تیسری دہائی کے اوائل میں سندھ ہاری کمیٹی کے لیڈروں کو ایسے مواقع ملے جن کے ذریعے وہ بیک وقت حکومت اور زمینداروں پر دباؤ ڈالنے کے مختلف طریقے آزما سکتے تھے جاگیروں سے مقدموں کی بے دخلی کے بڑھتے ہوئے واقعات جو مقدموں کے ان مطالبات کا نتیجہ تھے کہ انہیں زمینوں پر وراثتی حقوق دیئے جائیں، حیدرآباد کے آس پاس ایسی فضا پیدا کرنے کا سبب بنے جس میں جاگیرداروں کے خلاف ہاری اور چھوٹے مالکانِ زمین مل کر جدوجہد میں شامل ہو گئے۔ لائڈ بیراج کے علاقے میں سرکاری زمینوں کی فروخت اور الاٹمنٹ نے اور اس تصور نے کہ ان زمینوں پر باہر سے آئے ہوئے آبادکار کاشتکاروں کی حیثیت سے آباد ہو رہے تھے، یہ مسئلہ کھڑا کر دیا کہ ہاریوں کو بھی اب عطیات ملنے چاہئیں اور حقوق کے ریکارڈ میں ان کے ناموں کو شامل کیا جانا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ آل انڈیا کسان سبھا جو ابھی نئی نئی قائم ہوئی تھی کے رہنماؤں اور کارکنوں نے سندھ ہاری کمیٹی کی حمایت شروع کر دی۔ اسی طرح آل انڈیا کانگریس پارٹی نے جدوجہد آزادی کے ایک نکتے

کے طور پر سندھ ہاری کمیٹی کی مضبوط بنیادوں پر حمایت کی۔

۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۵ء کے درمیان سندھ ہاری کمیٹی کی سرگرمیاں گاؤں کی سطح کے جلسوں اور حیدر آباد میں جاگیری زمینوں پر ہاریوں اور مقدموں کے چھوٹے گروہوں کے احتجاجی جلوسوں تک پھیل گئیں۔ انہی سرگرمیوں میں ایک سرگرمی یہ بھی شامل ہو گئی کہ بے دخل کئے گئے مقدموں کی طرف سے قانونی اقدامات کئے جائیں۔ سندھ ہاری کمیٹی کی طرف سے منظم کئے گئے اسی دباؤ کی وجہ سے مقدموں کو وراثتی حقوق مل گئے اور ان کو موروثی ہاریوں کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔ یہ سب کچھ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیان ہوا [۲۵]۔ اس کامیابی کی یقیناً بنیادی اور بڑی وجہ یہ تھیں کہ جاگیردار باقی تمام مالکان زمین بشمول زمین داروں سے کٹ کر رہ گئے چونکہ چھوٹے مالکان زمین اور مقدم مالیہ حکومت کو ادا کرتے تھے جبکہ جاگیردار اس سے مستثنا تھے۔ ہاریوں نے بالکل واضح اسباب کے تحت اس احتجاج کی حمایت کی دوسرا اہم اسباب یہ تھے کہ (الف) سندھ ہاری کمیٹی کے رہنماؤں کی ایک محدود تعداد نے اپنا وقت اور اپنے ذرائع سندھ ہاری کمیٹی کے لئے وقف کر دیئے اور (ب) جہاں ابتدائی سرگرمیاں شروع اور مرکوز کی گئیں تھیں وہ علاقہ اور وہ مقصد پھیلا ہوا ہونے کی بجائے محدود تھا۔

حیدر آباد کی کامیابیوں نے سندھ ہاری کمیٹی کو اپنی سرگرمیاں مزید پھیلانے کا حوصلہ دیا۔ اور بہت جلد اس کی سرگرمیاں حیدر آباد سے لے کر نواب شاہ سانگھڑ اور لاڑکانہ کے ضلعوں تک پھیل گئیں اس تنظیم کی سرگرمیوں کا یہ تیز پھیلاؤ راہنماؤں اور رکارکنوں کے ایک چھوٹے سے گروہ کی بے لوث خدمات کا نتیجہ تھا۔ یہ راہنما اور رکارکن ضلعی سطح پہ کام کر رہے تھے اور (الف) اپنے سامنے واضح مقاصد رکھتے تھے اور (ب) ہاریوں کو محدود لیکن شدید احتجاج کے لئے تیار کر سکتے تھے۔ پھیلاؤ کے ساتھ یہ ضرورت محسوس ہونے لگی کہ کسی مرکزی جگہ پہ تنظیم کا مرکز قائم کیا جائے۔ نتیجتاً سندھ ہاری کمیٹی کا مرکز ۱۹۳۶ء میں حیدر آباد میں منتقل

کردیا گیا۔ اور ایک ایسی عمارت میں قائم کیا گیا جو ایک مسلمان مال افسر نے بطور عطیہ دی تھی۔ اس مسلمان مال افسر کا نام حیدر بخش جتوئی تھا۔ اور مستقبل میں حیدر بخش جتوئی کو سندھ ہاری کمیٹی میں ایک مرکزی کردار ادا کرنا تھا۔ سندھ ہاری کمیٹی کی قیادت باہر کے لوگوں سے اندر کے لوگوں کو منتقل ہو گئی۔ کیونکہ خارجی میدان میں کام کرنے سے یہ حقیقت اُبھر کر سطح پر آگئی تھی کہ اب قیادت کے لئے دیہاتی راہنماؤں کی ضرورت ہے۔ اُسی اثنار میں سندھ ہاری کمیٹی کی صدارت ایک ہاری کے بیٹے عبدالقادر خان کے ہاتھوں میں آگئی۔ جس طرح کہ بعد میں آنے والے واقعات سے ظاہر ہوگا۔ نئی قیادت کے درمیان نیا انقلابی احساس بڑھ گیا تھا۔ کانگریس پارٹی کے ساتھ سندھ ہاری کمیٹی کے اتحاد نے جہاں اس تنظیم کو ایک سیاسی رنگ دے دیا۔ وہاں اس تنظیم کو یہ موقعہ بھی فراہم کیا۔ کہ وہ حکومت پر اپنے دباؤ میں اضافہ کر دے۔ اس صورتحال نے سندھ ہاری کمیٹی کی قیادت اور ڈھانچے میں ایک تقسیم بھی پیدا کر دی۔

استحکام کا مرحلہ

۱۹۳۶ء میں سندھ ایک صوبہ بن گیا۔ اس کے فوراً بعد ٹنڈو جام میں ایک بڑا سیاسی جلسہ ہوا۔ جو سندھ ہاری کمیٹی اور کانگریس نے مشترکہ طور پر منظم کیا تھا۔ اس جلسے کا مقصد یہ تھا کہ دونوں جماعتیں حکومت پر اپنا دباؤ بڑھانے کے لئے اپنی سرگرمیوں اور مقاصد کی وضاحت کر کے مستقبل کے لئے ایک لائحہ عمل تیار کریں۔ ایک دوسرا واقعہ جو سندھ ہاری کمیٹی کی تاریخ میں اب تک یقیناً سب سے نمایاں واقعہ تھا وہ ۱۹۴۳ء کے آغاز میں ایک کسان ریلی کا انعقاد تھا۔ سندھ ہاری کمیٹی نے ۲۰۰۰ سے ۳۰۰۰ ہاریوں پر مشتمل حیدرآباد شہر میں ایک جلوس منظم کیا اس ریلی میں زیادہ تر زور اُسی نکتے پر رہا کہ احتجاج کے عدم تشدد پر مبنی حکومت اور زمین داروں کے خلاف اظہار پر اکتفا کیا جائے۔ مطالبات ابھی تک محدود تھے اور بٹائی نظام اور ہاریوں کو مستقل مزارعاتی

حقوق دینے کے سلسلے میں تبدیلیاں کی جائیں ۔ یہ جلوس سندھ ہاری کمیٹی کی اس صلاحیت کا مؤثر اور متاثر کن اظہار تھا کہ یہ تنظیم ہاریوں کو بڑے پیمانے پر نہ صرف منظم کر سکتی ہے بلکہ اُن کو انتشار کا شکار ہونے سے بچا بھی سکتی ہے ۔ ایک ایسی حکومت کے لئے جو پہلے ہی آزادیٔ ہند کے بڑھتے ہوئے مطالبے کا سامنا کر رہی تھی ۔ یہ کسان ریلی ایک سنگین اشارہ بن کر سامنے آئی ۔ کیونکہ یہ اشارہ اُن لوگوں کی طرف سے ہوا تھا جو معاشرے میں سب سے خاموش اور مسکین سا طبقہ سمجھے جاتے تھے ۔

اس ریلی، گوٹھ کچہریوں، قانونی اقدامات (اگرچہ وہ محدود تھے) اور سیاسی مناظروں کی بازگشت سندھ اسمبلی تک پہنچ گئی اور سندھ اسمبلی میں ہاریوں کے مزارعاتی حقوق اور بٹائی کے مسائل پر بحثیں ہوئیں ۔ ان بحثوں کو مزید تقویت اُس مزارعاتی اصلاحی ایکٹ کے ذریعے ملی جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں منظور ہو چکا تھا ۔ ۱۹۴۳ء کے وسط میں حکومت نے مزارعاتی قانونی کمیٹی قائم کر دی جو ۱۶ ارکان پر مشتمل تھی ۔ ۲۶ے اس کمیٹی کے صرف ۴ ارکان سرکاری ملازم تھے اور باقی ارکان سندھ اسمبلی کے منتخب نمائندے تھے ۔

۱۹۴۳ء میں سندھ پر برطانوی قبضے کے بعد غالباً پہلی بار سرکاری سطح پر زمینداری نظام کے خلاف ہاریوں کی شکایات کو تسلیم کیا گیا تھا ۔ کمیٹی کا دائرہ کار حسب توقع بٹائی نظام اور ہاریوں کے مزارعاتی حقوق کے سوالوں تک محدود تھا ۔ کیا تمام ہاریوں کو مزارعاتی حقوق دے دیئے جانے چاہئیں ؟ یہ حقوق کیا ہوں ؟ کمیٹی نے اپنی سفارشات دو حصوں میں پیش کیں ۔ اولاً یہ کہ مزارعاتی حقوق ایک ہاری کو زمین کے چھوٹے سے ٹکڑے پر یعنی صرف ۴ ایکڑوں پر دیئے جائیں اور وہ بھی صرف اس شرط پر کہ اگر اُس ہاری نے زمین کا یہ ٹکڑا مسلسل ۸ برس تک کاشت کیا ہو ۔ ثانیاً یہ کہ لگان ادا کرنے کے لئے یہ چھوٹ قائم رکھی جائے کہ نقد رقم کی بجائے جنس کی صورت میں ادا کیا جائے ۔ ایک چھوٹی سی ترمیم یہ کی گئی کہ "ابواب"، جس کا تعین اُس وقت تک زمیندار کرتے تھے چند قانونی حدود کے

تحت آجائے۔ ان سفارشات پر دو شدید اختلافی نوٹ لکھے گئے۔ ایک نوٹ ایک ایسے ممبر نے لکھا جس کا شمار سندھ ہاری کمیٹی کے ممتاز راہنماؤں میں ہوتا تھا[۲۷] اس راہنما ممبر نے ۳ نکاتی مطالبے پیش کیے (ا) بٹائی نظام کا مکمل خاتمہ (ب) تمام ہاریوں کو غیر مشروط طور پر مزارعاتی حقوق دینا اور (ج) زمینداروں سے معاوضے پر زمینیں لے کر تمام زمینوں کو قومی ملکیت میں لینا۔ دوسرا نوٹ ایک ایسے ممبر نے لکھا جو ہاریوں کو عام مزارعاتی حقوق دینے کے بھی بالکل خلاف تھا۔ اور یہ حقوق اُن شرائط پر بھی نہیں دینا چاہتا تھا جو اکثریت نے منظور کی تھی۔

۱۹۴۵ء میں مزارعاتی قانونی کمیٹی کی سفارشات حکومت کو پیش کر دی گئیں لیکن کوئی عملی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ سندھ اور ہندوستان میں سیاسی صورتحال تیزی سے متحارب نقطہ ہائے نظر کی شکار ہو رہی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد برطانوی حکومت صرف ایک سوال پر سنجیدگی سے غور کر رہی تھی کہ ہندوستان کو کس طرح آزادی دی جائے۔ یہ حقیقت کہ کمیٹی نے ہاریوں کے حالات سے تعلق رکھنے والے مسائل پر غور کیا تھا واضح طور پر سندھ ہاری کمیٹی کی قوت کا اظہار کر رہی تھی۔ اپنا دباؤ بڑھانے کے لئے سندھ ہاری کمیٹی نے اپنی تنظیم سندھ کے علاقوں میں بڑے پیمانے پر وسیع کر دی ۱۹۴۵ء تک سندھ ہاری کمیٹی کی قیادت اُن مضبوط ہاتھوں میں آگئی جو اپنے سامنے صرف ہاریوں کی بہتری کا نصب العین رکھتے تھے اور جو مزارعاتی اصلاحات کے سلسلے میں بے عملی کے مظاہرے پر روز بروز زیادہ مضطرب ہوتے جا رہے تھے۔ حیدر بخش جتوئی نے ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے اپنی سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دیدیا تھا۔ اور وہ ۱۹۴۵ء میں سندھ ہاری کمیٹی کے ایک عملی اور صدائے احتجاج بلند کرنے والے رکن بن گئے تھے[۲۸]

"ہاری حقدار" کا پہلا نعرہ زیادہ انقلابی نعروں میں ضم ہو چکا تھا۔ یہ انقلابی نعرے "بے زمینوں کے لئے زمین" اور "جو کاشت کرے وہی فصل کھائے" تھے۔ یہ بظاہر انقلابی

نعرے اور انقلابیت اُس بے چینی اور اضطراب کی آئینہ دار تھی جو ہاریوں کی سرکاری سطح پر شکایات تسلیم ہونے کے باوجود محدود مقاصد کے حصول میں ناکامی کے سبب پیدا ہوا تھا بہرحال ۱۹۴۵ء کے آس پاس سندھ ہاری کمیٹی کی قیادت کے حلقوں میں کچھ اور بھی رونما ہو رہا تھا۔

ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح سندھ کی سیاسی فضا بھی بہت تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی اور ۱۹۴۰ء-۴۵ء کے درمیان آل انڈیا مسلم لیگ کے پرچم تلے تقسیم ہند کی تحریک میں بدل رہی تھی۔ اور یہ تحریک جس کا مقصد برطانوی ہند میں دو مختار ریاستوں کا قیام تھا برق رفتاری سے زور پکڑتی جا رہی تھی۔ پاکستان کے مطالبے نے جو اس بنیاد پر سامنے آرہا تھا کہ صوبہ سندھ جیسے ہندوستان کے مسلم اکثریتی علاقوں کو علیحدہ کر کے مسلمانوں کے لئے ایک نیا وطن قائم کیا جائے سندھ ہاری کمیٹی کے عناصر میں ایک نیا اور کئی اعتبار سے پیچیدہ عنصر داخل کر دیا۔ کانگریس کا مطالبہ متحدہ ہندوستان کی آزادی تھا اور مسلم لیگ کا مطالبہ پاکستان تھا۔ ان دو مطالبات کے درمیان واضح تفریق نے سندھ ہاری کمیٹی کے کارکنوں اور راہنماؤں کے لئے ایک پیچیدہ صورتحال پیدا کر دی۔ اب یوں تھا کہ سندھ ہاری کمیٹی کی قیادت پر مسلمان چھائے ہوئے تھے اور "معتدل" اور "انقلابی" عناصر کے درمیان ایک تفریق موجود تھی معتدل مزاج گروپ اُن افراد پر مشتمل تھا جو اب پاکستان کی حمایت کر رہے تھے اور انقلابی گروہ ایسے مسلمانوں اور ہندوؤں کا امتزاج تھا جو اپنے نقطۂ نظر کے اعتبار سے غیر مذہبی تھے اور ہندوستان کو متحد دیکھنا چاہتے تھے۔ مثلاً حیدر بخش جتوئی اور ان کے حامی تقسیم ہند کے مسئلے پر ہونے والے ریفرنڈم میں کانگریس کے ساتھ اپنا اتحاد قائم رکھنا چاہتے تھے جبکہ سندھ ہاری کمیٹی کے دوسرے مسلمان رہنما اُس وقت تک اپنی وفاداریاں پاکستان کے مطالبے سے وابستہ کر چکے تھے۔

سندھ میں بڑے اور چھوٹے مالکانِ زمین کی اکثریت پاکستان کے مطالبے کی حامی ہو چکی تھی یہ لوگ پاکستان کی حمایت اس لئے کر رہے تھے کہ اُن کے خیال میں نئی ریاست اُن کو ایسے مواقع فراہم کر دے گی جن کی مدد سے وہ ایک غیر ملکی حکومت اور اسکے تحت کام کرنے والی نوکر شاہی

کی مداخلت سے آزاد ہو کر اپنی سماجی اور سیاسی طاقت استعمال کر سکیں گے۔ ہندوؤں کے ترکِ وطن کے امکانات بھی جو تقسیم ہند کے بعد یقینی ہو چکے تھے پاکستان کی حمایت کے مقصد کو تقویت دینے میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ ہاریوں میں بھی ایک نئی اُمید کے آثار اُبھر رہے تھے۔ ہاریوں کو یقین دلایا گیا تھا کہ پاکستان کی نئی ریاست میں قرآن کے قوانین نافذ ہوں گے اور زمین پر کسانوں کی ملکیت ان قوانین کے تحت تسلیم کر لی جائے گی۔ زمینداروں اور مزارعوں کے مابین عارضی طور پر صدیوں کا تضاد بھی ختم ہو گیا تھا اور کسان آبادی میں پرانی اور قدیم خاندانی و قبائلی وفاداریاں دوبارہ جگا دی گئی تھیں ۲۹؎ مسلم لیگ بنیادی طور پر مسلمانوں کے اونچے طبقوں اور زمینداروں کی نمائندگی کر رہی تھی لیکن ایک علیحدہ مسلم مملکت کے قیام کے امکان نے تمام معاشی تفاوت ختم کر کے رکھ دیا تھا۔

۴۷-۱۹۴۵ء میں چند دوسرے نمایاں حالات نے بھی ایک شکل اختیار کرنی شروع کر دی تھی چونکہ قانونی مزارعاتی کمیٹی کی سفارشات حکومت نے سرد خانے میں پھینک دی تھی سندھ ہاری کمیٹی ہاریوں کی بے دخلی اور بٹائی کے حصے کی ناجائز تقسیم کے خلاف زیادہ تند رد عمل کا اظہار کرنے لگی تھی۔ احتجاجی جلسے زیادہ تعداد میں منعقد ہونے لگے اور سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ سندھ ہاری کمیٹی کے کارکنوں نے کھیتوں کی کل پیداوار کا وہ حصہ جو اُن کے نزدیک ہاریوں کا جائز حصہ تھا اپنے قبضے میں لے کر باقی حصہ زمینداروں کے لئے کھیتوں میں چھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ یہ عمل غالباً زمینداروں کی طاقت کے خلاف سب سے نمایاں عملی احتجاج تھا۔ اور اس کے سبب تشدد کے کئی واقعات وقوع پذیر ہوئے۔ بہر حال نواب شاہ اور سانگھڑ میں جہاں کے ضلعی افسر ہاریوں سے اپنی ہمدردیوں کے سبب جانے پہچانے جاتے تھے ایسے واقعات زیادہ عام اور کم تشدد آمیز تھے۔ حیدر بخش جتوئی نے "ہاری حقدار" کے نام سے ایک ہفت روزہ شائع کرنا شروع کر دیا تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے اور سندھ ہاری کمیٹی کے دوسرے رہنماؤں کے خیالات کے اظہار کا ایک اہم ذریعہ

بن گیا۔ اور اس ہفت روزہ میں ہاریوں اور اُن سے تعلق رکھنے والے دوسرے مسائل پر
سندھی اور انگریزی میں ان خیالات کا اظہار ہونا شروع ہو گیا۔[۳۰]

ہاریوں کا تحفظ کرنے والے کسی قانون کی عدم موجودگی اور ۴۷-۱۹۴۶ء میں سندھ
ہاری کمیٹی کے اقدامات کی بڑھتی ہوئی "انقلابیت" کے پس منظر میں ۱۹۴۷ء کے اوائل میں
حکومت نے ہاری تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی۔ اس بار کمیٹی کے لیے کسی مخصوص دائرہ کار کا تعین
نہیں کیا گیا بلکہ صرف یہ ہدایت کی گئی کہ وہ کمیٹی ہاریوں کی تمام مُضمر اور ظاہر تکالیف کا
جائزہ لے[۳۱] کمیٹی کے تینوں ارکان سرکاری افسر تھے۔ مارچ ۱۹۴۷ء اور جنوری ۱۹۴۸ء
کے درمیان، اپنی سفارشات مرتب کرتے ہوئے کمیٹی کے دو افسر ہمخیال ہو کر اکثریت بن گئے
اور ایک افسر اقلیت میں رہ گیا۔ دو افسروں کی اکثریت نے فیصلہ کیا کہ صرف وہ اقدامات
تجویز کیے جائیں گے جو سندھ کے موجودہ مزارعاتی نظام کو درہم برہم نہ کریں۔ واحد اقلیتی رکن
نے کمیٹی پر زور دیا کہ زمینداری نظام کے مکمل خاتمے پر غور کیا جائے اور اس کی جگہ زمین کو قومی
ملکیت بنانے کا نظام تجویز کیا جائے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس اقلیتی واحد رکن نے،
زمین کی قومی ملکیت کی بجائے، اپنی رپورٹ میں ہاریوں کو زمین کی ملکیت کے حقوق منتقل
کرنے کی سفارش کی[۳۲]

۱۹۴۸ء کے اواخر میں شائع ہونے والی اکثریتی رپورٹ نے بٹائی نظام میں چند
ترامیم کی سفارش کی اور ۱۹۴۳ء کی مزارعاتی قانونی کمیٹی کی اُس تجویز سے اختلاف کیا
جس کے مطابق سندھ کے تمام ہاریوں کو مزارعاتی حقوق دینے کی حمایت کی گئی تھی[۳۳]
ہاری تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشات مکمل ہو جانے کے بعد سندھ کی مسلم لیگی حکومت نے اکثریتی
رپورٹ تو شائع کر دی لیکن واحد اقلیتی رکن کے اختلافی نوٹ کو نظر انداز کر دیا۔ چنانچہ
یہ اختلافی خیالات شائع نہ ہو سکے۔ تین اہم واقعات کے سبب ۱۹۴۹ء میں یہ اختلافی
خیالات شائع کرنے پڑے۔ وہ اہم واقعات یہ تھے (۱) پاکستان کی نوزائیدہ مملکت میں

سندھ ہاری کمیٹی کی طرف سے سیاستدانوں پر زبردست دباؤ (۲) سندھ میں ایک ایسے وزیر اعلیٰ کا تقرر جو بظاہر زمینداری نظام سے کوئی وابستگی نہیں رکھتا تھا اور (۳) آل پاکستان مسلم لیگ کی اُس رپورٹ کی اشاعت جس میں پاکستان میں، زرعی اصلاحات کی سفارش کی گئی تھی۔[۳۴]

یہ حقیقت کہ سندھ ہاری کمیٹی ایک کسان (ہاری) تنظیم کی حیثیت سے مستحکم ہو چکی تھی، اس امر سے بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ ہاری تحقیقاتی کمیٹی کی اکثریتی رپورٹ میں بھی اسکا موثر وجود تسلیم کیا گیا تھا۔[۳۵] ۴۸ - ۱۹۴۷ء تک سندھ ہاری کمیٹی کا اثر و رسوخ کم و بیش تمام اضلاع میں پھیل چکا تھا۔ اگرچہ اس کی قوت کے حقیقی مراکز اب بھی حیدر آباد، نوابشاہ سانگھڑ اور لاڑکانہ کے اضلاع تھے۔ سندھ ہاری کمیٹی کے اراکین کی تعداد کے بارے میں مکمل اعداد و شمار معلوم نہیں ہیں۔ لیکن ایک اندازے کے مطابق ۴۸ - ۱۹۴۷ء میں اس کے اراکین کی تعداد ۱۰،۰۰۰ سے ۱۲،۰۰۰ کے درمیان تھی جو ۵۵ - ۱۹۵۴ء میں اپنے عروج پر پہنچ کر ۱۵،۰۰۰ سے ۱۶،۰۰۰ رہ گئی تھی[۳۶] سندھ ہاری کمیٹی کی مالی امداد، رکنیت کی فیس کے علاوہ، ہمدردوں کے رضاکارانہ چندوں سے بھی ہوتی تھی۔ لہٰذا، سندھ ہاری کمیٹی اپنے ڈھانچے کی ساخت اور ترتیب کے سبب، ایک بہت ہی موثر تنظیم بن چکی تھی۔ مندرجہ ذیل جدول کے مطابق ہر سطح پر، ایک کونسل (اسمبلی) اور ایگزیکیٹو کمیٹی (کابینہ) کے ساتھ، اس تنظیم کا ڈھانچہ چہار سطحی تھا۔

دیہہ کمیٹیوں کے وجود نے ہاریوں سے رابطے اور ان کی شرکت کو خاصا وسیع کر دیا تھا۔ گاؤں کی سطح پر گوٹھ کچہریوں کے ذریعے ہاریوں کی شرکت منظم کی جاتی تھی۔ یہ جلسے، ان اُمور کے لئے بھی پلیٹ فارم مہیا کرتے تھے (۱) سندھ ہاری کمیٹی کے کارکنوں اور رہنماؤں کی تقریریں (ب) مقامی زمینداروں کے خلاف طاقت کے مظاہرے اور (ج) ہاریوں کا اپنے اپنے زمینداروں سے مخصوص شکایت کا اظہار۔ ایسے بہت سے جلسوں میں زمینداروں کو بھی مدعو کیا جاتا تھا تاکہ وہ سندھ ہاری کمیٹی کے ارکان کے سامنے اپنی مشکلات بیان کر سکیں۔ ہاریوں اور زمینداروں کے مابین عدالتوں میں چلنے والے فوجداری اور غیر فوجداری بڑے

مقدمات کے فیصلے بھی کروائے جاتے تھے۔ اور راضی ناموں کے ذریعے پیسہ اور وقت بچانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ یہ جلسے اس مقصد کے لئے بھی استعمال ہوتے تھے کہ اُن مخصوص زمینداروں کے خلاف مخالفانہ مظاہرے منظم کئے جائیں جو یا تو سیاسی اعتبار سے مضبوط ہوتے تھے یا اپنے خیالات اور اعمال کے اعتبار سے ہاریوں کی مخالفت یا سندھ ہاری کمیٹی کی مخالفت کے سلسلے میں مشہور رہتے تھے۔ اگرچہ ان جلسوں میں ایسے مخصوص زمینداروں کے خلاف ہاری انتقام کے خوف سے اپنی شکایات کھل کر بیان نہیں کر سکتے تھے لیکن پھر بھی گاؤں کی سطح پر ایک ہاری تنظیم کے وجود اور مختلف وقفوں کے بعد ہونے والے گاؤں کے یہ جلسے ہاریوں کو زمینداروں کی بدسلوکی اور ہاریوں پر ناجائز دباؤ سے کچھ نہ کچھ تحفظ فراہم کرتے تھے۔ چوتھی دہائی کے اواخر اور پانچویں دہائی کے اوائل میں کئی مواقع پر گاؤں کی سطح کے یہ جلسے زمینداروں اور پولیس کے خلاف احتجاجی مظاہروں کی شکل اختیار کر گئے۔ جن میں تشدد کے واقعات قابلِ ذکر حد تک رونما ہونے لگے۔ یہ امر جزوی طور پر اُس اعتماد کا اظہار تھا جو سندھ ہاری کمیٹی کے رہنماؤں نے ہاریوں کی حمایت سے حاصل کر لیا تھا۔ یہ امر سندھ کی بدلتی ہوئی سیاست کا آئینہ دار بھی تھا۔ جس کا تذکرہ آگے چل کر آئے گا۔ اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی تخلیق کے بعد سندھ ہاری کمیٹی کے سامنے اہم ترین مقصد یہی تھا کہ مزارعانی حقوق کے سلسلے میں ہاریوں کی حالت بہتر بنائی جائے۔ نتیجتاً سندھ ہاری کمیٹی کے راہنماؤں نے سندھ اسمبلی میں ایک مزارعانی قانون منظور کروانے کی مہم شروع کر دی ۱۹۴۹ء کے آخر میں انہوں نے ایک مزارعانی بل مرتب کیا جس کے اہم نکات یہ تھے کہ (الف) جنس کی صورت میں لگان کی ادائیگی اور دوا ابواب کا خاتمہ" (ب) اُن زمینوں پر جو ہاری کاشت کرتے تھے۔ ہاریوں کے لئے مستقل مزارعانی حقوق کا مطالبہ جن میں کسی مخصوص مدت کا تعین نہ کیا گیا ہو۔[۳۷] اُدھر سندھ میں حکمران مسلم لیگ کی قیادت اُن لوگوں کے ہاتھوں میں واپس جا چکی تھی جو نام نہاد زمینداری حقوق قائم رکھنے کے حامی تھے اور اسکے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔

۱۹۵۰ء کے اوائل میں مزارعاتی حقوق پر جو بحث چلی اُس کے نتیجے میں زمینداروں اور سندھ ہاری کمیٹی نے اپنے اپنے طور پر فضا ہموار کرنی شروع کردی اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ ایک ایسے مزارعاتی بل کی سندھ اسمبلی میں اکثریت رکھنے والے زمیندار مخالفت کریں گے جو ہاریوں کے حق میں جاتا ہو، سندھ ہاری کمیٹی کے راہنماؤں نے فیصلہ کیا کہ مجوزہ بل پاس ہونے کے موقع پر کراچی میں ایک کسان مظاہرہ منظم کیا جائے۔ سندھ اسمبلی کی طرف تقریباً ۱۲۰۰۰ سے ۱۵۰۰۰ تک ہاریوں کا مارچ جو سب کے سب اندرونِ سندھ سے آئے تھے اپنی جگہ قوت کا ایک بہت ہی نمایاں مظاہرہ تھا۔ اس مظاہرے کی اہم ترین خصوصیت یہ تھی کہ اگرچہ یہ ہاری ۲۴ گھنٹے تک سندھ اسمبلی کی عمارت کے سامنے جمع رہے اور تشدد کا کوئی واقعہ پیش نہ آیا یہ اُن کے راہنماؤں کی سیاسی بصیرت کا ثبوت تھا۔ چونکہ کراچی پاکستان کا دارالحکومت بھی تھا اس لئے اس شہر میں ہاریوں کی اتنی بڑی تعداد کی آمد نے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے لیے خاصی پریشان کن صورتحال پیدا کردی۔ تشدد رونما ہونے کے خطرے کے پیش نظر فوج کی ایک بٹالین بھی پولیس کی مدد کے لئے طلب کر لی گئی۔ اسمبلی کے ارکان کا ہاریوں نے جو یہ گھیراؤ کیا تھا اُس نے اپنا اثر دکھایا اور بل پاس ہوگیا۔ بل پاس ہونے کے باوجود اصل بل میں جو ترامیم شامل کردی گئیں تھیں۔ سندھ ہاری کمیٹی کے راہنما اُن سے مطمئن نہ تھے، بہرحال اب تک ہاریوں کے حقوق کی جدوجہد میں یہ سندھ ہاری کمیٹی کا بہت اہم کارنامہ تھا۔

۱۹۵۰ء کا مزارعاتی بل، بنیادی طور پر ایک ہاری کو جس نے ۴ ایکڑ زمین پر مسلسل ۳ برس تک کاشت کی ہو۔ مستقل مزارعاتی حقوق دیتا تھا۔ اب زمیندار کے لئے یہ لازم تھا کہ وہ چند واضح شرائط پوری کرنے کے بعد ہی ہاری کو بیدخل کرسکتا تھا اور اُن میں سے ایک اہم شرط یہ تھی کہ زمیندار نے ہاری کو ایک سال کا نوٹس دیا ہو۔[۳۸]

بہرحال اس بل ذریعے بٹائی کے غیر منصفانہ نظام کی شکل تبدیل نہیں ہوئی تھی۔

اسی ایکٹ کے نفاذ کے سلسلے میں ہاریوں کو دو اہم ترین مسائل کا سامنا تھا (الف) نئے ایکٹ کے نتیجے میں ہونے والی تمام بیدخلیوں کی روک تھام اور (ب) اپنے سکونتی اور مزارعاتی حق کی مالیاتی افسروں کے ریکارڈ میں شمولیت۔ سرکاری افسر اور سرکاری نظام بنیادی طور پر بالواسطہ یا بلاواسطہ زمینداروں کے زیر اثر تھا۔ بہرحال سندھ ہاری کمیٹی کو پہلی بار یہ موقع ملا کہ وہ زمینداروں پر سیاسی دباؤ کے ساتھ ساتھ قانونی اقدام بھی کر سکے۔ درحقیقت پانچویں دہائی کے شروع میں سندھ ہاری کمیٹی ایک جماعت کی حیثیت سے خصوصاً ہاریوں، زمینداروں اور حکومت کے مابین کھڑے ہونے والے جھگڑوں کے سلسلے میں ایک مصالحت کنندہ جماعت کی حیثیت سے تسلیم کی جا چکی تھی۔

سندھ ہاری کمیٹی کے راہنماؤں نے جو اس دور کو بدترین دور سمجھتے تھے ۱۹۵۲ء کے شروع میں سندھ کے گورنر کے سامنے ۱۹۵۰ء کے مزارعاتی ایکٹ میں مخصوص ترامیم کی تجویز کیساتھ ایک یادداشت پیش کی۔ اس یادداشت میں انہوں نے اس نکتے پر زور دیا کہ سندھ کے ۵ لاکھ ہاریوں میں سے ۱۰۰ سے زیادہ ہاریوں کے نام حقوق کے ریکارڈ میں شامل نہیں کئے گئے۔[۳۹] اس یادداشت میں سندھ ہاری کمیٹی کے اس عزم کا اعادہ بھی کیا گیا کہ وہ سندھ میں زمینداری اور جاگیرداری کے مکمل خاتمے کے سوال پر انتخابات میں حصہ لیں گے۔ اگرچہ زمینداری کا مکمل خاتمہ سندھ ہاری کمیٹی کا فوری مقصد ہونے کی بجائے مستقبل بعید کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ زمینداروں کے خلاف جدوجہد میں چھوٹے مالکان زمین کی حمایت بھی حاصل کی جائے۔

۱۹۵۰ء کے مزارعاتی ایکٹ کے نفاذ کو زمینداروں کی سیاسی طاقت نے روک دیا تھا۔ لیکن سندھ ہاری کمیٹی کے راہنماؤں نے لاڑکانہ، نواب شاہ اور حیدرآباد کے جلوسوں کے ذریعے زمینداروں اور حکومت سے ٹکر لے رکھی۔ اس کے نتیجے میں چند راہنماؤں اور کارکنوں کو قید و بند کی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔[۴۰] سندھ ہاری کمیٹی کے کارکنوں کیطرف

سے پیداوار میں سے ہاریوں کا حصہ یکطرفہ طور پر تقسیم کرنے کا عمل بڑھتا چلا گیا۔ اور اتنا عام ہو گیا کہ پولیس کی مداخلت اور تشدد کے واقعات اکثر و بیشتر رونما ہونے لگے۔

سندھ ہاری کمیٹی کی طرف سے پیش کردہ یادداشت پر حکومت نے کوئی قدم نہ اٹھایا لیکن ۱۹۵۵ء کے آغاز میں حکومتِ سندھ کے ایک انتظامی حکم کے تحت تمام جاگیریں ختم کر دی گئیں۔ بظاہر یہ حکم سندھ ہاری کمیٹی کے لیے حکومت کی طرف سے ایک رعایت کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن اس حکم سے مالکان کی بہت ہی کم تعداد اور سندھ میں زمینداروں کے زیرِ قبضہ بہت ہی کم رقبے پر اثرات مرتب ہوئے تھے[۱۴]۔ اس حکم کو سندھ ہائی کورٹ میں چیلنج کر دیا گیا۔ عدالت نے چیلنج کے حق میں فیصلہ دیا۔ اور اپنے فیصلے میں انتظامی حکم کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ یہ حقیقت کہ یہ حکم ایک مردہ گھوڑے کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ سندھ میں زمینداروں کی طاقت کی آئینہ دار تھی۔ تقریباً اسی عرصے میں قومی سطح پر رونما ہونے والے سیاسی واقعات نے اتنی بڑی سطح پر اتنے تضادات کو روشناس کروانا شروع کر دیا جن کی وجہ سے بعد میں سندھ ہاری کمیٹی کے راہنماؤں کی قوت زائل ہونے لگی اور سندھ ہاری کمیٹی کی سمت تبدیل ہو گئی۔ اب ہمارا تجزیہ انہی واقعات کو زیرِ غور لائے گا۔

انحطاط کا مرحلہ

ہندوستان کی تقسیم کے مضمرات میں سب سے اہم یہ تھا کہ پاکستان اور بھارت کی نئی مملکتوں کے مابین نقل آبادی کا عمل شروع ہو گیا اور لاکھوں افراد اُدھر سے اِدھر اور اِدھر سے اُدھر چلے گئے۔ اب حکومتِ پاکستان کے سامنے تمام سطحوں پر سب سے بڑا مسئلہ اور سب سے بڑی ترجیح یہ ہو گئی ۰ ار لاکھ سے زائد مسلمان مہاجرین کی آبادکاری کا کوئی بندوبست کیا جائے۔ سندھ سے ہندو آبادی کا اخراج اور مسلمانوں کی آمد نے متروکہ زمینوں کا مسئلہ پیدا کر دیا۔ یہ تمام زمین جو تقریباً ۲،۵ ملین ایکڑ پر مشتمل تھی اور جس کے مالک جانے والے ہندو تھے متروکہ جائداد قرار دے دی گئی۔ اور اس کو مسلمان مہاجرین اور مقامی ہاریوں میں نصف، نصف کی بنیاد پر تقسیم کرنے کا

فیصلہ کیا گیا ۴۲؎ ہندوؤں کے جانے کے بعد وہ ضبط شدہ غیر مزروعہ زمینیں جو لائنڈ بیراج کے رقبے میں واقع تھیں ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی دوسری زمینوں کی طرح متروکہ جائداد قرار دے دی گئیں پانچویں دہائی کے وسط تک ۱.۶ ملین ایکڑ متروکہ زمین ہاریوں اور مہاجروں میں تقسیم کردی گئی تھی ۴۳؎ بہرحال زمینوں پر مہاجروں کی آبادکاری تنازعات کا سبب بن گئی چونکہ (الف) ہاریوں کی بیدخلیوں کے واقعات بڑھ گئے تھے (ب) وہ زمین جو سندھ ہاری کمیٹی کے راہنماؤں کے خیال میں ہاریوں کو الاٹ کی جانی چاہئے تھیں اور جن کو متروکہ جائداد قرار نہیں دینا چاہئے تھا۔ مہاجروں میں تقسیم کردی گئیں۔ اور (ج) مہاجر آبادکار اکثر و بیشتر غیر حاضر، ہندو زمینداروں کی جگہ لینے اور مقامی زمینداروں کے ساتھ شامل ہونے لگے ۴۴؎ پھر ۱۹۵۷ء میں وفاقی حکومت نے ہاریوں کو الاٹ کی گئی تمام زمینوں کی الاٹمنٹ منسوخ کردی۔ اور اُن مہاجروں کی الاٹمنٹ بھی منسوخ کردی گئی جو ہندوستان میں کاشتکار یا زمیندار نہیں رہے تھے ۴۵؎ حکومت کے اس اقدام کو سندھ ہاری کمیٹی نے ہاریوں کے خلاف سرکاری اقدام سمجھا۔ نتیجتاً سندھ ہاری کمیٹی کے راہنما زیادہ سے زیادہ سیاست میں ملوث ہوتے چلے گئے اور اب اپنے خیال میں انہیں "اجنبیوں" کا سامنا کرنا پڑا جو اُن کے نزدیک زمین پر ہاریوں کے حقوق غصب کرنے والے نئے لوگ تھے۔

پانچویں دہائی کا تقریباً اتنا ہی اہم واقعہ، پاکستان کے چند سیاستدانوں کی جانب سے چار صوبوں سرحد، بلوچستان، پنجاب اور سندھ کو باہم مدغم کرکے "ون یونٹ" قائم کرنے کا اقدام تھا۔ سندھ کے کچھ افراد نے اس اقدام کو سندھ پر پنجاب کا تسلط جمانے کا منصوبہ سمجھا، سندھ ہاری کمیٹی کی قیادت اس نقطۂ نظر پر پوری طرح متفق تھی۔ پنجابی تسلّط کے اس خوف کو زائل کرنے کے لئے چند سندھی رہنماؤں نے، قومی رہنماؤں کے ساتھ مل کر سرکاری زمینوں پر ہاریوں کے مکمل حق کی حمایت میں بیانات دیئے ان میں سے ۵۰۰۰۰۰ ابھی تک لائنڈ بیراج کے علاقے میں تھے اور باقی گدو بیراج اور کوٹری کے نئے زیر کاشت آنے

والے علاقوں میں ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء میں صوبہ سندھ "ون یونٹ" میں ضم کر دیا گیا اور اسکے ساتھ ہی وہ پورا نظام جو فیصلے کرنے کا مجاز تھا، لاہور (پنجاب) منتقل ہو گیا۔ ون یونٹ کا مسئلہ سندھ ہاری کمیٹی کے رہنماؤں کے لئے اتنی اہمیت اختیار کر گیا کہ ہاریوں کے مزارعانی حقوق کے مسئلے سے بھی ماورا ہو گیا۔ ہاریوں اور زمینداروں کے ابتدائی تضادات پر دوسرے تضادات کے مجموعے نے واضح اہمیت اختیار کر لی۔ سندھ ہاری کمیٹی کے رہنماؤں کے خیال میں سندھ میں مہاجروں کی آبادکاری نے زمینداروں کے خلاف ہاریوں کی حیثیت مزید کمزور کر دی، اُن کے خیال میں سندھ میں مہاجروں کی آبادکاری نے زمینداروں کے خلاف ہاریوں کی حیثیت مزید کمزور کر دی۔ اُن کے خیال میں کوٹری بیراج کے علاقے میں (اور بعد میں گدو بیراج کے علاقے میں) سرکاری اور نیلام کردہ زمینوں پر فوج سے تعلق رکھنے والے اور دوسرے غیر علاقائی لوگوں کی آبادکاری سے ہاریوں اور چھوٹے مالکان زمین کا موقف اور زیادہ کمزور پڑ گیا۔

۱۹۵۷ء میں ہاریوں کو الاٹ کی گئی زمینوں کی الاٹمنٹ کی تنسیخ کے بعد، سندھ ہاری کمیٹی نے سندھ کے چند علاقوں میں احتجاجی جلسے منعقد کئے۔ سب سے نمایاں واقعہ محراب پور میں سول نافرمانی کا مظاہرہ تھا جسکے نتیجے میں ۱۰۰ سے زیادہ ہاری سندھ ہاری کمیٹی کے رہنماؤں کے ساتھ گرفتار کر لئے گئے۔ اس کے بعد سندھ ہاری کمیٹی نے الاٹمنٹوں کی تنسیخ سے جنم لینے والی ہاریوں کی حالتِ زار کی طرف توجہ مبذول کروانے کے لئے کراچی میں ایک مظاہرہ منظم کیا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی سندھ ہاری کمیٹی کے رہنماؤں کی اُس وقت کے صدر پاکستان سے ملاقات تھی۔ اگرچہ ان سرگرمیوں سے ہاریوں کی منسوخ الاٹمنٹیں تو بحال نہ ہو سکیں البتہ سندھ ہاری کمیٹی کے رہنما ۱۰۰۰ ہاری خاندانوں کے لئے کوٹری بیراج کے علاقے میں ۱۲/۴ ایکڑ فی خاندان کے حساب سے زمینیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ سندھ ہاری کمیٹی کی نچلی سطح کی تنظیم نے "ہراپ"، زمینوں کی بحق سرکار ضبطی اور غیر علاقائی

افراد کیطرف سے ہاریوں کی بیدخلیوں کے سلسلے میں سرگرم مداخلت کی۔ ایسے کئی جھگڑوں میں سندھ ہاری کمیٹی کی بروقت مداخلت نے کئی معاملات کو عدالتوں میں جانے سے بچا لیا۔

سندھ کو ون یونٹ میں شامل کرنے، ہاریوں کی الاٹمنٹوں کی تنسیخ، متروکہ اور سرکاری زمینوں پر غیر علاقائی لوگوں کی آبادکاری کے بعد سندھ ہاری کمیٹی کے رہنماؤں نے اپنا اور تنظیم کا وقت زیادہ وسیع سیاسی معاملات میں صرف کرنا شروع کر دیا۔ حالانکہ ایک علاقائی تنظیم کی حیثیت سے سندھ ہاری کمیٹی ان وسیع سیاسی معاملات پر مشکل اثر انداز ہو سکتی تھی۔ پانچویں دہائی کے وسط میں اُن کا نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ اتحاد جو بہت کم عرصے تک قائم رہا اس حقیقت کی پوری غمازی کر رہا تھا کہ وہ علاقائی خودمختاری کے سلسلے میں کتنے زیادہ حساس ہو چکے تھے۔ اُس وقت تک حیدر بخش جتوئی نے عبدالقادر خان جیسے اہم رہنما کو شکست دے دی تھی، سندھ ہاری کمیٹی کی صدارت کے لئے کبھی کوئی انتخابات نہیں ہوئے۔ یہ وہ عہد عروج تھا جس میں حیدر بخش جتوئی نے ایک رہنما کی حیثیت سے اپنی "برتر" صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا تھا۔

یہ بات بلاخوف و خطر کہی جا سکتی ہے کہ تین انواع کی قوتوں نے سندھ ہاری کمیٹی کے مستقبل پر ایک ہاری تحریک کی حیثیت سے ناقابل اصلاح اثرات مرتب کئے۔ اوّلاً: سیاست میں بہت تیزی سے ملوث ہونا اور نتیجتاً قومی سیاست میں بہت گہرائیوں تک دھنس جانا، اسکا سبب تضادات کی دوسری نوع کا جنم اور اُسکا بڑھتا ہوا دباؤ تھا۔ اس صورتحال نے کسان تحریک کی حیثیت سے سندھ ہاری کمیٹی کے ڈھانچے کو کمزور کرنا شروع کر دیا۔ ثانیاً زمینوں پر غیر علاقائی افراد کی بہت بڑی تعداد کی آبادکاری نے مقامی زمینداروں کے ہاتھ مضبوط کر دیئے۔ زراعت کے تجارتی رخ اختیار کر لینے اور زمین پر مختلف العناصر مفادات کے بڑھا دینے بھی سندھ ہاری کمیٹی کے مقاصد پر ضرب لگائی آخری بات یہ کہ سندھ ہاری کمیٹی قیادت ایک مرد آہن کے ہاتھوں میں مرکوز ہو گئی جس نے اپنے دم خم اور بے لوثی کی بنا پر اپنے اردگرد ایسے شیدائیوں کی تعداد

جمع کرلی جو اپنے رہنما کیطرح ہاریوں کی نجات کے مقصد میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے ممکن ہے کہ حیدر بخش جتوئی پورے سندھ کے نصب العین میں اپنی بڑھتی ہوئی دلچسپی کے سبب پُر کشش شخصیت بن گئے ہوں۔

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں پاکستان مارشل لا کی گرفت میں آگیا اور اس کے ساتھ ہی تمام سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کردی گئی۔ سندھ ہاری کمیٹی کے رہنماؤں اور کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا اگرچہ اُن کی گرفتاری کی مدت زیادہ نہیں تھی اور انہیں جلد ہی رہائی نصیب ہوگئی۔ دوسرے سیاسی گروہوں کی طرح سندھ ہاری کمیٹی کی سرگرمیاں بھی ممنوع قرار دے دی گئیں۔ سندھ ہاری کمیٹی کی تنظیم میں یہ وقفہ اس کی زندگی کا اہم موڑ ثابت ہوا۔ جب ۱۹۵۹ء میں مارشل لا حکومت نے مغربی پاکستان میں اپنی زرعی اصلاحات نافذ کیں تو سندھ ہاری کمیٹی معطل تھی ان زرعی اصلاحات کے تحت جاگیریں ختم کردی گئیں۔ انفرادی ملکیت زمین کی حد مقرر کردی گئی اور عمومی اعتبار سے مزارعوں کی حیثیت مستحکم ہوگئی اس کے باوجود ہاریوں کو مستقل حقوق نہیں دیئے گئے حالانکہ ۱۹۵۰ء کا سندھ مزارعانی ایکٹ اسی مقصد کے لئے بنایا گیا تھا۔ اور اس کے تحت یہ حقوق خواہ کاغذ پر ہی سہی تسلیم کئے گئے تھے۔ اسی طرح ٹانی نظام میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ مارشل لا حکومت نے ابتدا میں اپنا جو سحر سا بنا قائم کیا تھا اُس کے زیر اثر ان اصلاحات کو صحیح جانب صحیح قدم سمجھا گیا۔

بہر حال اس دوران سندھ ہاری کمیٹی بڑی حد تک غیر منظم رہی اور اسکے رہنما علاقائی خود مختاری کے مسئلے میں مصروف رہے اور ہاریوں اور چھوٹے مالکان کے مفادات کی نمائندگی پس منظر میں چلی گئی۔ الزام لگایا جاتا ہے کہ حاصل شدہ زمینوں کی تقسیم کے مرحلے پر حکومت نے سندھ ہاری کمیٹی کے بعض ارکان کو غیر مؤثر کرنے کیلئے زمینیں الاٹ کیں۔ گو کہ ان الزامات کی توثیق کا کوئی باضابطہ طریقہ موجود نہیں ہے یہ بات تقریباً ہر تنظیم کیلئے کہی جاسکتی ہے کہ اس میں ایسے افراد ہوسکتے ہیں جو اس قسم کے مواقع سے فائدہ اٹھانے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں۔ بہر صورت ۱۹۶۲ء کے بعد جبکہ حیدر بخش جتوئی جیل میں تھے، تحریک میں

یکسوئی کو نقصان پہنچا۔

پاکستان پر ایوب کا تسلط ۱۹۶۵ء کی ہندوستان پاکستان جنگ کے بعد کمزور پڑنا شروع ہو گیا۔ ایوب کے مخالفین نے انہیں اقتدار سے نکالنے کی تحریک شروع کر دی۔ ایوب کے انہیں مخالفین میں وہ عناصر بھی شامل تھے جو ون یونٹ کے خاتمے کا مطالبہ کرتے آئے تھے۔ سندھ میں علاقائی خود مختاری کا مسئلہ اکثر لیڈروں کے نزدیک واحد مسئلہ تھا۔ ان کا نعرہ 'سندھ' سندھیوں کیلئے تھا۔ حیدر بخش جتوئی کے نزدیک سندھی عموماً اور سندھی ہاری خصوصاً مظلوم لوگ تھے۔ یہ وہ مقصد تھا جس کیلئے انہوں نے اپنی بیشتر توانائیاں صرف کیں۔ خواہ وہ جیل میں ہوتے یا جیل سے باہر ہوتے۔ انہوں نے پمفلٹ لکھے جن میں زمینوں پر عائد ہونے والے ٹیکس سے لیکر سرکاری زمینوں کے الاٹمنٹ تک کے مسائل کا احاطہ کیا جاتا تھا۔ مگر ان کا بنیادی خیال یہ ہوتا تھا کہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی پالیسیوں کا مقصد سندھیوں کے ساتھ امتیازی سلوک کرنا تھا۔ اسی دور میں حیدر بخش جتوئی کے بعض پیروکاروں نے حکومت کی جانب سے علاقائی خود مختاری کے مطالبے کو طاقت کے زور پر کچلنے کی کوشش کے رد عمل میں خود بھی تشدد کا راستہ اختیار کیا۔ ۱۹۶۷ء میں جیل سے رہائی کے بعد حیدر بخش جتوئی نے حیدرآباد میں سندھ ہاری کمیٹی کے ایک اجلاس کی صدارت کی جس میں زرعی اصلاحات سے لیکر ون یونٹ کے خاتمے تک جیسے امور پر قراردادیں منظور کی گئیں۔

ایوب خان کے خلاف حزب اختلاف کی تحریک کے نتیجے میں مارچ ۱۹۶۹ء میں دوسرا مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ ون یونٹ توڑ دیا گیا۔ سندھ دوسرے سابقہ صوبوں کی طرح ایک مرتبہ پھر صوبے کا درجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن اس مرحلے تک پہنچتے پہنچتے پاکستان کی سیاست میں بنیادی تبدیلی آچکی تھی۔ ایک پاپولر پارٹی (پاکستان پیپلز پارٹی) مغربی پاکستان میں ایک مضبوط پارٹی کی حیثیت سے ابھر چکی تھی۔ اور اس نے دیہی اور شہری علاقوں کے غریب عوام کیلئے روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ دیا تھا۔ گو کہ ون یونٹ ٹوٹ چکا تھا مگر ہاریوں کے حقوق کا مسئلہ ہنوز حل طلب تھا۔ لہذا پیپلز پارٹی اور اس کے لیڈر (جو کہ سندھی تھے) کی مقبولیت نے سندھ ہاری کمیٹی کے بہت سے لیڈروں اور کارکنوں کو متاثر کیا اور وہ اس میں شامل ہو گئے۔ گو کہ سندھ ہاری کمیٹی کے کچھ لیڈر اس سے پہلے دوسری جماعتوں میں بھی شامل ہو چکے تھے۔ مگر وہ لیڈر جو پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے انہوں نے

یہ اس توقع میں کیا کہ اس طرح زمیندار اور مزارع کا تضاد حل کرنے میں انہیں مدد ملیگی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ سندھ ہاری کمیٹی برائے نام رہ گئی۔ ۱۹۶۰ء کے وسط میں حیدر بخش جتوئی کے انتقال کے ساتھ یہ اپنے انجام کو پہنچی۔ ہاریوں کی نجات کا نامکمل کام اب ایک ایسی تنظیم کے کاندھوں پر تھا جسکا ڈھانچہ معاشرے میں وسیع تر سیاسی مطابقت کے ردعمل کے طور پر کمزور پڑتا جا رہا تھا۔

۱۹۷۱ء میں پاکستان کے ٹوٹنے کے بعد پیپلز پارٹی باقی ماندہ ملک میں برسر اقتدار آئی۔ اقتدار سنبھالنے کے بعد اس نے ان اصلاحات کا اعلان شروع کیا جنکا اس نے وعدہ کیا تھا۔ مارچ ۱۹۷۲ء میں زمینوں سے متعلق اصلاحات کیلئے قانون جاری ہوا۔ ان اقدامات کا مقصد زمین کی انفرادی حد ملکیت کو کم کرنا، ہاریوں کو مستقل حقوق دینا اور ابواب اور بیگار کے نظام کو غیر قانونی قرار دینا تھا۔ ان اعلانات نے ہاریوں کو خوش آئند توقعات میں مبتلا کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی زمیندار خدشات میں مبتلا ہو گئے۔ لیکن کیونکہ بہت سے زمیندار پہلے ہی غریبوں کی ہمدردی کا دعویٰ کرتے ہوئے پیپلز پارٹی میں شامل ہو چکے تھے، مذکورہ اصلاحات صرف ان زمینداروں کیلئے باعث اضطراب تھیں جو پیپلز پارٹی میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ نیز کیونکہ سندھ ہاری کمیٹی ایک برسر میدان تنظیم کی حیثیت سے غیر مؤثر ہو چکی تھی لہٰذا اکثر زمیندار اس قابل ہو گئے کہ ریاستی بیوروکریسی کے تعاون سے اپنے مفادات کو بچا جائیں۔

ایک کسان تحریک کی حیثیت سے سندھ ہاری کمیٹی کا عملی زور تو شاید ۱۹۵۰ء کے عشرے کے آخری برسوں ہی میں ٹوٹ گیا تھا، جو تھوڑا بہت اثر باقی بچا تھا وہ پیپلز پارٹی کی حکومت نے دھمکیوں، جیلوں اور رشوت کے ذریعے ختم کر دیا، یہ بات قابل ذکر ہے کہ پیپلز پارٹی سندھ میں وہ پہلی پارٹی تھی جس نے بے زمین افراد کے لئے زمین کا وعدہ کیا تھا۔ لہٰذا ہاری ایک ایسی حکومت کے رحم و کرم پر تھے جسکو خود انہوں نے منتخب کیا تھا۔ اب کسی ایسی تنظیم کی گنجائش موجود نہیں تھی جو ہاریوں اور انکی اپنی حکومت کے درمیان سودے کار کا کردار ادا کرتی۔ ایک اور اہم بات اس دور میں یہ ہوئی کہ سندھ ہاری کمیٹی کے کچھ لیڈر اور کارکن سیاسی عمل سے الگ ہو کر جیئے سندھ نامی تحریک میں شامل ہو گئے۔

نوٹ :- یہ مضمون ۱۹۷۷ء میں لکھا گیا اور اس میں گزشتہ آٹھ سالوں میں ہاری تحریک کی نشوونما کا ذکر شامل نہیں ہے۔ آئندہ شمارے میں ہم اس دور میں سندھ ہاری کمیٹی کی جدوجہد پر روشنی ڈالیں گے۔ (ادارہ)

NOTES AND REFERENCES

1. E.J.Hobsbawn, "Peasants and Politics", Journal of Peasant Studies,1 October 1973

2. Yu.G.Alexandrov, "The peasant movements of developing countries in Asia and North Africa

3. B.H.Baden,Powell, The Land Systems of British In
Vol. III, Book 4, Oxford, Claren don Press,1892.

4. L. Natarajan, Peasant Uprisings in India 1850-19
Bombay, People's Publishing House,1953,pp.7-12.

5. B.H. Baden, Powell, op.cit., pp.331-32

6. L. Natarajan, op.cit., pp.15.

۷۔ یہ حقوق مقدموں کو صرف اسی وقت مل سکے جب ۱۹۳۵-۳۶ء میں سندھ ہاری کمیٹی نے اس کے لئے کامیاب تحریک چلائی۔

۸۔ گو کہ آغاز میں سندھ میں زمیندار اور ہاری سب مسلمان ہوتے تھے لیکن بعد ازاں انتقالِ ملکیت کے عمل کے نتیجے میں جس کا سبب قرضوں اور پٹہ داری کا نظام تھا، زمین کی ملکیت ان لوگوں کے پاس آگئی جو ہندو تھے۔ چنانچہ زمین کا مالک ہندو طبقہ پیدا ہو گیا جو ہاری جدوجہد میں ایک اہم عنصر تھا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۹۲۷ء تک سندھ کی کل زمین کا تیس فیصد ہندوؤں کے ہاتھوں میں جا چکا تھا۔ اس سلسلے میں ملاحظہ ہو۔
Haider Bux Jatoi, Lands in Sind-Who should own them, Hyderabad, July1957.

9. Govt. of Sind, Hari Enquiry Committee, pp.5

10. Pakistan Muslim League, Report of the Agrarian Committee, Karachi,1949.

11. Govt. of Pakistan, Report of the Land Reforms

۱۲۔ اِن اعداد وشمار میں اور ۱۹۵۹ء میں پاکستان لینڈ ریفارمز کمیشن کی جانب سے دیئے
گئے اعداد وشمار میں بڑا تضاد ہے۔ کمیشن کے مطابق عطا کی گئی جاگیروں کی تعداد ۷۷۹
تھی اور ان کا مجموعی رقبہ ۲ء۱۶ ملین ایکڑ تھا۔

۱۳۔ یہ انتظام صرف ان زمینوں پر تھا جنکا انحصار پانی کے بہاؤ، یا بارشوں اور سیلاب
کے پانی پر تھا۔

Commission for West Pakistan, Lahore, 1959, p.13.

14. Govt of Sind, Hari Enquiry Committee, pp.5-6, 8-9.
15. Ibid., p.12.
16. Govt. of Sind, Sind Tenancy Act 1950, (Act XX of 1950, Karachi, 1950.

۱۷۔ ایک ریٹائرڈ سول افسر نذیر احمد کے ساتھ مصنف کا انٹرویو۔

۱۸۔ ہاری کو زمیندار کا مطیع و فرمانبردار بنانے کے لئے مذہب کا بھی سہارا لیا جاتا تھا اور
کہا جاتا تھا کہ یہ خدا کی منشا ہے۔ زمین، زمیندار کے پاس رہے۔ ملاحظہ ہو۔

19. M. Beqiraj, Peasantry in Revolution, Ithaca, N.Y, Cornell University Press, 1966, p.4.
20. E.J.Hobsbawm, op.cit.; H.A.Landsberger, Peasant Unrest: Themes and Variations, Rural Protest

۲۱۔ خلافت تحریک کے مطالبات میں بنیادی حیثیت ترکی میں خلافت کی بحالی کے مطالبے
کو حاصل تھی۔

۲۲۔ ایس۔ جمال الدین بخاری نے جو کہ خلافت تحریک اور ہاریوں کی تحریکوں میں شامل
رہے ہیں۔ اس سلسلے میں مصنف کو تفصیلات سے آگاہ کیا۔ خلافت تحریک سے وابستہ مذکورہ
عناصر نے اسی زمانے میں کراچی سے روزنامہ الوحید جاری کیا تھا۔

۲۳۔ حکومت بمبئی کے ایک قانون کی رو سے غیر مزروعہ زمینوں سے مسلسل چار سال تک کیلیے

کی عدم وصولی کے نتیجے میں یہ زمینیں ضبط کر لی جاتی تھیں اس قانون کو ۱۹۳۲ء میں واپس لے لیا گیا اور ضبط شدہ زمینیں مالکوں کو لوٹا دی گئیں۔ ملاحظہ ہو

Hyder Bux Jatoi, 'Injust Land Assesement Rates in Sir Districts, Hyderabad, June 1957.

24. G.M.Syed's Note of Dissent on Report of the Tenai Legislation Committee, Karachi, 1945.

25. Govt. of Sind, Report of the Hari Enquiry Committ p.26.

26. Govt. of Sind, Report of the Tenancy Legislation Committee, Karachi, 1945.

27. Ibid, pp.9-11

۲۸۔ حیدر بخش جتوئی ۱۹۴۵ء میں سندھ ہاری کمیٹی کے سکریٹری منتخب ہوئے۔

29. D.N.Dhanagare, "Peasant Protest and Politics-The Tebhaga movemant in Bengal(India), 1946-47"

۳۰۔ حیدر بخش جتوئی سندھی زبان کے معروف شاعر اور ادیب تھے۔ ان کی سندھی نظمیں اور انگریزی میں ان کے پمفلٹ بہت سے موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں جن میں ہاریوں کے حقوق سے لیکر جمہوریت اور سندھ کی علاقائی خودمختاری جیسے مسائل شامل ہیں۔

31. Govt.of Sind, Repot of the Hari Enquiry Committee,

32. Hari Enquiry Committee: Minute of Dissent, M.Masud Karachi, 1949, pp.36-37

33. Govt. of Sind, Report of the Hari Enquiry Committe pp.28-50.

۳۴۔ ۱۹۴۰ء کے عشرے کے اوائل میں گدو بیراج کے علاقے میں تقریباً پچھتر ہزار ایکڑ زمین ہاریوں اور چھوٹے مالکان کو ہراپ کے طور پر دی گئی۔

پاکستان میں بچوں کی محنت

زاہد اسلام

بچوّں کی محنت کا مسئلہ محض عمر کا سوال نہیں، بلکہ استحصال کا مسئلہ ہے جسے اسی انداز میں دیکھنے کی کوشش ہمارا مقصد ہے۔ چونکہ ہمارے ہاں زیادہ تر تحقیقی و علمی کام اس سوال کو سماجی و اخلاقی حوالوں سے دیکھنے کی کوششوں کا مظہر رہا ہے لہٰذا بچوں کی محنت کے استحصال کی مختلف شکلوں اور بچوں کی کل لیبر فورس کی تعداد وغیرہ کے بارے میں حقائق ہمیں حاصل نہیں۔ پاکستان میں سرکاری یا غیر سرکاری سطح پر اس طرح کی کوئی سروے رپورٹ یا تحقیقی کوائف موجود نہیں ہیں جو مزدور بچوں کی شرائط کار کا نقشہ کھینچ سکیں۔ ہمارے ہاں بچوں کی محنت قانوناً ممنوع ہے محکمہ لیبر فیکٹری ایکٹ کی خلاف ورزی پر کسی بھی صنعتی و کاروباری ادارے کا چالان کر سکتا ہے اور فیکٹری ایکٹ میں واضح ہے کہ مزدور کی کم از کم عمر ۱۶ سال ہونی چاہیئے۔ مگر پھر بھی شہروں میں لاتعداد ایسے صنعتی و نیم صنعتی ادارے قائم ہیں جہاں بچےّ ملازم ہیں۔ جہاں کوئی لیبر قانون لاگو نہیں ہوتا نہ ہی یہ ادارے کسی فیکٹری کی تعریف میں آتے ہیں۔ جبکہ یہ معصوم محنت کش براہ راست پیداواری سرگرمی میں شریک کار ہیں اور دھڑا دھڑ قدر زائد میں اضافہ کا باعث بن رہے ہیں۔ انکا آجر دونوں ہاتھ سے منافع سمیٹ رہا ہے کیونکہ اسے ان ملازمین کو وہ مراعات بھی نہیں دینا

پڑتیں جو بالغ مزدور کو دینا قانوناً لازمی ہیں۔

اقوام متحدہ کی جانب سے ۱۹۷۹ء کے سال کو بچوں کا سال قرار دیا گیا تھا اس سال کو گزرے کئی سال ہو گئے۔ یہ تو ضرور ہوا کہ مختلف پہلوؤں سے ان کا تذکرہ ہونے لگا۔ ان کی ملازمت، ان کی تعلیم، ان کی صحت عامہ، ان کے نفسیاتی مسائل وغیرہ ایسے موضاعات ہیں کہ ۱۹۷۹ء کے دوران اور اس کے بعد دنیا بھر میں ان پر تحقیق اور بحث و مباحثہ کا آغاز ہوا۔ بچوں کی محنت کے مسئلہ کی اہمیت کا احساس عالمی سطح پر ہوا تو اہل علم و دانش نے استحصال کے خلاف آواز بلند کی۔ ترقی پذیر ممالک میں بالخصوص پاکستان میں تو اس ضمن میں کوئی احساس ہی نظر نہیں آتا۔ ۱۹۸۵ء میں لاہور کی ایک فرم جس کے مالک ایک ترقی پسند دانشور ہیں۔ نے اس بدترین استحصال کو بطور مسئلہ اٹھانے کیلئے چند ایک کوشش کیں۔ لاہور شہر کا سروے Sample Survey ایک رپورٹ کی تیاری اور نئے سال کا کیلنڈر مزدور بچوں کے نام معنون کر کے انھوں نے نہایت جرأت کا مظاہرہ کیا مگر ان اقدامات سے کہیں زیادہ کی ضرورت ہے۔

ہمارے اس مضمون میں مختصراً کوشش کی گئی ہے کہ یہ واضح کیا جا سکے کہ بچوں کی محنت کے مختلف پہلو کونسے ہیں ان کے حالات کار کیا ہیں؟ بچے مزدوری کی طرف کیوں آتے ہیں؟ اور ان جیسے دوسرے سوالات پر بحث کا آغاز کیا جائے۔

میرا بنیادی مدعا یہ ہے کہ میں اہل فکر و دانش کو یہ احساس کراؤں کہ بچوں کی محنت ایک مسئلہ ہے جس کے حل کی ضرورت ہے۔ یہ صرف انسانی اخلاقی سوال نہیں کہ چھوٹے معصوم کھیلنے کودنے کے بجائے مزدوری

پر مجبور ہیں۔ بلکہ سرمایہ دارانہ استحصال کا سوال ہے۔ بچوں کی محنت کو کسی قسم کا قانونی تحفظ حاصل نہیں ہے۔ پاکستان میں دس تا پندرہ سال کے بچوں کی تعداد کل آبادی کا ۵۲،۴۴ فیصد ہے۔ یہی عمر ہے جب بچے محنت مزدوری کی طرف آتے ہیں یا تعلیم کی جانب رجوع کرتے ہیں۔

بچوں کی 'لیبر فورس' میں شمولیت کے اسباب کی تلاش دو پہلوؤں سے کی جاسکتی ہے۔

اول: ان طبقاتی و معاشی مجبوریوں کی نشاندہی کی جائے جو بچوں کو مزدوری پر مجبور کرتی ہیں۔

دوئم: ان امکانات کی وضاحت کی جائے جہاں بچوں کی لیبر فورس کی طلب ہے

جہاں تک اوّل الذکر اسباب کا مسئلہ ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں بچوں کی بطور مزدور حیثیت بنیادی طور پر معاشی بد حالی اور طبقاتی مجبوریوں کی بدولت ہے۔ مزدور بچوں کی اکثریت کا تعلق نچلے طبقات سے ہے۔ گو کہ ایسی صنعت جہاں بچوں کو ہنرمندی سکھائی جاتی ہے۔ میں قدرے نچلے درمیانہ طبقے کے بچے بھی آتے ہیں مگر زیادہ تر شعبوں میں چائلڈ لیبر کا بڑا حصہ دیہاتی و شہری نچلے طبقات سے ہی آتا ہے۔ جہاں افرادِ خانہ زیادہ ہوتے ہیں آمدن کم ہوتی ہے اور گذر اوقات کیلئے گھریلو آمدن میں اضافہ کرنا ناگزیر بن جاتا ہے۔ قابلِ عمل حل ایسے کنبوں کے نزدیک صرف یہی ہوتا ہے کہ گھر کے تمام افراد محنت مزدوری کریں چنانچہ بچہ اپنی استعداد کے مطابق کمانا شروع کر دیتا ہے۔

گذشتہ دو دہائیوں سے ہمارے ملک میں افراطِ زر میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ عرب ممالک سے آنے والی دولت کی فراوانی نے سونے پہ سہاگے کا کام کیا۔ اشیائے ضروریات بشمول اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں میں

کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ مہنگائی کے اس عفریت کا ایک معمولی سا اندازہ ذیل میں لیا گیا ہے۔

	سنہ ۱۹۷۰ء	سنہ ۱۹۸۶ء
کرایہ مکان دو کمرے لاہور	۲۰ تا ۸۰ روپے ماہانہ	۲۰۰ تا ۸۰۰ روپے ماہانہ
کرایہ ٹرانسپورٹ شہر کے اندر	کم سے کم ۲۰ پیسہ	کم سے کم ایک روپیہ
مردانہ شلوار قمیض (عام کپڑا)	۶۰ روپے	۱۶۰ روپے
آٹا	۱۶ روپے فی من	۹۰ روپے فی من
گھی	۵ روپے فی کلو	۲۰ روپے فی کلو
چینی	۵ روپے فی کلو	۹ روپے فی کلو
آلو	۶۰ پیسے فی کلو	۳ روپے فی کلو
گوشت گائے	۶ روپے فی کلو	۱۸ روپے فی کلو

ان اخراجات کے مقابل آمدن کا گوشوارہ ملاحظہ فرمائیے:

فیکٹری مزدور کم سے کم تنخواہ	۱۵۰ روپے ماہانہ	۴۰۰ روپے ماہانہ
روزانہ دہاڑی دار مزدور	۱۰ روپے روزانہ	۳۰ روپے روزانہ

آمدن و اخراجات کا موازنہ کریں تو بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ درجہ چہارم کا ایک ملازم جسکے ۳ بچے ہیں وہ اپنا ماہانہ بجٹ کس طرح ترتیب دیتا ہوگا۔ اگر اسکی ماہانہ آمدن تمام سرکاری الاؤنس ملا کر ۱۰۰۰ روپیہ ماہانہ بنتی ہے۔ تو اخراجات کا تخمینہ ملاحظہ فرمائیں۔

کرایہ مکان	۲۰۰ روپیہ کم از کم

بل وغیرہ پانی گیس بجلی ۱۰۰ روپے کم از کم
خوراک کا خرچہ ۶۰۰ روپے (۲۰ روپے روزانہ آٹا گھی دودھ
مسالے چائے سبزی وغیرہ)

لباس کا خرچہ ۲۰۰ روپے
کرایہ ٹرانسپورٹ ۲۰۰ روپے
(گھر تا دفتر)
سگریٹ چائے دفتر ۱۰۰ روپے

کل میزان ۱۴۰۰ روپے ماہانہ

یہ اخراجات کم از کم ہیں جبکہ علاج معالجہ اور دیگر روزمرہ کے اخراجات بھی ہوتے ہیں۔ اور پھر یہ ایک سرکاری ادارے کے ملازم درجہ چہارم کا بجٹ ہے جبکہ پرائیوٹ ملازمین کی حالت اس سے بھی پتلی ہوگی۔ اب اندازہ کریں کہ وہ آمدن اور خرچے کا فرق کس طرح پورا کرے گا؟

اس لئے وہ یہ راستے اختیار کر سکتا ہے۔

دوہری ڈیوٹی شروع کرے یعنی نوکری کے ساتھ ساتھ کوئی کاروبار جیسے چھابڑی لگانا وغیرہ

یا کوئی شام کی ملازمت اختیار کرے

یا پھر کنبہ کے دوسرے افراد بھی روزی کمائیں

عام مشاہدہ یہ ثابت کرتا ہے کہ بہت بڑی تعداد نے ان دونوں راستوں کو اختیار کیا ہوا ہے۔ لہٰذہ بچوں کی محنت ایک معاشی مجبوری بن گئی ہے۔ ہاں البتہ یہ تھوڑی گنجائش ایک قلیل سی تعداد بچوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان سے کام کراتی ہے۔ جیسے سردیوں کی رات کو گرم ابلے انڈے بیچنا وغیرہ

جبکہ بڑی تعداد میں بچے اسکول چھوڑ چھاڑ کر مزدوری کرنے پر مجبور ہیں۔

ایک طرف مہنگائی نے غربت میں اضافہ کیا۔ نچلے طبقات کو مجبور کیا کہ وہ زندگی گزارنے کیلئے خود بھی مشین بنیں اور بچوں کو بھی بنائیں دوسری طرف لاکھوں افراد نے عرب ملکوں سے جو دولت کمائی ہے اس کے کئی طرح کے سماجی اثرات مرتب ہوئے۔ اس مضمون کا دائرہ کار محدود ہونے کے سبب ان سماجی اثرات کا صرف اتنا ذکر کروں گا جو بچوں کی محنت سے متعلق ہے۔

بیرون ملک سے آنے والی دولت نے بہت سے محنت کش خاندانوں کو درمیانہ طبقہ میں تبدیل کیا ہے۔ اس نوزائیدہ درمیانہ طبقہ نے ایک نئی سوچ اور نفسیات کو فروغ دیا۔ نہ صرف فکری سطح پر بلکہ معاشی سطح پر بھی اس طبقہ نے چھوٹی سرمایہ کاری کاروبار کے مواقع کو وسیع کیا۔ ان دونوں پہلوؤں نے یعنی مخصوص انداز فکر نے گھریلو ملازموں کی طلب میں شدت پیدا کر دی ہے۔ اس طرح چھوٹی سرمایہ کاری و کاروبار نے جیسے ریستوران بنانے کے رواج، سوزوکی پک اپ بطور ٹرانسپورٹ کے استعمال کے فروغ اور اسی طرح کے دوسرے کاروباروں نے بچوں کی مزدوری کے مواقع کو وسیع کر دیا ہے۔

محنت کاروں کی طلب اور نچلے طبقات کی معاشی مجبوری نے گذشتہ دو دہائیوں میں بچوں کی بڑی تعداد کو لیبر فورس کی شکل میں ڈھال دیا ہے۔

دیہاتوں سے شہروں کی طرف نقل مکانی بھی کسی حد تک چائلڈ لیبر فورس میں اضافہ کا سبب ہے۔ جوں جوں دیہاتوں میں روزگار کے مواقع محدود ہو رہے ہیں، دیہی آبادی کا ایک حصہ روزگار کیلئے شہروں کا رخ کرتا ہے۔ آغاز میں تو ایسے افراد کی بڑی تعداد دیہات سے اپنے تعلق کو قائم رکھتی ہے مگر آہستہ آہستہ شہروں میں سکونت پذیری کا رجحان غالب آتا

ہے تو شہری ضروریات ان کے اخراجات میں اضافہ کی متمنی ہوتی ہیں اس ضرورت
کو پورا کرنے کیلئے ایسے افراد کے اہل خانہ کو روزی کمانے کی طرف توجہ دینا
پڑتی ہے مگر دیہات سے آنے والی خواتین شہری ماحول میں کام کاج کے لئے
فٹ نہیں ہو پاتیں۔ مگر بچے نئے ماحول میں ایڈجسٹ ہونے کی صلاحیت رکھتے
ہیں تو ان بچوں کو کسی ہنر مندی کی سکھائی کیلئے یا پھر انہیں چھوٹی موٹی ہنر مندی
پر لگا دیا جاتا ہے۔ لاہور شہر کے مضافات میں واقع مزدور بستیوں کے زیادہ
خاندان اسی انداز میں آ کر آباد ہوتے ہیں اور ان کے بچوں کی اکثریت شہری
ماحول میں مہنگی تعلیم کے حصول میں ٹائم ضائع کرنے کی بجائے ملازمت کی
طرف مائل ہیں۔ مہنگی تعلیم اس لئے کہ شہر کے ماحول میں دیہاتی مسجد کے
اسکول کی سہولت بھی میسر نہیں۔

تعلیمی سہولتوں کا فقدان

بچوں کی ایک بڑی تعداد کو محنت مزدوری کی طرف مائل کرنے کا ایک
اہم سبب تعلیمی سہولتوں کا ناکافی ہونا بھی ہے۔ دیہاتوں اور شہروں میں
بچوں کی ایک بڑی تعداد ان سہولتوں سے مستفیض نہیں ہو سکتی تو ان کے والدین
زیادہ بہتر سمجھتے ہیں کہ آوارگی کی بجائے بچوں کو کسی ہنر کی طرف راغب کیا
جائے۔ اس طرح پڑھ لکھ کر بے روزگاری بھی اس رجحان کو تقویت دینے
کا سبب بنتی ہے کہ تعلیم کا کیا فائدہ اتنا وقت اتنا روپیہ صرف کرو اور پھر کام
تو ہاتھ سے کرنا ہے تو کیوں نہ بچپن سے ہی اس ہنر کے حصول کیلئے سرگرم ہوا
جائے۔ یہ سوچ ایک عام رواج کی حیثیت حاصل کر جاتی ہے۔ اس طرح بہت
کم مثالیں ایسی ہونگی کہ والدین ان پڑھ ہوں اور انکی خواہش ہو کہ ان کے بچے
پڑھ لکھ کر ان کے آبائی پیشے کے برعکس کوئی دوسرا پیشہ اختیار کریں۔ والدین

کی اپنی تعلیم سے عدم دلچسپی ان کی اولاد کو محنت مزدوری کے میدان میں لانے کا باعث بھی بنتی ہے۔

درج ذیل گوشوارہ سے اندازہ ہوگا کہ کتنی بڑی تعداد میں بچے تعلیمی سہولتوں سے استفادہ نہیں اٹھا رہے ہیں۔

سال	پرائمری اسکولوں کی تعداد	داخل شرح طلبا	۵ تا ۹ سال کی عمر کے بچے (تعداد)
۱۹۶۱	۲۰۹۰۹	۲,۰۶۰,۰۰۰	۶,۴۷۱,۷۱۵
۱۹۷۲	۴۵۸۵۴	۴,۲۱۰,۰۰۰	۱۰,۱۳۱,۴۸۶
۱۹۸۱	۵۸۳۹۸	۶,۵۹۰,۰۰۰	۱۳,۱۹۹,۸۶۴

(ذریعہ پاکستان اکنامک سروے ۸۱-۱۹۸۰ء، مردم شماری رپورٹ ۱۹۷۲ء اور مردم شماری رپورٹ ۱۹۶۱ء)

ان اعداد و شمار سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ۱۹۷۲ء تک بچوں کی آدھی سے زائد تعداد اسکولوں سے باہر ہے۔ جب کہ ۱۹۸۱ء میں کم و بیش یہی فرق برقرار ہے۔ تقریباً داخل شدہ بچوں کے برابر بچے تعلیمی سہولتوں سے دور ہیں۔ یہ بچے لازمی طور پر کسی نہ کسی شکل میں پیداواری سرگرمی میں حصہ لے رہے ہیں۔

اس سے پیشتر کہ ہم پاکستان میں بچوں کی محنت کے مختلف پیشوں کے حوالہ سے جائزہ لیں ہم اجرت کے لحاظ سے ان کی تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ **باقاعدہ اجرتی مزدور:-** یہ وہ محنت کش بچے ہیں جو اپنی محنت کے عوض باقاعدہ مالی معاوضہ حاصل کرتے ہیں۔ جو کسی مخصوص عرصہ کے دوران محنت سرانجام دینے کے صلے میں ملتا ہے۔ روزانہ یا ماہانہ کے حساب سے اس قسم کے محنت کش بچے زیادہ تر چھوٹی صنعت، شہروں کے نچلے کاروباری اداروں، چھوٹی

ٹرانسپورٹ، پٹرول پمپوں، سروس اسٹیشنوں اور آٹوموبائیل ورکشاپوں میں مصروف کار ہیں، ایسے بچوں کی ایک بڑی تعداد تکنیکی و نیم تکنیکی سرگرمیوں سے منسلک ہیں، ان بچوں کا معاوضہ اپنے ہم پلہ بالغ مردوں کے مقابلے میں نہایت قلیل ہے۔ اجرت وصول کرنے والے بچوں کی دوسری قسم گھریلو ملازمتوں میں ہے۔ جو معاوضہ کے ساتھ ساتھ روٹی کپڑا اور رہائش کی سہولت بھی حاصل کرتے ہیں۔ مگر ان کے اوقات کار کا تعین نہیں ہوتا بلکہ ۲۴ گھنٹے مالک کی صوابدید پر انکی خدمات حاضر ہوتی ہیں۔ اس طرح ملازم بچے گھر کا چھوٹا موٹا کام، بچوں کی نگہداشت اور سودا سلف لانے کے کام سے لے کر کھانا پکانے کے کام تک مصروف ہیں۔

۲۔ بے قاعدہ اجرتی مزدور:۔ اس قسم کے بچے کسی نہ کسی سرگرمی میں ملوث تو اس انداز میں ہوتے ہیں کہ انکی محنت کا معاوضہ کسی حد تک ادا کیا جاتا ہے۔ مگر نہ تو انکا معاوضہ مکمل ہوتا ہے یعنی اسکی ادائیگی جزوی ہوتی ہے اور نہ براہ راست ادائیگی ہوتی ہے۔ اس طرح کے مزدوروں کی بہت بڑی تعداد شاگرد کام کرنے والے محنت کش بچے ہیں۔

بچوں کی محنت کے استحصال کی بدترین شکل یہی ہے۔ جہاں کام سکھانے کے بہانے مفت اور سخت مشقت لی جاتی ہے۔ انہیں شاگرد کا نام دیا جاتا ہے۔ شاگرد کی حیثیت میں استاد کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ معاشرے کی پسماندگی سے بھرپور ناجائز فائدہ اٹھائے اور بطور استاد بچے کو مارے پیٹے، بھوکا رکھے رسّے سے باندھے، اس کی نوخیز آسوں امیدوں کو جابرانہ انداز میں کچل دے کہ بچے کو اسکے والدین نے استاد کے پاس کام سیکھنے کیلئے بھیجا ہے۔ اور دوران تربیت مار پیٹ لازمی ہے۔ یہ جہالت ہمارے تعلیمی نظام میں بھی

ہے۔ بچوں کی تدریس میں مار پٹائی لازمی عنصر ہے۔ مگر تعلیمی نظام میں استاد کا چونکہ بچے سے ذاتی مفاد وابستہ نہیں ہوتا اس لئے مار پیٹ میں شدت نہیں ہوتی۔ جبکہ محنت کے استحصال میں استاد کا ذاتی مفاد شاگرد سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ کام لینے کے چکر میں جبر و تشدد زیادہ شدید ہوتا ہے۔ اور اکثر اوقات ان شاگردوں کو معاوضہ نہیں ملتا۔ گوکہ اب بڑے شہروں میں اور بعض شعبوں میں معمولی معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔

شاگرد بنانے کا رواج یوں تو ان شعبوں میں تھا جہاں واقعی کسی ہنر سے باقاعدہ واقف کرایا جاتا تھا۔ جیسے آٹو موبائیل ورکشاپوں، خراد کا کام، کپڑا سازی، قالین بافی، درزی کا کام، ویلڈنگ، ڈینٹنگ پینٹنگ وغیرہ وغیرہ۔ مگر اب بھی بعض ایسے شعبے ان شاگردوں سے بھرے پڑے ہیں جہاں کسی خاص مہارت کی تربیت مفقود ہے۔ جیسے پٹرول پمپ، سروس اسٹیشن وغیرہ مگر بطور شاگرد بچوں سے معمولی معاوضے پر کام بڑے آدمی کے برابر لیا جاتا ہے جبکہ اول الذکر شعبوں میں شاگرد بچے ایک لمبے عرصہ تک بطور معاون (helper) کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جیسے درزیوں کے شاگرد لمبی مدت کے لئے صرف بٹن لگانے اور کچا کرنے کا کام کرتے ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ جوں ہی یہ شاگرد کام سیکھ جاتے ہیں وہ شاگرد کے دائرے سے خود ہی نکل بھاگتے ہیں۔

بلا اُجرت مزدوری

بچوں کے بارے میں یہ تصور ہمارے معاشرے میں عام ہے کہ گھر کے بزرگوں کیلئے محنت مشقت کی ذمہ داری سرانجام دینا بچوں کا مذہبی و اخلاقی فرض ہے۔ یہ ایک عبادت ہے۔ اس تعلیم کی رو سے بچہ جوں ہی ہوش سنبھالتا ہے

وہ اپنے اہل خانہ کے بڑوں کا بے دام ملازم بنتا جاتا ہے مگر مختلف طبقوں میں کام کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ شہری اعلیٰ اور درمیانہ طبقات کی اوپری پرتوں میں بچے یہ فریضہ صاف ستھرے کاموں کو سرانجام دے کر پورا کرتے ہیں جبکہ نچلے درمیانہ طبقہ میں اس فریضہ کی ادائیگی بڑے کاموں میں ہوتی ہے۔ مزدور طبقہ یا دستکار گھرانے کے بچے اس اصول کی رو سے اپنے باپ یا بڑے بھائی یا کسی دوسرے بڑے فرد کی مشقت میں حصہ بٹاتے ہیں۔ اگر ماں کسی گھر میں ملازمت کرتی ہے تو اسکی چھوٹی بچی اس ملازمت میں کسی حد تک ماں کا ہاتھ بٹائے گی۔ اس طرح بیٹا باپ کے خوانچہ پر ہاتھ بٹائے گا۔ اس ساری محنتی سرگرمی کا بچہ کوئی معاوضہ حاصل نہیں کرتا۔ جبکہ پیداواری عمل میں وہ اپنی استعداد کے مطابق حصہ ڈالتا ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اس طرح کی سرگرمیوں کو بچوں کی محنت تصور ہی نہیں کیا جاتا ہے۔

یوں تو ہر شعبہ کے مزدور بچوں کی حالت زار انکے شرائط کار وغیرہ کا الگ الگ جائزہ لینا ضروری ہے مگر یہ ایک الگ کام ہے جو اہمیت کے لحاظ سے فوقیت کا طلب گار ہے یہاں مختصراً چند ایک شعبوں میں چائلڈ لیبر کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

چھوٹی صنعت میں چائلڈ لیبر

نچلے درجے کی صنعت بالخصوص گھریلو انڈسٹری اور نیم صنعتی کاروباری اداروں میں سے بعض جہاں سرمایہ کاری ابتدائی نوعیت کی ہوتی ہے اور اجیر یا سرمایہ دار بذات خود بھی پیداواری سرگرمی میں براہ راست حصہ لے رہا ہوتا ہے۔ وہاں بچوں کی محنت کا استحصال زیادہ برے انداز میں ہو رہا ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ منافع کے حصول کی غرض میں سرمایہ کار یا مالک ادارے کا مفاد اس بات میں پوشیدہ

ہوتا ہے کہ وہ اپنے اخراجات میں کمی کرتا جائے۔ لہٰذا سرکاری جگہوں پر چھپر ڈال کر ورکشاپ بنائے جاتے ہیں خراد اور ویلڈنگ کی دوکانوں میں روشنی، ہوا اور صفائی کا انتہائی ناقص انتظام ہوتا ہے۔ اس طرح ڈینٹنگ پینٹنگ کے ورکشاپ بھی عام طور پر مفت یا سستی زمین پر ہوتے ہیں ان تمام قسم کے اداروں میں اوقات کار اور تعطیلات کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ ملازموں کی تعداد کم ہوتے فیکٹری ایکٹ کے لاگو نہ ہونے کی بنا پر سرکاری محکمے بھی ان اداروں سے باز پرس نہیں کر پاتے۔ اگر کہیں سرکاری فرد ترقی بھی ہو تو رشوت لیبر انسپکٹر ان کے مزے کراتی ہے۔ یہاں کام کرانے والے عام مزدور بھی اپنے ہی ہم پلہ دیگر فیکٹری مزدوروں کے مقابلے میں کم تر شرائط کار پر کام کرتے ہیں۔ چہ جائیکہ محنت کش بچے جو شاگرد یا معاون کی حیثیت سے غلاموں کی حیثیت میں کام کرتے ہیں، ان کے احوال کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ اس طرح کی صنعت کا دائرہ ملک بھر کے چھوٹے بڑے شہروں تک پھیلا ہوا ہے۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ بچوں کی لیبر فورس صرف شہروں میں ہی نظر آتی ہے۔ دیہات یا چھوٹے قصبوں میں اس طرح کی ورکشاپوں میں بچے موجود نہیں جس کی بڑی وجہ کام کی کمی ہے۔ یعنی وہاں ورکشاپوں میں کام کم ہوتا ہے جو مستری اور اس کا کنبہ ہی کر سکتا ہے۔ کسی حد تک آبادی میں کمی اور آپس میں جان پہچان کا مسئلہ بھی آڑے آتا ہے۔ مالک زمین کا بیٹا ترکھان جو کمی کی حیثیت سے پہچانا جاتا رہا ہے کے پاس کام سیکھنے چلا جائے۔ جبکہ شہروں میں یہ مسائل نہ ہونے کے برابر ہیں۔

قالین بافی کا کام

ہاتھ سے بنائے جانے والے قالین پاکستان کی برآمدات کا اہم جز ہیں۔ گزشتہ ایک دہائی سے اس صنعت میں بڑے پیمانے کی سرمایہ کاری ہوتی ہے۔ مگر یہ سرمایہ

کاری اس انداز کی ہے کہ نوعیت کے لحاظ سے یہ صنعت تاحال گھریلو صنعت کی صف میں شامل ہے۔ جبکہ سرمایہ کاری نے گھریلو صنعت کو جغرافیائی طور پر پھیلایا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل بعض علاقوں میں یہ کام روایتی معنوں میں چلا آرہا تھا۔ جیسے وسطی پنجاب کے اضلاع۔ مگر اب یہ کام ملک کے طول و عرض میں پھیل گیا ہے۔ قالینوں کے تاجروں کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ جبکہ مینوفیکچرنگ کا انداز ابھی تک روایتی ہے۔ قالین بافی کا کام انتہائی تھکا دینے والا اور جسمانی طور پر تکلیف دہ ہے ایک فٹ کی چوڑائی اور ۱۰ فٹ لمبے لکڑی کے تختے پر پنجوں کے زور پر بیٹھنا پڑتا ہے اور سامنے لٹکتے سوت کے دھاگوں میں اون کی گرہ لگا کر کاٹنی ہوتی ہے ایک قالین کے اڈے پر تقریباً ۴ مزدور کام کرتے ہیں ان ۴ میں سے اگر ۲ معمولی ہنرمند ہوں تو ایک ماہر کاریگر بیک وقت ۳۔۴ قالین کی بنائی کا کام کرواسکتا ہے۔ پرانے وقتوں سے یہ رواج چلا آرہا ہے کہ ایک اڈے پر ایک استاد کئی بچے شاگرد رکھ لیتا ہے اور ان سے یہ کام کرواتا ہے۔ یہ بچے کام سیکھنے کے چکر میں بیٹھ بیٹھ کر اپنے کئی عضلات کو مفلوج کر لیتے ہیں۔ یہ الگ موضوع ہے جس پر تحقیق کی جائے تو خوفناک نتائج سامنے آئیں۔

قالینوں کی بنائی کا کام عام طور پر اس طرح ہوتا ہے کہ سرمایہ کار یا برآمد کنندہ سوت اور اون خرید کر استاد کو دیتا ہے جو اپنے شاگردوں سے یہ قالین تیار کراتا ہے اور فی قالین معاوضہ حاصل کرتا ہے۔ معاوضہ کی ادائیگی قالین کی بنائی میں لگائی گانٹھوں کی تعداد سے متعین ہوتی ہے۔ جوں جوں سرمایہ کاری بڑھ رہی ہے۔ اس کام نے دور دراز کے لوگوں کو بھی متوجہ کر لیا ہے اب اکثر دیہاتوں میں نوجوان لڑکیاں بھی یہ کام کرتی نظر آرہی ہیں۔ اس کام میں بچوں کی شمولیت

درج ذیل وجوہات کے سبب ہے۔

اول:۔ مہارت کے لحاظ سے یہ کام اس نوعیت کا ہے کہ ایک استاد کئی شاگردوں سے بیک وقت کام لے سکتا ہے۔ وہ قالین کے بیل بوٹوں کی ترتیب دے کر گانٹھوں کو گن کر بولتا ہے اور شاگرد اسی حساب سے گرہ لگائے جاتے ہیں۔

دوئم:۔ زیادہ تر بنائی کا کام کاریگر خود کرتے ہیں لہٰذا معاوضہ زیادہ سے زیادہ اپنے پاس رکھنے کا لالچ بچوں کو ملازم رکھنے پر پورا ہوتا ہے۔

سوئم:۔ قالین کی بنائی کا کام کرنے والا خود معمولی شخص ہوتا ہے وہ نفسیاتی طور پر خود کو تیار نہیں کر پاتا کہ کام کو بڑے پیمانے پر چلائے وہ اسے شعوری طور پر گھریلو صنعت تک ہی محدود رکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے بھی نہ جدید صنعت کی صنف میں نہیں آئی۔ اور گھریلو صنعت میں بالغ ملازمین کی زیادہ گنجائش نہیں ہوتی۔ اس صنعت میں سستی گھریلو محنت میسّر ہونے کی وجہ سے صنعتکار بھی اس بات میں دلچسپی نہیں لیتا کہ وہ بڑے پیمانے پر یہ کام شروع کروائے۔

زراعتی سرگرمیوں میں بچوں کی صنعت

پاکستان کے زرعی شعبے میں گزشتہ ۳ دہائیوں میں جو تبدیلیاں آئی ہیں ان کے اثرات انتہائی دور رس ہیں۔ مشینی کاشت کے فروغ نے نقد آور فصلوں کی کاشت کو عام کیا۔ چھوٹے ملکیت داروں میں اضافہ نے خود کاشتہ رقبے میں اضافہ کیا ہے اور ان دونوں عناصر کی بدولت دیہاتوں میں اجرتی مزدوروں کی طلب میں اضافہ ہوا ہے۔ اجرت کی ادائیگی دو طرح ہوتی ہے۔ دہاڑی دار مزدور کی حیثیت میں یا پھر مخصوص کام کے لئے ٹھیکہ پر مزدوری طے کر کے جیسے چھوٹے

مالکوں کی بڑی اکثریت کھیت کی تیاری خود کرتے ہیں مگر فصل کی بوائی اور کٹائی جیسے چاول، کپاس اور گنے کی فصلیں ہیں، ٹھیکہ پر طے کی جاتی ہیں۔ یہ شرح مختلف علاقوں میں مختلف ہیں۔ مگر مثلاً ہر جگہ یہ رواج عام ہے کہ اس طرز پر کام کرنے والے اپنے تمام افراد خانہ کو ملا کر یہ سرگرمی کرتے ہیں جیسے دھان کی فصل کی کاشت میں پنیری کی بوائی بچے بوڑھے جواں مرد عورت مل جل کر کرتے ہیں اور فی کھیت کے حساب سے معاوضہ حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح کی محنت میں بچے شامل ہوتے ہیں۔ مگر معاوضہ براہ راست وصول نہیں کر سکتے بلکہ یہ تمام افراد خانہ کا مشترکہ معاوضہ ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ جس زرعی بنیاد پر قائم صنعت نے فروغ پایا ہے اس میں بچوں کی بطور اجرتی مزدور بھرتی کا رواج قائم ہے۔ جیسے بکریوں، مرغیوں اور مویشیوں کے فارم وغیرہ۔ یہ ایسے شعبہ ہیں جہاں بچے کام تو کرتے ہیں لیکن افرادی قوت کا بڑا حصہ اب بھی بالغ افراد ہی پر مشتمل ہے۔

بڑے شہروں میں بچوں کی ایک تعداد ایسی بھی ہے جو اپنی محنت کی فروخت کسی آجر کے پاس ملازمت نہیں کرتے بلکہ گھوم گھام کر خود ہی مزدوری کرتے ہیں جیسے جوتوں کو پالش کرنے والے چھوٹی موٹی اشیاء خورونوش کی فروخت کرنے والے ایسے بچے بس اسٹاپوں پر بہ کثرت نظر آتے ہیں۔ جو گرمیوں میں گنڈیریاں، دال سویاں، کھیرے فروخت کرتے ہیں جبکہ سردیوں میں مکئی کے بھٹے، چپس، مونگ پھلی وغیرہ کی فروخت عام ہوتی ہے۔ ان بچوں میں اکثریت اپنے کاروبار کی خود مالک ہوتی ہے یا پھر اہل خانہ کے ہمراہ اس کاروبار میں ملوث ہوتی ہے۔ جبکہ بوٹ پالش کرنے والے بچے اپنی اجرت پر قدرے زیادہ بااختیار ہوتے ہیں۔

پیشوں کا انتخاب

عام طور پر بچے پیشوں کا انتخاب خود نہیں کرتے بلکہ ان کے والدین یا سرپرست اپنے خاندان کے روائتی پیشوں کو یا پھر جو بہ آسانی میسر آئے کے مصداق بچوں کو پیشے اختیار کرواتے ہیں۔ ان پیشوں کے چناؤ میں خاص علاقہ اور نسل کے لوگوں کی مخصوص نفسیات بھی کافی اہم ہے جیسے بوٹ پالش کرنے کا کام عمومی طور پر پختون بچوں کی اکثریت کرتی ہے۔ مخصوص نفسیات کے ساتھ ساتھ کام کے ذرائع تک رسائی بھی یہ تقسیم بنانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ جیسے پختون بچوں کو پنجاب و کراچی میں گھریلو کام کاج یا دستکاری سیکھنے کے مواقع مہیا نہیں ہوتے کیونکہ کام دینے والے افراد کی سوچ اور اس کا رویہ بھی رکاوٹ ہے

اسی طرح میرپور آزاد کشمیر، مری پوٹھوہار کے علاقہ کے بچے روائتی طور پر گھریلو ملازمت اور ریستورانوں میں مصروف کار ہیں۔ پھر یہ بھی ایک خاص پہلو ہے کہ دیہاتی معاشرے سے آنے والے بچے تقریباً ایسے پیشے اختیار کرتے ہیں جہاں خاص مہارت سیکھنا مقصود نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ ان کا رجحان درزی کا کام سیکھنے تک ہوتا ہے جبکہ شہروں سے متعلق بچوں کی اکثریت مخصوص ہنر کے حصول کی طرف مائل ہے۔

بچوں کی اجرت کا تعین مختلف شعبوں میں مختلف ہے مگر بنیادی طور پر دو طریقوں سے طے کی جاتی ہے۔

اول :- آجر کی مرضی سے

دوئم :- رواج کے مطابق

چونکہ بچوں کی محنت کو کسی بھی ملکی قانون میں کوئی تحفظ نہیں ہے۔ اور

بچوں کی محنت کے زیادہ تر مواقع چھوٹی صنعت اور نچلے درجے کے کاروبار میں ہیں اور پھر رسد میں خاطر خواہ اضافہ ہو رہا ہے۔ لہٰذا آجر کو ہی بنیادی حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اجرت کا تعین کرے۔ اکثر جگہ پر یہ اجرت بھی باقاعدہ تعین سے آزاد ہے۔ اس میں کمی بیشی بھی ہوتی ہے۔ تاہم بعض شعبے ایسے ہیں کہ جہاں اجرتوں کا تعین رواج سے ہوتا ہے۔ جیسے گھریلو ملازموں کی تنخواہیں کم و بیش رواج کے مطابق ہی ہوتی ہیں۔ جبکہ صنعت میں سکھلائی کے درجہ میں بچوں کی اجرتوں میں کمی و بیشی ہے کیونکہ انکی ہنرمندی کا تجربہ اور صلاحیت کا تعین آجر کرتا ہے اور اسے ہی اختیار ہے کہ معاوضہ متعین کرے۔ بہر حال یہ بات واضح ہے کہ بالغ افراد کے مقابلے میں بچوں کی اجرتیں نصف سے بھی کم ہیں۔

چونکہ بچوں کی محنت والدین کی رضا و رغبت کے بغیر کوئی وجود ہی نہیں رکھتی چنانچہ والدین کا یہ تسلیم شدہ حق ہے کہ وہ اپنے بچے کی اجرت خود وصول کرے اور اپنی مرضی سے خرچ کرے۔ اکثر بچے اپنی ہی کمائی سے یکسر محروم رہتے ہیں۔ جبکہ دو ایک شعبوں میں یہ معاوضہ بچے کسی قدر اپنی مرضی سے خرچ کرتے ہیں۔ جیسے جھاڑی لگانے والے بچے اور بوٹ پالش کرنے والے بچے۔ یہ معصوم ہی اس سہولت سے اس لئے فائدہ اٹھاتے ہیں کہ والدین کیلئے عملاً ممکن نہیں کہ انکی محنت کی معاوضہ وصول کر سکیں۔ جبکہ باقاعدہ آجر بچوں کی اجرت کا برائے نام معاوضہ ان کے والدین کو ہی ادا کرنا پسند کرتے ہیں

چائلڈ لیبر۔ ایک عالمی مسئلہ

یہ حقیقت ہے کہ دنیا بھر میں ۱۵ سال سے کم عمر بچوں کو افرادی قوت میں شامل نہیں کیا جاتا جبکہ اس عمر کے بچے قابل ذکر حد تک افرادی قوت کا حصہ ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں عالمی ادارہ محنت نے جو اعداد و شمار شائع کئے ہیں ان کے مطابق ۲۹ ملین بچے جنوبی ایشیا، ۹ ملین مشرقی ایشیا، ۱ ملین افریقہ، ۳ ملین لاطینی امریکہ اور ایک ملین

ترقی یافتہ ممالک میں موجود ہیں۔ جنکی عمریں ۱۵ سال سے کم ہیں اور برسر روز گار ہیں' (ماخذ: آئی ایل او جنیوا پیرس کے لئے خبریں اور فیچر شمارہ اگست ۱۹۷۸ء) ان ۵۲ ملین بچوں میں سے ۴۲ ملین بچے اپنے کنبوں کے ہمراہ بغیر کسی اجرت کے کام کر رہے ہیں، جن میں بڑی اکثریت زرعی سرگرمیوں میں ہے جبکہ ۱۰ ملین بچے اجرت پر کام کرتے ہیں مگر ان کی اجرتیں بالغوں کے مقابلے میں انتہائی کم ہیں۔ ان کی بڑی تعداد گھریلو صنعت اور چھوٹے کاروبار سے منسلک ہے۔

عالمی ادارہ محنت نے خود تسلیم کیا ہے کہ یہ اعداد و شمار صحیح حقائق کو مفصل انداز میں واضح نہیں کرتے اور صرف ریکارڈ پر آنے والے بچوں تک محدود ہیں جبکہ بہت بڑی تعداد ایسے محنت کش بچوں کی ہے۔ جنکا ذکر کسی ریکارڈ میں نہیں ہے۔

۱۹۷۳ء میں آئی ایل او نے اپنے ممبر ممالک کیلئے ایک کنونشن کا انتظام کیا تا کہ صنعت، ٹرانسپورٹ اور کاروبار کیلئے کم از کم عمر کو ۱۵ سال کر دیا جائے۔ جنوری ۱۹۷۸ء تک صرف ۱۱ ممالک نے اس کنونشن کی تجویز سے اتفاق کیا۔ جبکہ کئی ایسے ممالک جنہوں نے دستخط نہیں کئے تھے۔ انہوں نے بذات خود کم از کم عمر تو کم کر دیا۔ جیسا کہ امریکہ نے قانوناً عمر کو ۱۶ سال کر دیا جبکہ ترقی پذیر ممالک کیلئے بہت مشکل ہے کہ قانوناً اس عمر کو ۱۲ سال تک بھی تسلیم کریں کیونکہ ترقی پذیر ممالک میں اس سے کم عمر بچے بھی باقاعدہ اجرتی مزدوروں کی صف میں شامل ہیں۔ یہ ان معاشروں کی طبقاتی مجبوریاں ہیں۔

۱۹۷۵ء میں عالمی ادارہ محنت کے سروے کردہ اعداد و شمار جو ۱۹۷۷ء میں شائع کئے گئے ملاحظہ فرمائیں:

کل افرادی قوت میں بچوں کی تعداد

ملک	لڑکے عمر ۱۴-۱۰ سال		لڑکیاں عمر ۱۴-۱۰ سال		کل	
	فیصد	تعداد ہزاروں میں	فیصد	تعداد ہزاروں میں	فیصد	تعداد ہزاروں میں
امریکہ	۲٫۱	۲۲۱	۱٫۱	۱۰۶	۱٫۶	۳۲۷
چین	۱۲٫۲	۵۳۹۷	۹٫۶	۴۱۲۸	۱۰٫۹	۹۵۲۵
ہنگری	۰٫۶	۲	۱٫۳	۴	۱٫۰	۶
مصر	۱۸٫۲	۴۲۶	۴٫۵	۱۰۱	۱۱٫۵	۵۲۷
بھارت	۱۹٫۴	۷۶۲۰	۲۰٫۷	۷۵۳۷	۲۰٫۶	۱۵۱۵۷
موزمبیق	۴۱٫۸	۲۲۰	۱۴٫۵	۷۷	۲۸٫۱	۲۹۷
انڈونیشیا	۱۶٫۵	۱۴۲۵	۱۲٫۵	۱۰۴۸	۱۴٫۵	۲۴۷۳

چونکہ پاکستان میں اس عمر کے بچوں کا لیبر فورس میں کسی قسم کا سروے و تحقیق موجود نہیں اس لئے کوئی حتمی اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ تاہم پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک کی صورتحال متذکرہ بالا گوشوارے سے بخوبی واضح ہوتی ہے۔ اس عمر کے بچوں کی بھاری تعداد افریقہ کے غریب ممالک میں کام کرنے پر مجبور ہے۔ جہاں کل افرادی قوت کا ۱٫۸ فیصد ۱۰ سال سے ۱۴ سال کے بچوں پر مشتمل ہے جبکہ بھارت میں ۲۰٫۶ فیصد افرادی قوت اس عمر کے بچوں پر مشتمل ہے۔

ان اعداد و شمار سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں لیبر فورس میں بچوں کی تعداد ترقی یافتہ ممالک سے کہیں زیادہ ہے اور ۲۰۰۰ء تک اس میں معمولی کمی ہوگی۔ جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں مجموعی طور پر لیبر فورس میں بچوں کی تعداد بہت کم ہے اور اس میں روز بروز کمی واقع ہو رہی ہے۔ یہ رجحان اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ بچوں کی محنت مزدوری کا سبب عوام کی مجموعی غربت اور معاشی بدحالی بھی ہے۔ جوں جوں معاشرے میں خوشحالی زور پکڑتی ہے۔ بچوں کی محنت مجبوری

نہیں رہتی۔

بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں بچوں کی لیبر فورس میں کمی کا سبب معاشرے کی عمومی خوشحالی نہیں بلکہ بے روزگاری میں اضافہ ہے۔ یہ بات ایک حد تک درست ہے مگر بنیادی طور پر مسئلہ ضرورت کا ہے کہ ان معاشروں میں بچوں کو کسی معاشی مجبوری کی وجہ سے ملازمت نہیں کرنی پڑتی۔ بلکہ بچے خاندان سے الگ اپنی حیثیت قائم رکھنے کیلئے جس معاشی خود مختاری کے متقاضی ہوتے ہیں وہ انہیں ملازمت کی طرف لے آتی ہے۔ جبکہ ترقی پذیر معاشروں میں بچوں کو خاندان کی مجموعی آمدنی میں اضافہ کرنے کیلئے مجبوراً ملازمت اختیار کرنا پڑتی ہے۔

ہم نے مضمون کے شروع میں ہی مسئلہ کی اہمیت واضح کرتے ہوئے بیان کیا کہ بچوں کی محنت ایسا موضوع ہے جسے قانونی زبان میں یعنی سرکاری سطح پر تسلیم ہی نہیں کیا جاتا جبکہ دنیا بھر میں اور ہمارے جیسے ملکوں میں بالخصوص پاکستان میں یہ ایک اہم اور شدت اختیار کرتا ہوا مسئلہ ہے کہ معصوم بچے جن کیلئے قانونی معنوں میں محنت مشقت ممنوع ہے تعلیم کا حصول لازمی قرار پایا ہے محض اپنی طبقاتی مجبوریوں کی بنا پر کام کرنے پر مجبور ہیں اور پھر ظلم یہ ہے کہ ان کی محنت کو قانونی تحفظ نہ ہونے کے سبب جو مراعات دیگر محنت کشوں کو ملتی ہیں یہ بچے ان سے بھی محروم ہوں۔

میں اصولاً اس بات سے متفق ہوں کہ بچوں کی محنت قانوناً ممنوع ہونی چاہیے مگر یہ کب ہوگا؟ جب ملک کا سماجی معاشی نظام محنت کی مجبوری ختم کرے گا ان بچوں کو ان کے والدین کو ان کے اہل خانہ کو یہ مجبوری نہ ہو کہ گزر اوقات کیلئے معصوم بچے اسکول جانے کے بجائے ورکشاپوں میں لوہا اٹھانے جائیں یا گلی گلی جوتے پالش کر کے روٹی کھانا ان کی معاشی مجبوری ہو، جب تک یہ سماجی انقلاب نہیں مکمل

ہوتا ہمیں ایسے اقدامات کرنا ہوں گے کہ اس مجبوری کے ہاتھوں جو بچے محنت مزدوری کی طرف آتے ہیں ان کیلئے مناسب سہولتیں مہیا کی جائیں، انہیں معقول اجرت ملے۔ چھٹیوں اور اوقات کار کا تعین کیا جائے۔

پاکستان کے ناکافی لیبر قوانین کے دائرہ کار میں ان بچوں کو بھی شامل کیا جائے اس طرح میری اہل علم و دانش سے بھی گزارش ہے کہ وہ بھی اپنی تحقیق و جستجو کے دائرہ کار میں ان معصوم محنت کشوں کو بھی شامل کریں ان کے حالات کار کو پبلسٹی دی جائے اسی طرح حکومت تعلیم کی سہولتیں زیادہ سے زیادہ آبادی کے لئے فراہم کرے۔

جدید پنجابی ادب ۔ ایک تنقیدی نوٹ

مشتاق صوفی

احمد سلیم کے مضمون کی دوسری قسط پڑھ کر بہت تعجب ہوا۔ انہوں نے جو حقائق پیش کئے وہ تو زیادہ تر درست تھے لیکن ان میں سے بعض کی تشریح نہ صرف غلط بلکہ گمراہ کن ہے چونکہ ہم جیسے کم گو تشریح کی زد میں ہیں سو سوچا کہ کچھ وضاحت کی جائے تاکہ غیر پنجابی دوست اس سے غلط نتیجے اخذ نہ کریں نجم حسین سید تو کسی بھی تہمت یا غلط بیانی کا جواب نہیں دیتے سو مجھے مجبور ہونا پڑا لیکن میرا جواب کسی گروہ یا کسی دوسرے فرد کی لازمی طور پر ترجمانی نہیں کرے گا۔

جب کوئی انسان کسی نئے مذہب میں داخل ہوتا ہے تو اس نئے مذہب کے بارے میں اس کا جوش جنون کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور وہ اپنے مذہبوں سے کہیں زیادہ مذہبی ہونے کی کوشش میں لگا رہتا ہے تاکہ اپنی وفاداری ثابت کر سکے۔ نتیجتاً وہ اپنے نئے مذہب کی اکثر انتہا پسندانہ اور سادہ یا SIMPLISTIC توضیح کرتا ہے۔ بھائی احمد سلیم آپ تو "نومسلم" نہیں پھر آپ "سادہ جنون" کا شکار کیوں ہوئے۔

ادب یا ثقافت گنتی نہیں، کوئی سائنسی فارمولا نہیں اسی لئے یہاں ادبی تحریکوں اور تخلیقی حقائق کی تشریح میں ایک برابر ایک یا یہ برابر وہ کا کلیہ کام نہیں دیتا تخلیقی عمل میں علت اور معلول کا وہ رشتہ نہیں ہوتا جو ہمیں قدرتی سائنس میں نظر آتا ہے اب تو قدرتی سائنس بھی علت اور معلول کے روایتی سادہ تعلق کو کافی نہیں سمجھتی اب رہا دُلے بھٹی کا مسئلہ۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ دُلا بھٹی ہمارے لوک شعور اور روایت کا حصہ ہے ہم سے کہیں پہلے لوک شاعر اس کی بہادری کا قصہ لکھ چکے تھے یہ قصہ پنجاب کے دیہات میں گوئیے گایا کرتے تھے اور اب بھی کہیں نہ کہیں آپ کو گاتے مل جائیں گے دلا بھٹی کی داستان کو عوام نے قبولیت

بخشی اور یہ فلموں والا دُلا نہ تھا یہ وہی جبری تھا جو اکبر کے باغی روپ میں نمودار ہوا اور اس
نے اکبری درباری بننے کی بجائے پھانسی کے پھندے کو ترجیح دی تبھی سے دُلا پنجابیوں کی غیرت
اور حریت کی علامت بنا نجم حسین سید یا ان کے ساتھیوں نے کوئی نیا دُلا نہیں گھڑا نجم نے اپنی
تحریروں میں اسی ادبی و ثقافتی لوک روایت کی جانب رجوع کیا جو ہمیں ورثے میں ملی ہے۔

انہوں نے نئی بات یہ کی کہ اپنے ہم عصر شعور، وجدان اور علم کی روشنی میں اس تاریخی مظہر
PHENOMENON کو کھوجنے اور اس کے نئے معانی دریافت کرنے کی کوشش کی
غلامی اور بغاوت کے DYNAMICS باہمی تعلق کو سلجھانے کا جتن کیا اس طرح
ان کی تشریح لوک ورثوں شاعروں کے بدلتے دُلے باغی کی تشریح کو نئی اور مضبوط بنیاد
فراہم کراتی ہے نتیجتاً ہمارے سماج بالخصوص باشعور شہری لوگوں میں اس کی پذیرائی ہوئی

احمد سلیم نے اس سلسلے میں بہت سے معاملات کو گڈمڈ کر دیا ہے دُلے کی بغاوت
کے ضمن میں گاؤں کے سادہ لوح لوگوں کی "دین اکبری" (اگر کوئی ایسا دین تھا تو) کے خلاف
بغاوت کا ذکر تو کہیں نہیں ملتا لوک داستان میں اسے بنیاد نہیں بنایا گیا اور نہ ہی نجم نے
بنایا ہے اگر کسی نے کہا ہے تو یہ اس کی اپنی ذمہ داری ہے۔

احمد سلیم کی نظر میں "اصلی تے وڈی جنگ طبقاتی ہوتی ہے اور دُلے کی بغاوت طبقاتی
بھی نہیں بلکہ پنجابیوں کی قومی لڑائی ہے ہم پنجابیوں کا تاریخ کا علم کافی کمزور ہے تاہم یاد دہانی
کے لئے اتنا کہنا کافی ہے کہ اکبری عہد میں وہ قومی شعور مفقود تھا جسے ہم جدید معنوں میں
قومی شعور کہتے ہیں اس وقت ہندوستان میں NATION STATE کا کوئی تصور نہ تھا
یہ تصور تو یورپی صنعتی انقلاب کی دین ہے جو انگریزوں کے ذریعے ہم تک پہنچا انقلابی
کتابوں میں بھی ایسا ہی لکھا گیا ہے ویسے اگر جوتا تنگ ہو تو پاؤں نہیں کاٹنے چاہئیں اور
جوتا ڈھونڈنا چاہیئے۔

اکبری عہد میں شہری صنعتوں کے باوجود معیشت بنیادی طور پر زرعی تھی بادشاہ

کی مطلق العنانیت کا سب سے بڑا نقصان زراعت کو ہوتا تھا اس کی بادشاہی کے بیشتر اخراجات زرعی ٹیکسوں سے پورے کئے جاتے تھے ٹیکس بڑھتے رہتے تھے لیکن زمین کی پیداواری صلاحیت PRODUCTIVITY OF LAND بڑھانے کے لئے شاہی ریاست کوئی خاص منصوبہ بندی نہیں کرتی سو کسان بالخصوص برے موسمی حالات میں بالکل تباہ ہو جاتا نتیجاً کبھی انتقال آبادی ہوتا کبھی بغاوت پھوٹ پڑتی اور کبھی سماجی مزاج SOCIAL ANARCHY کا دور دورہ ہو جاتا۔

دلے کی بغاوت کو سمجھنے کا ایک تاریخی CONTEXT یہ ہے۔

احمد سلیم نے نجم کی کتاب "سارال" کے حوالے سے انوکھی تشریح ان کے سر تھوپی ہے جب نجم نے لکھا کہ سولھویں صدی کے لاہور اور آج کے لاہور میں فرق نہیں۔ اور یہی گھڑی ہے ہیرو کے آنے کی تو اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس کا مطلب وہی ہے جو احمد سلیم نے نکالا ہے؟ یعنی تب سے آج تک لاہور میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی؟ شاید احمد سلیم کو غور کرنے کا وقت نہیں ملا بات سیدھی سی ہے نجم نے دونوں تاریخی حالتوں میں ایک PARALLEL کھینچا ہے اور کہا ہے کہ جبر و تشدد کے حالات سولھویں صدی میں موجود تھے اور آج بھی ویسے حالات ہیں سوان کے خلاف بغاوت کی توقع کی جا سکتی ہے اور بغاوت ہیرو یا ہیروز کو جنم دیتی ہے

اب کوئی تاریخی جبر کی باڑ ایک جست میں نہیں پھلانگ سکتا ہم خود سمجھتے ہیں کہ روایتی معنوں میں ہیرو پرستی نفسیاتی اور جذباتی محتاجی کو جنم دیتی ہے اور ہمیں اس سے نجات حاصل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہمارے اعمال اجتماعی شعور و وجدان سے اپنی غذا حاصل کریں لیکن اس تاریخی مقام کا آنا محض نجی خواہش کا تابع نہیں یہ خاص طرح کے تاریخی حالات میں ہی ممکن ہے جو فی الحال موجود نہیں ہیں عوام کی بات تو چھوڑیئے خود ہمارے دانشور بھی اس شوق سے باز نہیں رہ سکتے۔ احمد سلیم ایک طرف ہیرو پرستی کی مذمت کرتے ہیں اور دوسری طرف خود کو ہیرو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ بنگال کے بحران کے زمانے میں

وہ واحد پنجابی دانشور نہ تھے جو مظلوم بنگالیوں سے ہمدردی رکھتے تھے اور بھی بہت سے تھے ہو سکتا ہے وہ احمد سلیم کے دوست نہ ہوں میں اس زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں زیر تعلیم تھا مجھے یاد پڑتا ہے کہ طالب علم تنظیم N.S.F کے ایک گروہ نے بنگلہ دیش عوام کی حمایت کی تھی اور تنظیم کے دو دھڑے ہو گئے تھے. بہر حال پنجاب کا موقف جو کہ پنجابی جاگیرداروں، سرمایہ داروں، اور جرنیلوں نے پنجابی سیاست دانوں کے ساتھ مل کر اختیار کیا تھا بالکل غلط تھا.
دانشوروں اور عوام کا باشعور طبقہ اس سے اختلافات کے باوجود سیاسی سطح پر غیر مؤثر ثابت ہوا:

۱۹۶۰ء کی دہائی میں پنجابی ادب نے فاشنزم اور جبر کے خلاف مزاحمت ضرور کی تھی. ہاں وہ مزاحمت نعروں کی شکل میں نہیں تھی وہ گہرے ثقافتی اور روحانی تجربے کی شکل میں ادب میں ظاہر ہوئی اس سلسلے میں نجم حسین سید کا نام سرفہرست ہے ان کی اس دور کی تحریریں اس کا واضح ثبوت فراہم کرتی ہیں اکبر کی کہانیوں کا حوالہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ اب رہا دُلا بھٹی کے بارے میں ہمارا رویہ!

ایک طرف تو احمد سلیم کہتے ہیں کہ ہیرو کی بازیافت محض موضوعی یا ذاتی خواہش کا نتیجہ نہیں تھا یہ پنجاب کی سماجی تاریخی ضرورت کا تقاضا تھا دوسری جانب وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے کوشش کی کہ عوام ہیرو کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ تھما دیں اور اپنی آزادی کی جدوجہد کے تاریخی عمل سے سبکدوش ہو جائیں بھائی یہ کس نے کہا، کہاں کہا؟ اور کیا عملی طور پر ایسے ہوا؟ آپ نے کوئی حوالہ یا ثبوت دینے کی زحمت گوارا نہیں کی. بریخت کے ایک ڈرامے گلیلیو کا ایک کردار گلیلیو سے کہتا ہے کہ بد قسمت ہے وہ زمین جو ہیرو کو جنم نہیں دیتی گلیلیو کہتا ہے کہ اس سے بھی زیادہ بد قسمت ہے وہ زمین جسے ہیرو کی ضرورت ہوتی ہے.

پہلا کردار حال کی بات کر رہا ہے جبکہ گلیلیو مستقبل کی اس آدرش کی جو شاید کبھی مستقبل میں انسانی سماج کو حاصل ہو جائے.

پنجاب کی زمین بد قسمت ترین ہے کہ وہ ابھی آگے تو نہیں بڑھ سکتی جہاں ہیرو کی ضرورت

باقی نہیں رہتی بلکہ وہ اس مقام پہ ہے جہاں ہیرو کی اسے ضرورت تو ہے لیکن وہ اپنے ہیروز کو پہچان نہیں سکتی اور اپنے اندھے پن میں ان کو اپنا ہیرو بناتی ہے جو اس کے تاریخی تقاضے پورے نہیں کر سکتے یا اس کے قطعاً غیر متعلق ہوتے ہیں پچھلے ڈیڑھ سو سال میں مخصوص تاریخی حالات کے نتیجے میں اس نے اپنی تاریخ اپنی روایت اور اپنے ہیروز سے علیحدگی اختیار کر لی ہے اسی لئے وہ دوسری قومیتوں کی تاریخ، روایت اور ہیروز کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے سو ضروری ہے کہ پنجاب کا اس کے ماضی سے شعوری رشتہ از سر نو جوڑا جائے تاکہ وہ اپنی پہچان کے عمل سے بہرہ ور ہو سکے جس کا اپنا چہرہ بگڑا ہوا ہو وہ دوسرے کا چہرہ لگا تے ہیں، ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرے گا ماضی کی نئی توضیح، جو اتنی بھی نئی نہیں ہے، کے سلسلے میں ہماری کوشش اسی جہت میں ہے۔

احمد سلیم نے آگے جا کر اپنے مضمون میں لکھا "مشتاق صوفی کے لفظوں میں پورن، رانجھن پنل، مرزا، مہینوال اور دُلے نے ہماری تاریخ کو آگے بڑھایا ہے مجھے ڈر ہے کہ یہاں تاریخ کا لفظ یوں ہی رواداری میں لکھ دیا گیا ہے اگر مشتاق صوفی یہاں تاریخ کو تاریخ کے معنوں میں ہی بیان کر رہے ہیں تو مجھے افسوس ہے کہ تاریخ کے اس تصور سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا ساری بات کا لب لباب یہ سامنے آتا ہے کہ تاریخ ہیرو کو جنم نہیں دیتی بلکہ ہیرو تاریخ کو بناتا اور آگے بڑھاتا ہے تاریخ کا یہ تصور ان لاکھوں کروڑوں انسانوں کی نفی کر دیتا ہے جنہوں نے تاریخ کو صحیح رخ بنایا اور آگے بڑھایا۔"

اس سے پہلے احمد سلیم لکھ چکے ہیں "مشتاق صوفی ہیرو کے تصور کو طبقاتی شعور کے ساتھ جوڑ کر پیش کرتا ہے اس کے خیال میں طبقاتی سماج میں لوگوں کی تاریخ بغاوت اور لڑائی کا دوسرا نام ہے۔"

آپ کی رائے بھی متضاد ہے کس کو درست مانا جائے۔

اور میں نے کب کہا کہ ہیرو تاریخ کو جنم دیتا ہے لاکھوں کروڑوں لوگ ہی تاریخ بناتے)

ہیں لیکن کیا فرد کا تاریخ میں کوئی رول نہیں؟ رانجھے ڈُلے نے ہماری تاریخ کو یقیناً آگے بڑھایا ہے ان کرداروں نے وہ افعال کئے جو عموماً عام فرد کے بس سے باہر ہوتے ہیں لیکن وہ ہمیشہ ان کے خواب دیکھتا ہے ان کی خواہش رکھتا ہے اسی لئے ان کرداروں کے افعال علامتی حیثیت اختیار کر چکے ہیں ان کا سفر موجود سے نہ موجود کی طرف تھا یعنی حقیقت سے امکان کی طرف تھا جو کہ ہر انسان کے وجود میں نہاں رہتا ہے لیکن سماجی حالات کا جبر اسے ٹھوس شکل میں ڈھلنے نہیں دیتا ہیرو اس بات کی بشارت دیتا ہے کہ موجود حقیقت سے ٹکراؤ کے نتیجے میں امکان کی طرف بڑھنا ممکن ہے۔

اگر تاریخ میں فرد EXCEPTIONAL INDIVIDUAL یا ہیرو کا کوئی رول نہیں تو کیا روسی انقلاب کو لینن کے بغیر تصور کیا جا سکتا ہے؟ کیا لینن کے ہیروک ایکشن (جو انہوں نے وطن آنے پر پرانے THESIS کو رد کر کے نیا THESIS اپنانے کے ذریعے کیا) کے بغیر تاریخی انقلاب کا عمل ویسے ہی ہوتا جیسے کہ ہوا؟ ہاں یہ ممکن ہے کہ بعض اوقات فرد کے ہیروک عمل کو اس کے زمانے میں نہ سمجھا جائے یا اسے رد کر دیا جائے اس کے بھی ٹھوس سبب ہوتے ہیں لیکن بعد کا زمانہ اس کی دین کو آگے بڑھاتا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ہیرو کے فعل کو بعد میں آنے والے غلط معنی پہنائیں اور ان مقاصد کے لئے اسے استعمال کریں جن کے خلاف وہ خود جدوجہد کرتا رہا ہو پیغمبروں کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ ڈُلے بھٹی کے ساتھ ایسا نہیں ہوا اب تک تو وہ شاہ حسین کے لفظوں میں "جو تھا سو تھا" ہی رہا۔ احمد سلیم نے مضحکہ خیز بیان دے دیا ہے کہ دُلے بھٹی کو غیر پنجابی قومیتوں کو دبانے کے لئے استعمال کیا گیا بھائی احمد سلیم کب اور کہاں؟ کیا آپ کراچی جانے کے بعد اپنی یادداشت بھی کھو چکے ہیں؟ سندھیوں یا دوسری چھوٹی قومیتوں سے دوستی کا یہ انداز گہری نفسیاتی کمزوری کی دلالت کرتا ہے سوال یہ ہے کہ پنجابی حکمرانوں نے دُلے بھٹی کو کبھی اپنایا اور اسے رائے عامہ ہموار کرنے کے لئے استعمال کیا؟ کیا آپ کو یاد دلا دوں کہ معزز پنجابی اسے ایک لٹیرے سے بڑھ کر اہمیت نہیں

دیتے اور اس کی بغاوت کو "جٹ کی خودسری" سے زیادہ نہیں سمجھتے یہ تو عوام کے شاعر اور عوام ہیں
جنہوں نے دُلے کی بغاوت کو معنی پہنائے اور اسے اجتماعی علامت میں بدل دیا۔

کیا احمد سلیم یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں گے کہ ۷۰ء کے بحران میں کون سے پنجابی حکمرانوں
اور جرنیلوں نے دُلے بھٹی کی علامت کو اپنے مفادات کے حصول کے لئے استعمال کیا؟ اور کیا اجتماعی
پنجابی شعور میں دُلے بھٹی کی بغاوت دوسری قومیتوں سے جنگ و جدل کے ساتھ وابستہ ہے؟ ایسا
یقیناً نہیں ہے اور یہ جاننے کے لئے زیادہ عقل کی بھی ضرورت نہیں دُلا بھٹی علامت ہے بادشاہی
جبر سے بغاوت کی بادشاہ مطلق العنان ہوتا تھا سو دُلے کی بغاوت مطلق العنانیت کے خلاف مزاحمت
کا نشان ہے۔

احمد سلیم کی منطق عجیب و غریب ہے، عجیب تو ہے ہی، غریب بھی کافی ہے کہ مطلق العنانیت
کے خلاف مزاحمت کرنے کو ان لوگوں کے کھاتے میں ڈال دیا جائے جو پاکستان میں دوسری قوموں
کے حقوق کو غصب کر کے خود مطلق العنان بنے بیٹھے ہیں۔ دُلا بھٹی یقیناً ان لوگوں کا ہتھیار نہیں
جو مضبوط مرکز کے نام پر کمزور صوبوں پر چڑھائی کرتے رہتے ہیں وہ جو خود ایک کمزور اور بے اختیار
علاقے سے با اختیار مرکز کے خلاف لڑائی لڑ رہا تھا۔

اور یہ جو "دلی دے کنگرے" ڈھانے والی بات ہے اس کا بھی ذکر ہو جائے بھائی یہ شعر ہے
یا سیاسی بیان نہیں ہے کیا دُلا بھٹی دلی والوں کے خلاف کوئی نسلی لڑائی لڑ رہا تھا؟ کیا یہ کوئی
"نسلی تحریک" تھا؟ دلی مغل بادشاہوں کی طاقت کا گڑھ تھا اور ان کے قلعہ کی حیثیت رکھتا تھا اور
"کنگرے" ان کی شان و شوکت اور جلال کے مظہر تھے اور مغلوں کو وہی پچھاڑ سکتا تھا جو اس قابل
ہو ان کے قلعہ تک پہنچ سکے شعر تو بہت سادہ تھا ہمارے دوست کو ہی سمجھ نہیں آیا۔

۱۹۷۰ء میں جب شیخ مجیب کہا تھا کہ مجھے اسلام آباد کی سڑکوں سے پٹ سن کی بو آتی
ہے تو اس کا کیا مطلب تھا؟ اسلام آباد کی سڑکوں سے پٹ سن کی بو کا دلی کے کنگرے ڈھانے سے
ایک تعلق ہے۔ ایک اور بات احمد سلیم نے کہی ہے کہ ہم نے ہیرو کو ڈھونڈ نکالا لیکن دشمن کی نشاندہی

نہیں کی غرض ہے ہیرو کی نشاندہی کے ساتھ ہی دشمن کی نشاندہی ہو جاتی ہے جب ہیرو سامنے
آجاتا ہے تو اس کے دشمن بھی سامنے آکھڑے ہوتے ہیں۔

اب میں آخر میں ایک سوال اپنے محقق سے پوچھنا چاہتا ہوں کیا ادب و سیاست میں کوئی
فرق نہیں ہوتا؟ کیا ادبی تاریخ کو محض سیاسی نکتہ نگاہ سے سمجھا جاسکتا ہے؟ کسی انقلابی مفکر
نے جو سیاست سے براہ راست متعلق رہتا ہے، تو ایسا نہیں سمجھا ادب و سیاست میں ایک نامیاتی
تعلق ORGANIC LINK تو ہوتا ہے لیکن انسانی تجربے اور سوچ تک پہنچنے کے لئے اپنے اپنے
راستے ہیں جن کے باعث ان کے تقاضوں میں فرق ہوتا ہے اسی لئے ہر ایک کی تنقید اور تحقیق کے
لئے (مشترکہ اوزاروں کے ساتھ ساتھ) کچھ مخصوص اوزار ہوتے ہیں جو استعمال میں لائے جاتے ہیں
تاکہ زیر بحث DISCEPLINE کے SPECIFICS کو دریافت کیا جاسکے کامیاب نظم
لکھنے اور کامیاب جلسہ کرنے کے عمل کو ایک کسوٹی پر نہیں پرکھا جاسکتا کامیاب نظم کو سمجھنے کیلئے
وہ معیار نہیں جو کامیاب سیاسی جلسے کے لئے ہے بہرحال آپ نے اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھا
خیر ویسے بھی ادبی و ثقافتی مسائل کی تشریح بہت سے انقلابیوں کی دکھتی رگ ہے کیونکہ سیاسی
معاشی مسائل کی طرح ادبی و ثقافتی PHENOMENA آسانی سے سمجھ نہیں آتے۔ اور
REDUCTIONIST APPROACH بہت سے پیچیدہ سوالات کو یا تو گول کر جاتی ہے یا
ان کا بچگانہ جواب دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ سیاسی مدبر افلاطون سے لے کر ہمارے ناقدوں تک
تخلیق کے بارے میں کوئی تسلی بخش نظریہ نہیں بنا سکے اور اگر کوئی نظریہ بنایا تو وہ ان کے سیاسی
آدرشوں کے ارد گرد ہی گھومتا رہا اور اگر مسئلہ حل نہ ہوا تو شاعروں کو اپنی جنت سے ویسے ہی
نکال دیا جائے افلاطون نے نکالا تھا انقلابی سماجوں میں بھی یہ مسئلہ پوری طور پر حل نہ ہوسکا اسی لئے
ان سماجوں میں بھی سیاست دانوں اور تخلیق کاروں کے درمیان کشمکش اور اختلافات موجود رہتے
ہیں کہنے کا مطلب یہ ہے ادب اپنی تشریح کے لئے محض سیاسی CONTEXT کو کافی نہیں
سمجھتا وہ اپنے فہم کے لئے وسیع اور ہمہ گیر انسانی CONTEXT کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ لمحہ بہ
لمحہ بدلتے محرکات کے اس طرح زیر اثر نہیں ہوتا جیسے کہ سیاست، یہ انسانی تجربے، احساس
اور سوچ کے نسبتاً مستحکم، STABLE مظاہر سے جڑا ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ تخلیق دیرپا ہوتی ہے

ہمارے گزشتہ مجموعوں کے موضوعات

پنجابی ادب، ایک سوالیہ نشان

پاکستان کے مزدور طبقے کی تاریخ (تقسیم سے پہلے)

عالمی اجارہ داریاں اور پاکستان

صحتِ عامہ کی سیاسیات

پاکستان کے بارے میں بنیادی حقائق۔

ریاست اور طبقات

پاکستان کے ترقی یافتہ اور پسماندہ اضلاع

پاکستان کے مزدور طبقے کی تاریخ (۱۹۴۷ — ۱۹۷۷)

صوبہ سرحد کا سماجی ڈھانچہ

زرعی اصلاحات ۔ ایک جائزہ

جدید پنجابی ادب ۔ ایک تاریخی جائزہ

ہمارے گزشتہ مجموعوں کو بذریعہ وی پی منگوایا جاسکتا ھے

پڙھندڙ نسُل . پَ نَ

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾عبدالله حسين ” اُداس نسلين“ نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻڪَ ”لُڙهندڙ نسُل“ نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻَرندڙ، چُرندڙ، ڪِرندڙ، اوسيئڙو ڪندڙُ، ياڙي، ڪاٺُو، ياڄوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سيني وِچان ”پڙهندڙ“ نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان کڻي ڪمپيوٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعنی e-books ناهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌَڻَ، ويجهَڻ ۽ هِڪَ ٻِئي کي ڳولي سَهڪاري تحريڪ جي رستي تي آڻِڻَ جي آسَ رکون ٿا.

پَڙهندڙ نَسل (پَــنَ) ڪا بہ تنظيمَ ناهي. اُنَ جو ڪـو بہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجهندڙ نہ آهي. جيڪڏهن ڪو بہ شخص اهـڙي دعوىٰ ڪري ٿـو تہ پَڪَ ڄاڻُو تہ اُهو ڪُـوڙو آهي. نہ ئي وري پَـنَ جي نالي ڪي پئسا گڏ ڪيا ويندا. جيڪڏهن ڪـو اهڙي ڪوشش ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻُو تہ اُهو بہ ڪُوڙو آهي.

جَهڙيءَ طَرَح وڻن جا پَنَ ساوا، ڳاڙها، نيرا، پيلا يا ناسي هوندا آهن اَهڙيءَ طرح پَڙهندڙ نَسُل وارا پَنَ بہ مختَلِف آهـن ۽ هوندا. اُهي ساڳئي ئي وقت اُداس ۽ پڙهندڙ، پَرندڙ ۽ پڙهندڙ، سُست ۽ پڙهندڙ يا وِڙهندڙ ۽ پڙهندڙ بہ ٿي سگهن ٿا. بيـن لفظن ۾ پَنَ ڪا خُصوصيِ ۽ تالي لڳل ڪِلَب Exclusive Club نہ آهي.

ڪوشش اها هوندي تہ پَـنَ جا سڀ ڪَم ڪار سَهڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پر ممڪن آهي تہ ڪي ڪم اُجرتي بنيادن تي بہ ٿِيـن. اهڙي حالت ۾ پَـنَ پاڻ هِڪَٻِئي جي مدد ڪَـرڻ جي اُصـولَ هيٺ ڏي وَٺُ ڪنـدا ۽ غيرتجـارتي non-commercial رهنـدا. پَنَـن پـاران ڪتـابن کـي ڊِجيٽـائِيز digitize ڪرڻ جي عَملَ مان ڪـو بہ مالي فائدو يا نفعو حاصل ڪـرڻ جي ڪوشش نہ ڪئي ويندي.

ڪتابن کي ڊِجيٽائِيز ڪرڻ کان پو ٻيو اهم مرحلو وِرهائڻ distribution جو ٿيندو. اِهو ڪم ڪرڻ وارن مان جيڪڏهن ڪـو پيسا ڪمائي سگهي ٿو تہ ڀلي ڪمائي، رُڳو پَنَـن سان اُن جو ڪو بہ لاڳاپو نہ هوندو.

پَنَن کي کُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پٽاندڙ وڌِ کان وَڌِ ڪتاب خريد ڪَري ڪتابن جي ليگڪَن، ڇپائيندڙن ۽ ڇاپيندڙن کي هِمٿائِن. پر ساڳِئي وقت عِلم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪَنهن بہ رُڪاوٽَ کي نہ مڃن.

شيخ اَيازَ علمَ، ڄاڻَ، سمجهہَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽَ، پُڪارَ سان تَشبيهہ ڏيندي انهن سِپني کي بَمن، گولين ۽ بارودَ جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:

گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.

... ...

جئن جئن جاڙ وڌي ٿي جَڳَ ۾، هو بوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا؛

ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موٽي مَنجهہِ پهاڙ ڇُپن ٿا؛

... ...

ڪالهہَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄ ڪلهہ نيلا پيلا آهن؛

گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن........

... ...

هي بيتُ اَٿي، هي بَم- گولو،

جيڪي بہ ڪٽين، جيڪي بہ ڪٽين!

مون لاءِ ٻنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،

جنهن رِڻَ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَ ۽ چَمَ جو ساٿي آ-

اِن حسابَ سان اڄڪلهہ ڪي پاڻَ تي اِهو سوچي مَڙهڻ تہ "هاڻي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نہ وڃايو" ناداني‌ءَ جي نشاني آهي.

پَنَن جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۾ سماجي حالتن تان نظر ڪڄي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اٽڪاڻن ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَنَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بنائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پَڙهندڙ نَسُل جا پَنَ سيني کي **چو، چالاءِ ۽ ڪيئن** جهڙن سوالن کي هر بَيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوٺَ ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي نہ رڳو پنهنجو حق، پر فرض ۽ اٽر گهرج necessity unavoidable سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان بہ پڙهڻَ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا، بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها توڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

ون ون کي مون ياڪي پائي چيو تہ ”منهنجا ياءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ“.
- اياز (ڪلهي پاتم ڪينرو)